یادِ رفتگاں

تصنیف
علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مجلسِ نشریاتِ اسلام
۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ناظم آباد ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

یادِ رفتگاں

یہ صرف ان مضامین کا مجموعہ نہیں ہے جو علامہ رحمہ اللہ نے جانے والوں کے غم میں سپرد قلم کیا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ ان کے دل کے ٹکڑے ہیں جو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں،

از

علامہ سید سلیمان ندوی

مجلسِ نشریاتِ اسلام
۱۔ کے ۳۔ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

نام کتاب	یادِ رفتگان
تصنیف	علامہ سید سلیمان ندوی
طباعت	مولائی پرنٹنگ پریس کراچی
اشاعت	سنہ ۲۰۰۳ء
ضخامت	۴۵۲ صفحات

ٹیلیفون
۶۶۰۱۸۱۷

اشاکسٹ: مکتبہ ندوہ قاسم سینٹر اردو بازار، کراچی
فون ۲۶۳۸۹۱۷

ناشر
فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱-کے-۳ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد، کراچی

مقدّمہ

سیّد ابو عاصم، ایڈوکیٹ

برسوں کے انتظار کے بعد الحمد للہ کہ آج "یادِ رفتگاں" آپ کے سامنے ہے، یہ کتاب حقیقت میں تقریباً نصف صدی کی داستانِ غم ہے، یہ صرف اُن مضامین کا مجموعہ نہیں ہے جو علامہ سید سُلیمان ندوی نے جانے والوں کے غم میں سپردِ قلم کیا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ اُن کے دل کے ٹکڑے ہیں جو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، یہ چالیس سال کے آنسو ہیں جو قطرہ قطرہ گر کر سمندر کی شکل میں جمع ہو کر عبرت کا ایک مرقع بن گیا ہے، ۱۹۱۴ء سے لے کر اپنی وفات سے کچھ پہلے ۱۹۵۳ء تک کی یہ ایک دردبھری کہانی ہے، غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ملّت میں کیسا قحط الرجال ہے کہ اس بزم سے جو اٹھ گیا اس کی جگہ لینے والا کوئی نہ ہوا، یہ بذاتِ خود کتنا بڑا سانحہ ہے۔

گو اس میں استاد کا ماتم ہے، رفیقۂ حیات کا نوحہ ہے، فضل و کمال کا مرثیہ ہے، اخلاق و شرافت کا رونا ہے، دینداروں کا غم ہے، بے دینوں کا سوگ ہے لیکن سب سے زیادہ اس میں خود اُن کی زندگی کا پرتو ہے اور اس دور کی کہانی ہے جو نہ اب دیکھنے کو ملے گی اور نہ سننے کو۔

۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب کے بعد مسلمانوں میں ایک ذہنی کشمکش شروع ہوئی، قدیم طرزِ معاشرت اور قدیم طرزِ فکر، جدید طرزِ معاشرت اور جدید طرزِ فکر میں باہم ٹکر شروع ہوئی، اس مغربی استیلاء نے ایسی چمک دمک دکھائی جس نے بہت سے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا، اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ مغرب کے راستے سے آنے والی شے ہدایت اور نجات

کا ذریعہ ہے، اور اپنی ہر چیز یا تو قابلِ نفرت ہے یا پھر اس کے لئے وجہِ جواز صرف مغرب ہی سے ملے تو مستند ہو سکتی ہے، دوسری طرف ان علماء و فضلاء کی جماعت تھی جو مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز کو کفر و شرک سمجھتی تھی، نتیجۃً ملت میں ایک خطرناک خلیج پیدا ہوتی جا رہی تھی جس کو پاٹنے والا کوئی نہ تھا، اور وہی خلیج آئندہ اجتناب، غیریت اور آخر میں کشمکش کا سبب بننے والی تھی، مولانا شبلی کی ذات وہ سنگم تھی، جس میں دونوں طرف کے دھارے آکر مل گئے تھے، اور انہوں نے ایک ایسے مکتبِ خیال (ندوہ کی تحریک) کی بنیاد رکھی جس نے دین کا علم اور اس کی محبت قلوب میں پیدا کی اور ساتھ ہی ساتھ مغرب کی مفید معلومات، جدید علم و دانش اور طرزِ تحقیق کو قبول کرنا اسلام کی خدمت سمجھا، اپنوں کی بیگانگی دُور کرنے کی کوشش، اجتناب اور غیریت کا پردہ اٹھانے کی سعی کی۔

شبلی مشن یا ندوہ تحریک کی سب سے بہتر پیداوار قدیم و جدید کے درمیان ایک ہر دلعزیز سفیر علامہ سید **سلیمان** ندوی کی ذات تھی، جو ملّا اور مسٹر دونوں میں محبوب اور دونوں کی زبان سے واقف، دونوں کے طرزِ فکر سے آشنا، دونوں کی مجلسوں میں یکساں بے تکلف، جس نے لندن کا سفر کیا، کعبہ کا طواف کیا، پیرس کی سیر کی، مدینہ میں حاضری دی، جو جان آف آرک کی موت دیکھ کر متاثر ہوا، اور روضۂ اقدس پر پہنچ کر بے اختیار جس کی زبان سے جاری ہو گیا،

اے زائرِ بیتِ نبویؐ یاد رہے یہ
بے قاعدہ یاں جنبشِ لب بے ادبی ہے
آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست ہو آواز
خوابیدہ یہاں روحِ رسولِ عربی ہے
بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابرِ کرم آج
جو آگ مرے سینے میں مدت سے دبی ہے

اشک آلود آنکھیں دل کا راز فاش کر گئیں۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں انہوں نے استاد کی وفات پر اپنے رنج و غم کی کہانی شروع کی جو "زمیندار لاہور" میں سنہ ۱۹۱۴ء کے آخر میں اور سنہ ۱۹۱۵ء کے اوائل میں، کئی نمبروں میں شائع ہوئی اور پھر جب استاد کی یاد میں ایک ادارہ شبلی اکاڈمی یا دار المصنفین قائم ہوا، تو اس کے ماہنامہ "معارف" میں دوبارہ یہ مضمون شائع ہوا، اس کے بعد "معارف" کا شذرات ہر اہم شخصیت کی وفات پر آنسو بہانے کے لئے وقف ہو گیا اور آخر کار اس نے "وفیات"، کا مستقل عنوان اختیار کر لیا، جنوری سنہ ۱۹۱۷ء میں جب وقار الملک نے رخت سفر باندھا، تو اس سوز و گداز سے بھرے ہوئے دل نے عقیدت کے آنسو پیش کئے، اور ان کی زندگی کے قیمتی نقوش ان صفحات پر نمایاں کئے، پھر سنہ ۱۹۱۷ء اپریل میں رفیقۂ حیات نے بھی ساتھ نہ دیا تو ذاتی غم کا گہرا زخم بھی ان صفحات پر ابھر آیا۔

حکایت ہستی کے دو ہی اہم واقعات ہیں، پیدائش اور موت، موت اور حیات کا فلسفۂ کائنات کے دوسرے اسرار کی طرح اب تک لاینحل ہے،

فلسفی سرّ حقیقت نہ توانست کشود

گشت راز دگر آں راز کہ افشا می کرد

کچھ لوگ متحیر ہیں اور کہہ اٹھتے ہیں،

سُنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی ۔۔۔ نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

حالانکہ انہیں دونوں کے تصور پر عمرانیات اور معاشرہ کی بنیاد کھڑی ہے، موت کی حقیقت کچھ بھی ہو لیکن یہ زندوں اور مردوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دیتی ہے، اور اسی وجہ سے موت پر غم ایک فطری جذبہ ہے، مگر مسلمان کا غم دنیا کی تمام دوسری قوموں کے غم سے مختلف ہے، اس لئے کہ مسلمان اس کائنات اور کائنات سے ماوراء کے متعلق ایک خاص نظریہ اور تصور رکھتا ہے، وہ موت کو زندگی کا خاتمہ نہیں

سمجھنا، بلکہ ایک نئی زندگی کا آغاز سمجھتا ہے، اس لئے اس کو غم عارضی فراق کا ہوتا ہے، اس کے برخلاف دوسری قومیں موت پر غم اس لئے کرتی ہیں کہ اُن کے نزدیک اُن کے محبوب کی ہستی فنا ہوگئی، ان اوراق میں موت پر فطری غم تو ضرور ہے، لیکن ایک مسلمان کا غم ہے۔

موت پر آنسو بہانا دنیا کی تاریخ ادب میں ہمیشہ اہم رہا ہے، دنیا کی تمام شاعری میں مرثیہ کا ایک خاص مقام رہا ہے، مرنے والوں پر نثر میں بھی اظہار غم کیا جاتا رہا ہے، عیسائیوں میں جنازہ کے سامنے جنازہ کی تقریر یا دعا ہوتی ہے جو عموماً خطابت، زورِ بیان اور اظہارِ غم کا نمونہ ہوتا ہے، لینن کی موت پر "تاریخ انقلاب روس کا مصنف لیون ٹراٹسکی نے ایسے تیرہ فقرے لکھے جو روسی ادب کے شہ پارے سمجھے جاتے ہیں۔

بلاشبہ "یادِ رفتگاں" کے یہ مضامین اُردو ادب میں ایک نیا باب ہے، اور اس کے اکثر مضامین زندہ جاوید ہیں، "مولانا محمد علی" "اقبال" اور "حکیم اجمل" کا مرتبہ اردو ادب میں بہت بلند ہے، یہ مضامین نہ صرف اردو ادب بلکہ دنیائے ادب کے انمول جواہر پاروں میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں، علامہ موصوف کے نزدیک بھی ان اوراق کی بڑی اہمیت تھی، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اسلامی تاریخ کا ایک اہم کارنامہ وفیات یعنی ہزاروں لاکھوں بزرگوں، فاضلوں، ادیبوں اور ممتاز لوگوں کی وفات کی تاریخ کا تعین ہے، تاریخ کی اس صنف پر بہت سی کتابیں مدوّن ہوئیں کیا عجب ہے کہ شذرات کا یہ حصہ ایک دن اس عہد کے وفیات کے اوراق بن جائیں"

ان اوراق کے مجموعہ میں علامہ موصوف کی طرزِ تحریر کے ارتقائی منازل بہت آسانی سے متعین کئے جاسکتے ہیں، اور اس کو مختلف دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے اہل قلم مسلمانوں میں سے شاید ہی کسی کو اتنا جم کر کام کرنے کا موقع

ملا ہو اور اس کی تحریر اس طور پر محفوظ ہو، اس لئے اس کتاب کی اشاعت اردو ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔

اس کتاب کا نام بھی اپنے اندر ایک تاریخ رکھتا ہے، جس کو ضروری سمجھتا ہوں کہ بیان کر دوں، جب موصوف پاکستان تشریف لاتے، اور یہ مسودہ صاف ہو کر ان کے سامنے آیا تو اس کا پرانا نام "وفیات" رکھا گیا، میں نے "یادِ رفتگان" تجویز کیا، اسی وقت سفیر ایران برائے پاکستان تشریف لائے، اور ان کے سامنے بھی یہ مسئلہ پیش کیا گیا، انہوں نے بھی میری تجویز کو پسند کیا، اور علامہ موصوف نے میری تجویز کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

جی چاہتا تھا کہ اپنے فاضل اجل و محترم بزرگوں (یعنی مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی سے) درخواست کروں کہ اس پر وہ مقدمہ لکھیں، لیکن اتنی تاخیر ہو چکی تھی اور پریس والوں کا ایسا تقاضا ہوا کہ یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔

یہ مضامین یوں تو گوناگوں حیثیت سے اہم ہیں، لیکن میرے نزدیک اس کی تاریخی اور ادبی حیثیت زیادہ نمایاں ہے، یہ نہ صرف سید صاحب کے سحر نگار قلم کا نمونہ ہے بلکہ ان حروف کی تہہ میں مصنف کے رقیق قلب، محجوب دل، اور مفکر دماغ کے گہرے نقوش ہیں، وہ نقوش جو دل سے نکلتے ہیں اور دل میں بیٹھ جاتے ہیں، یہ اوراقِ ادب وانشار کے انمول جواہر پارے، تاریخ وسوانح کے قیمتی شہ پارے اور مصنف کے وسیع قلب اور وسیع دماغ کا نگارخانہ ہے۔

اس مجموعہ میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی، عیسائی بھی ہیں، یہودی بھی . . . ہندوستانی بھی ہیں، انگریز بھی، مصری بھی ہیں ترکی بھی، ان میں جج بھی ہیں بیرسٹر بھی، عالم بھی ہیں مسٹر بھی، پیر بھی ہیں، فقیر بھی، شاعر بھی ہیں خطیب بھی، سیاست داں بھی ہیں گوشہ نشین بھی، غیر بھی عزیز بھی، پھر سب سے خصوصی تعلقات، برادرانہ خلوص

بزرگانہ شفقت، عزیزانہ عقیدت، اللہ اللہ کیسا دل تھا جو سب کے لئے مضطرب، کیسی آنکھیں تھیں جو سب کے لئے اشکبار، رسولِ عربی کے شیدائی نے محبوب کی کتنی ادائیں اپنے اندر جمع کر لی تھیں، آج ان کی روح کیسی مسرور ہے کہ انہوں نے وہ پالیا جس کی انہیں زندگی بھر تڑپ تھی، لیکن آہ! اب ہم کیا کریں جس کو کوئی راہ دکھلانے والا نہیں۔

۲۷ر نومبر ۱۹۵۴ء

فہرست یادرفتگان

نمبرشمار	اسمائے گرامی	المتوفی	سنہ		نمبرصفحہ
۱۶	مولوی ابوالحسنات ندوی	//	نومبر	۱۹۲۴ء	۵۳
۱۷	شیخ احمد علی صاحب شوق	//	۲۷ر اپریل	۱۹۲۵ء	۵۵
۱۸	مولانا عبدالباری فرنگی محلی	//	جنوری	۱۹۲۶ء	۵۶
۱۹	مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی	//	۶ر مارچ	۱۹۲۶ء	۶۰
۲۰	نواب عمادالملک مرحوم	//	۳ر جنوری	۱۹۲۶ء	۶۷
۲۱	مولوی نورالہدیٰ صاحب ندوی	//	جون	۱۹۲۶ء	۷۳
۲۲	مولانا شرر لکھنوی	//	دسمبر	۱۹۲۶ء	۷۴
۲۳	جناب شاد عظیم آبادی	//	۸ر جنوری	۱۹۲۷ء	۷۷
۲۴	شمس العلماء حافظ نذیر احمد کلکتہ	//	مارچ	۱۹۲۷ء	۷۸
۲۵	حضرت گرامی	//	۲۶ر مئی	۱۹۲۷ء	۷۹
۲۶	مولوی بشیر احمد	//	۲۴ر اگست	۱۹۲۷ء	۸۰
۲۷	مسیح الملک	//	دسمبر	۱۹۲۷ء	۸۱
۲۸	علامہ ابوالفضل عباسی	//	اگست	۱۹۲۸ء	۸۳
۲۹	مولوی وحیدالدین سلیم	//	اگست	۱۹۲۸ء	۸۴
۳۰	سید امیر علی مرحوم	//	اگست	۱۹۲۸ء	۸۶
۳۱	مولانا حکیم برکات احمد صاحب بہاری ٹونکی	//	ستمبر	۱۹۲۸ء	۸۷
۳۲	مفتی عزیزالرحمٰن صاحب	//	۱۸ جمادی الثانی	۱۳۴۷ھ	۸۸
۳۳	شیخ عبدالعزیز شاویش	//	فروری	۱۹۲۹ء	۹۰
۳۴	مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی	//	دسمبر	۱۹۲۹ء	۹۲

نمبر شمار	اسمائے گرامی	المتوفی	سنہ		نمبر صفحہ
۳۵	مسٹر مظہر الحق صاحب بیرسٹر پٹنہ	//	جنوری	۱۹۳۰ء	۹۴
۳۶	صاحبزادہ آفتاب احمد خان	//	۱۸ر جنوری	۱۹۳۰ء	۹۵
۳۷	مولانا عبدالحق صاحب سہارنپوری	//	۲۸ر رمضان	۱۳۴۸ھ	۹۷
۳۸	ڈاکٹر قاسم علی منصوری	//	۱۰ر مارچ	۱۹۳۰ء	۹۹
۳۹	والیہ بھوپال سلطان جہاں بیگم	//	مئی	۱۹۳۰ء	۱۰۰
۴۰	پروفیسر آرنلڈ	//	جولائی	۱۹۳۰ء	۱۰۳
۴۱	قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری	//	جولائی	۱۹۳۰ء	۱۰۶
۴۲	سید جالب دہلوی، ایڈیٹر ہمدم وہمت	//	جولائی	۱۹۳۰ء	۱۰۸
۴۳	مولانا حمید الدین فراہی	//	۱۱ر نومبر	۱۹۳۰ء	۱۱۰
۴۴	مولانا محمد علی	//	۴ر جنوری	۱۹۳۱ء	۱۳۳
۴۵	مسٹر صلاح الدین خدا بخش	//	ستمبر	۱۹۳۱ء	۱۳۸
۴۶	مولانا عبدالماجد بدایونی	//	۱۴ر دسمبر	۱۹۳۱ء	۱۳۹
۴۷	سر علی امام	//	اکتوبر	۱۹۳۲ء	۱۴۲
۴۸	مسٹر جنید نعمانی	//	۱۲ر اپریل	۱۹۳۳ء	۱۴۳
۴۹	مولانا طباطبائی لکھنوی	//	۳ر مئی	۱۹۳۳ء	۱۴۴
۵۰	مولوی محبوب عالم پیسہ اخبار لاہور	//	۲۸ر مئی	۱۹۳۳ء	۱۴۵
۵۱	مولانا سید انور شاہ کشمیری	//	۲۹ر مئی	۱۹۳۳ء	۱۴۶
۵۲	میر ناصر علی مدیر صلائے عام دہلی	//	۱۲ر جون	۱۹۳۳ء	۱۴۸
۵۳	سر فخر الدین	//	۱۹ر جون	۱۹۳۳ء	۱۴۹

علامہ شبلی نعمانی تغمدہ اللہ برحمتہ

(مولانا کی وفات پر ۱۹۱۴ء کے آخر اور ۱۹۱۵ء کے شروع میں "زمیندار" لاہور میں ایک مضمون کئی نمبروں میں لکھا گیا تھا، مگر وہ اب کہاں ملتا ہے، ان کی وفات کے بعد ان کے سوانح و حالات پر یہ پہلا مضمون تھا جو ۱۹۱۵ء میں الغزالی کے ایک اڈیشن میں دیباچہ کے طور پر لکھا گیا تھا اور بعد میں اگست ۱۹۱۶ء کے معارف میں بھی شائع کیا گیا)

اسلام کا گہرا بادل ایک ہزار سال سے برابر ہندوستان کی اقلیم پر معروف بارش ہے، کتنی بار بادل ابر نیساں بن کر برسا اور اس عجائب زار ہند کا دامن لعل و گہر سے بھر گیا لیکن ۱۸۵۷ء میں سارے ملک پر ایک خونی بادل نے تراوش کی جس سے ہر جگہ تو خون برسا، لیکن کہیں کہیں خون کے قطروں کے بجائے سرخ یاقوت کے دانے برسے، جن میں سے ایک کو قدرت نے شبلی کے نام سے موسوم کیا)

ہندوستان کی سیر حاصل زمین نے علوم و فنون میں جو بالیدگی پیدا کی، اسکی تفصیل کا یہ موقع نہیں، تاہم مختلف دروں میں جو کلام و اسرار شریعت میں بحر العلوم اور شاہ ولی اللہ ادب و معانی میں قاضی عبدالمقتدر، ملک العلماء دولت آبادی، اور ملا محمود جونپوری، فلسفہ و منطق میں ملا نظام الدین، اور ملا محب اللہ بہاری، ادب و شاعری میں مسعود سعد سلمان، خسرو اور فیضی، تاریخ و خبر میں ضیا برنی، ابوالفضل اور آزاد بلگرامی کو پیدا کیا، لیکن اسکے آغوش کا آخری فرزند (شبلی) وہ تھا جو ملا محمود بھی تھا اور فیضی بھی، محب اللہ بھی اور کم از کم وہ یگانہ انفراداً ان میں سے شروع کے دو ایک کو چھوڑ کر اکثر کے برابر اور مجموعاً ان میں

سے اکثر سے بہتر تھا۔

اسلام نے اپنی تیرہ صدیوں میں ہر آن یہ ثبوت دیا ہے کہ اس کی کیاریاں ہر موسم میں نیا پھول کھلا سکتی ہیں، اور اس کے دنگل سے ہر میدان کے لئے نئے پہلوان پیدا ہو سکتے ہیں، عہد اول سے اس وقت تک ہر قرن کی تاریخ اس دعوے کی بہترین مثال ہے، اس نے عقل و نقل کی پہلی ٹکر کھائی تو ابن عطاء اور علاف کو پیدا کیا اور پھر ہر دور میں ابن فورک، غزالی، شیخ الاشراق، ابن حزم، ابن رشد، رازی ابن تیمیہ، ابن قیم، قاضی عضد، احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ اور بحر العلوم اپنی خاک سے پیدا کئے، ناممکن تھا کہ اس قرن جدید میں اس موسم کے مناسب حال کوئی نخل تازہ برآور نہ ہوتا اور اس میدان کے لائق کوئی پہلوان دنگل میں نہ اترتا، اُنیسویں صدی کا مطلع خورشید اسلام کا مغرب ہے، فضل و کمال کے کتنے آفتاب و ماہتاب تھے جو اس تاریکی میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، لیکن صدی کا نصف شب ۱۸۵۷ء تھا کہ مطلع سحر سے چند نئے ستارے نمودار ہوئے۔

عصرِ انقلاب دنیائے اسلام اس گردشِ ایام میں ایک عجیب انقلاب کے خطرناک دور سے گزر رہی تھی، علم و عمل کے قدیم و جدید نظامات باہم متصادم تھے اور یہ عالم تھا کہ دوسری صدی کی ضروریات جو یونان و ایران کے تصادم سے پیدا ہوئی تھیں، یورپ کے تصادم سے دفعۃً پیدا ہو گئیں، لیکن اس دورِ ماضی میں اسلام کا خزانہ جس قدر زر و جواہر سے مالا مال تھا، اسی قدر اس جنس کا اس دور میں کال تھا، ناچار گوشہ نشین گداگروں کو جو جوش دین سے لبریز تھے، اُن مہمات کے لئے کمر بستہ ہونا پڑا، جن کا سرانجام صرف منصور و مہدی و مامون کے بس کی بات تھی، ان فقرائے اسلام کا جیب و دامن گو خزانوں سے خالی تھا، لیکن قلب و سینہ دوسرے قسم کے زر و جواہر کا مخزن تھا۔

جدید عقل و فلسفہ و تمدن کا حملہ متواتر دنیائے اسلام کے ہر گوشہ پر تھا، لاجرم صدائے "وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" کے مطابق ہر گوشہ سے علمائے ملت لبیک کو دوڑے، ترکستان،

روس، ایران، قسطنطنیہ، عراق، شام، مصر، تونس، الجزائر، مراکش، ہرجگہ مصلحین ومجددین نے ظہور کیا، ہندوستان کی اسلامی آبادی تمام ممالک اسلام کی آبادی سے تعداد میں بڑی بھی تھی، اس لئے ضروری تھا کہ جو بھی یہاں اس کام کو اٹھائے، اس کی شخصیت بڑی اور اس کی عظمت ہمہ گیر ہو، یہی سبب ہے کہ اصلاح وتجدید کی آواز جس سرعت، نظام اور بلند آہنگی کے ساتھ یہاں اٹھی، دوسرے ملکوں میں نہیں اٹھی اور جو فروغ اور تکمیل اس کو یہاں میسّر ہوئی دیگر بلادِ اسلامیہ کو نصیب نہیں ہوئی۔

ہندوستان کا دورِ اصلاح | ہندوستان کا دورِ اصلاح جن افراد پر مشتمل تھا، ان میں دو قسم کے لوگ تھے، ایک وہ جنہوں نے زمانہ کی ضرورتوں سے قطعاً چشم پوشی کرلی اور صرف قدیم کی حفاظت ہی کو ملت کے لئے ذریعۂ نجات سمجھا، اور یقیناً ان کا بہت بڑا احسان ہے کہ جو کچھ بزرگوں کے ترکہ میں پایا تھا، اس کو سینوں سے لگائے رکھا اور دشمنوں کے دست بُرد سے محفوظ رکھا، حضرت مولانا قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب اور دوسرے علمائے مقدسین پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں کہ انہوں نے اس کام کو خوبی سے انجام دیا اور ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو اپنے فیض سے روشن کیا۔

دوسرا گروہ وہ پیدا ہوا جس نے قدیم کو چھوڑ کر صرف جدید کے حصول پر اپنا سارا زور صرف کیا، اس گروہ کا سرِعسکر یقیناً وہی تھا جس کے بوڑھے غمزوں میں کچھ نہ کچھ بات تھی، اور جس کی ریشِ سفید کی درازی سحر کی چھٹکی ہوئی چاندنی تھی[1]، سرسید، محسن الملک، مولوی سید کرامت علی جونپوری (کلکتہ) مولوی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی اس جماعت کے ارکانِ عظام تھے۔

مولانا شبلی نعمانی | مولانا شبلی مرحوم اس بزم میں سب سے پیچھے آئے، لیکن سب سے پیچھے نہیں بیٹھے، ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ ان دو گروہوں کے مجمع البحرین

---

[1] مولانا شبلی کی مثنوی صبحِ امید کے بعض اشعار کی طرف تلمیح ہے۔

تھے، یعنی قدیم علوم سے بہرہ ور تھے اور جدید سے اپنے ہمعصروں کی طرح آشنا، پھر قدیم علوم میں بھی اللہ تعالیٰ نے گوناگونی کے ساتھ مختلف صلاحیتیں اور قابلیتیں ان کی ذات میں ودیعت رکھی تھیں، اس لئے تماشا گاہِ عالم میں کمال کا جو جوہر انہوں نے دکھایا یقین ہے کہ دنیا زمانہ تک اس کی مثال پیش نہ کر سکے گی۔

شبلی زخیلِ زمزمہ سنجان حشم گرفت باایں کہ ہیچ گونہ زخیل و حشم نداشت

مولانا کے حریف تلوار کا صرف ایک ہی وار جانتے تھے، یا فقیہ و محدث یا متکلم و فلسفی تھے، یا فقط انشا پرداز یا زبان آور خطیب، یا سخن فہم و سخن سنج، لیکن یہ یگانۂ روزگار مجموعہ ہر علم و فن تھا، جس رستہ پر قدم رکھا میدان میں سب سے آگے نظر آیا، علوم دینی و مشرقی میں جو تبحر ان کو نصیب تھا، اس سے یہ جدید ارکان یکسر خالی تھے اور قدیم علماء جدید مسائل سے بے خبر تھے، تاریخ کا وہ اس بازار میں تنہا جوہری تھا، فلسفہ و کلام کا وہ امام تھا، شاعری کا کہنہ مشق استاد تھا، انشاء پردازی کے پامال کوچہ میں بھی اس کی راہ الگ تھی۔ انشاء پردازی (تحریر) و زبان آوری (تقریر) ان دونوں کشوروں میں یکساں صرف اسی کا سکہ رواں تھا، سخن سنجی اس کے طائر کمال کے شہپر تھے۔

اس میں دوسری جامعیت یہ تھی کہ وہ صرف دماغ نہ تھا ہاتھ بھی تھا، قومی تحریکوں کے عواقب پر جہاں اس کی نظر پہنچی، حریف اس کے دیکھنے سے قاصر تھے، اس کا دماغ جن دینی و ملی کارناموں کا تماشا دیکھتا تھا، اور دکھانا چاہتا تھا، بہت سی آنکھیں اسکے دیکھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی تھیں، قومی، تعلیمی، اجتماعی، سیاسی، ادبی، مذہبی غرض عمل کا کوئی گوشہ نہ تھا، جس کی طرف اس کا ہاتھ نہ بڑھا، بااین ہمہ اس کا مخصوص فن صرف تاریخ اور کلام رہا۔

حالاتِ زندگی | مولانائے مرحوم ہندوستان کے آشوبِ ایام اور بحرانِ انقلاب یعنی ۱۸۵۷ء میں، صوبہ متحدہ کے ضلع اعظم گڈھ میں، بندول نام ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے، جس

کی نسبت وہ خود فرماتے ہیں۔

فضلِ ہندوں اگر تو نشناسی　　　آدمی نیستی تو نسناسی

اُن کا خاندان اس ضلع میں ممتاز، متموّل اور صاحبِ اعزاز خاندان تھا، ان کے پدر بزرگوار اعظم گڑھ کے کامیاب وکیل تھے۔

اس زمانہ میں فارسی زبان شرفار کی تعلیم کی زبان تھی، مولانا نے تمام فارسی نصاب اس اثنار میں مکمل کیا، پھر عربی تعلیم شروع کی، خاندان کے دو بہت سے اعزہ واحباب شریکِ تعلیم تھے۔ غازی پور میں ایک چشمۂ رحمت ہے، یہ چشمۂ فیض وہاں سے بھی سیراب ہوا ہے، مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی (جو اس عہد کے فاضلِ اجل اور مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی (جو تحقیقات مذہبی میں گویا سرسید کے استاد تھے) کے برادرِ اصغر تھے، وہ ان دنوں مدرسۂ غازی پور کے صدر مدرس تھے، مولانا شبلی نے مولانائے ممدوح سے نصابِ عربی کی متوسطات سے انتہا تک تعلیم حاصل کی۔

مولانا فاروق چریاکوٹی، فلسفہ، منطق، ہندسہ، ادب عربی اور ادب فارسی میں خاکِ ہند کے آخری فرزند تھے، ان کے بعد علمار میں ان تمام فنون کے ایسے جامع شاید ہی اٹھیں، اس ہیچمدان کو بھی فخر ہے گا کہ جس طرح اس نے مولانا شبلی کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی ہے، اسی طرح ندوہ میں مولانا محمد فاروق کے آغوشِ تعلیم میں بھی تین برس تک پلا ہے، اس نسبت سے میرا روحانی باپ، روحانی بھائی بھی تھا۔

مولانا محمد فاروق کو اپنے اس شاگرد سے اسقدر اُنس اور محبت تھی کہ وہ خود اپنے کو "بیشۂ دانش کا شیر" اور شاگرد کو "بچۂ شیر" کہتے تھے، یعنی استاد نے شاگرد کا سجع کہا تھا "انا اسدٌ و انت شبلی" (یعنی میں شیر ہوں اور میرا شاگرد بچۂ شیر) مولانا کی تعلیم کے آخر زمانہ میں مولانا فاروق

لہ اس فقرہ کے لطف کو سمجھنے کے لئے تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے مولانا کا نام شبلی تھا، جو ایک مشہور بزرگ کا نام مشہور ہے، مگر حقیقت میں یہ نسبت شبلہ کی طرف ہے جو ان کا وطن تھا، اب دوسری طرف شبلی عربی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

صاحب غازی پور چھوڑ کر خود مولانا کے گھر اعظم گڈھ آگئے تھے۔

مولانائے مرحوم نے اس ذات والاصفات کے آغوش میں معقولات کی جس حد تک تعلیم پائی تھی تمام ہندوستان میں اس سے زیادہ ہونا ناممکن تھا۔ اس وقت ہندوستان کے گوشوں میں مستقل درسگاہوں کے مالک لکھنؤ میں مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی، دہلی میں مولانا نذیر حسین صاحب محدث، لاہور میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری ادیب، رامپور میں مولانا عبدالحق خیرآبادی منطقی، مولانا ارشاد حسین صاحب فقیہ اور سہارنپور میں مولانا احمد علی محدث تھے اور دیوبند کا مجمع العلماء ان سب سے الگ تھا۔

مولانا عبدالحئی کم سن تھے، اس لئے اس زمانہ کے کہن سال ان کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، اور یہی اثر اُن کے شاگردوں میں بھی تھا، مولانا نذیر احمد صاحب طریقۂ اہل حدیث کے پابند تھے اور اس عہد کے عام علمائے احناف کی نگاہوں میں یہ طریقہ ضلالت کے ہم پلّہ شمار ہوتا تھا، مولانا فاروق صاحب غالی حنفی تھے اور آخر تک رہے اور یہی اثر مولانا پر بھی ایک مدت تک رہا، اس لئے ان دو درسگاہوں کو چھوڑ کر کم وبیش وہ ہر جگہ گئے، دیوبند میں مولانا کے ایک عزیز حبیب (مولوی محمد عمر صاحب) تعلیم پاتے تھے، ان کے بلاوے پر وہاں تشریف لے گئے، چند روز ٹھہرے، شریکِ تعلیم نہ ہوئے اور واپس آئے۔

مولانا کے رفقائے تعلیم کا بیان ہے کہ اس عہد میں مولوی فاروق کی معقولات دانی کا شور تھا، مولانا شبلی جس درسگاہ میں جاتے تھے "بچۂ شیر" کو شیر سمجھ کر ہر طرف سے طلبہ مناظرہ ومباحثہ کے لئے ٹوٹ پڑتے تھے اور یہ پہلوان یکہ وتنہا ہر دنگل سے فخر وغرور کے ساتھ کامیاب باہر آتا تھا، سہارنپور اور لاہور میں (اچھی طرح یاد نہیں) مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی سے کہ اس زمانہ میں وہ بھی برابر کے طالب العلم تھے، جامع مسجد میں ایک منطقی بحث پر مناظرہ ہوا اور ہر فریق اپنے کو فتحیاب سمجھ کر اٹھا۔

عربی میں شیر کے بچہ کو کہتے ہیں۔ شبلی کے معنی ہوئے "میرا شیر کا بچہ" یہ تلمیح ادھر ہی ہے۔ "س"

اعظم گڈھ سے مولانا رامپور تشریف لے گئے، وہاں مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی کی درسگاہ میں گئے، چند طالب العلم مناظرہ ومباحثہ کے لئے لپٹ پڑے، پھر وہاں نہ گئے، رامپور میں مولوی ارشاد حسین صاحب ایک مشہور عالم دین اور فقیہ تھے، اُن کے درس میں جاکر فقہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں اور جب ان کا ذکر آتا مولانا اپنے استاد کی فقہ دانی تبحّر کی بہت مدح فرماتے تھے، رامپور سے ادب کی تکمیل کیلئے لاہور مولوی فیض الحسن صاحب کی خدمت میں پہنچے، مولوی فیض الحسن صاحب اس زمانہ کے اصمعی اور ابوتمام سمجھے جاتے تھے، ہندوستان کے پورے اسلامی دَور میں قاضی عبدالمقتدر کے سوا یہی ایک فرد تھا جو عربی شاعری کا صحیح مذاق رکھتا تھا، ان کی شرح حماسہ اور دیگر ادبی تصنیفات اسکی شاہد عدل ہیں اور اب ان کا عربی دیوان بھی چھپ گیا ہے جو اہلِ زبان کی ٹکر کا ہے۔

لاہور میں مولانا صرف چند مہینے رہے، حماسہ شاید یہاں شروع کی تھی، وقت نہ تھا، تو مولوی فیض الحسن صاحب اورنٹیل کالج سے آتے جاتے راستہ میں پڑھاتے تھے۔

لاہور سے مولانا سہارنپور، مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں کہ محدث حنفی تھے، حاضر ہوئے، یہاں علم حدیث کی تحصیل فرمائی، مولانائے مرحوم اپنے تمام اساتذہ میں مولانا احمد علی صاحب کے اخلاق وآداب، سادگیِ طبع و وضع اور اتباعِ سلف کے بے حد معترف تھے اور ادب سے اُن کو "ہمارے مولانا" کہا کرتے تھے۔

عمر ۱۹ برس کی تھی، سال ۱۸۷۶ء تھا، ترمذی شریف زیرِ درس تھی کہ خاندان کے بعض اعزّہ نے بغرضِ حج سفرِ حجاز کا ارادہ کیا، حوصلہ مند طالب العلم کیلئے یہ بہترین موقع تھا، چنانچہ استاد محدث سے اجازت لے کر سفرِ حجاز کے لئے روانہ ہوگئے، فریضۂ حج ادا کیا، مکۂ معظمہ سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، ایک عالمِ وجد تھا جو عاشقِ رسول پر طاری تھا، اس عالم میں ایک قصیدہ اور ایک قطعہ[1] فارسی زبان میں انشا فرمایا جو سرتاپا شوق اور آرزو ہے۔

---

[1] یہ دونوں "کلیاتِ شبلی" میں موجود ہیں۔

مدینہ منورہ میں بہت سے کتب خانے ہیں، اس وقت مولانا پر حنفیت کا رنگ غالب تھا کہ تمام ہندوستان حنفیت اور وہابیت کی ہنگامہ آرائی میں مشغول تھا، چنانچہ وہاں پہنچ کر اسی قسم کی کتابوں کی جستجو فرمائی، فرماتے تھے کہ فنونِ حدیث کا جو سامان وہاں نظر آیا کہیں نہ دیکھا، ابن عبدالبر کی کتاب التمہید گو موطائے امام مالک کی شرح نقد ہے لیکن درحقیقت وہ فنونِ حدیث کا دائرۂ معارف ہے، ایک بار میں نے پوچھا تھا، تو فرماتے تھے کہ مدینہ کے کتب خانوں میں دیکھی تھی۔

سفرِ حجاز کے بعد عجیب عجیب واقعات بیان فرمایا کرتے تھے، منجملہ ان کے ایک ہندی درویش کا قصہ تھا، جس کے دونوں پاؤں کانٹوں سے چھلنی ہو گئے تھے، موچنے سے کانٹے نکال رہا تھا کہ مولانا جا کر کھڑے ہو گئے، اشارہ کیا کہ تم بھی نکالو، پھر سوز و گداز کی لے میں یہ شعر پڑھا۔

آبلے روتے ہیں خوں، رنج بڑا ہوتا ہے　　　کوئی کانٹا جو کفِ پا سے جدا ہوتا ہے

عربوں کی فیاضِ طبعی اور شرافتِ خُلق کے بھی بعض عجیب واقعات بیان فرمایا کرتے تھے۔

اس سفر سے واپس آکر "ظاہری طلبِ علم" کا دور ختم کر دیا، لیکن واقعاً اب "حقیقی طلبِ علم" کا دور شروع ہوتا ہے، مولانا فطری شاعر تھے، اکثر اردو اور فارسی میں اور گاہے گاہے عربی میں شعر موزوں فرماتے تھے، کتب بینی کی ابتدا سے عادت تھی، فرماتے تھے کہ اعظم گڑھ میں رہتا تھا تو بازار میں ایک کتب فروش کی دوکان تھی، وہاں جا کر اردو فارسی کے دیوان دیکھا کرتا تھا اور کبھی کبھی گھر بھی لے آتا تھا۔

اعظم گڈھ کے قیام کے زمانہ میں لکھنؤ اور اطراف کے بعض معززین وہاں مقیم تھے، ان کے شوق سے مشاعرے ہوتے تھے، طرحیں دی جاتی تھیں، غزلیں پڑھی جاتی تھیں، مولانا میر مشاعرہ بنتے تھے، اس زمانہ کی بعض غزلیں مشکل سے مجھے ملی ہیں، اس زمانہ میں پیامِ یار اور اودھ پنچ کا عنفوانِ شباب تھا، بڑے شوق سے ان کے نمبر پڑھتے تھے اور زبان کے مزے لیتے تھے۔ اودھ پنچ کی بعض طویل نظمیں اب تک یاد تھیں۔

اس وقت تک فارسی زبان ہندوستان کے شرفا کی علمی زبان تھی، اس عہد میں بلکہ علی گڑھ پہنچنے تک تمام خط و کتابت فارسی میں کرتے تھے اور قلم برداشتہ لکھتے تھے، اس زمانہ کے اکثر فارسی خطوط میرے پاس ہیں[1]۔

مشاعروں کے علاوہ اُن کا سب سے بڑا شغل اُس زمانہ میں غیر مقلدوں کی تردید بلکہ تعذیب تھی، فرماتے تھے کہ "انسان عیسائی ہو سکتا ہے لیکن غیر مقلد نہیں ہو سکتا"۔ لیکن عجائب روزگار دیکھو کہ یہ تعصب کا دریائے جوش، بے تعصبی کے کس نشان تک اتر آیا، اس زمانہ میں غیر مقلدین کی تردید میں اُردو، فارسی اور عربی میں کئی رسالے لکھے، بعض خود ان کے نام سے اور بعض دوسروں کے نام سے چھپے ہوئے ملتے ہیں، اسی عہد کا عربی رسالہ "اسکات المعتدی" ہے جس کے مؤلف کی نادانستہ داد سفر بیت المقدس میں ایک فاضل نے خود مولانا کے سامنے دی تھی اور جب ان کو معلوم ہوا کہ یہی اس کے مؤلف ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔

اس عالم میں درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا، مولوی حمید الدین صاحب اسی زمانہ کے فیض یافتہ ہیں، مولانا اس عہد میں بڑے متقشف اور مذہبی جابر تھے تارکین و غافلین صلوٰۃ کو سخت تنبیہ فرماتے تھے۔

گھر کے لوگوں کو فکر تھی کہ اب یہ دنیا کا کوئی کام کریں، گھر کی زمینداری کا کاروبار ان کے سپرد ہوا، لیکن علم ودانش کا رئیس اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکا۔

اکثر فارسی عربی خواں لوگ اس زمانہ میں اُردو میں وکالت کا امتحان دے کر وکیل بنتے تھے، خود مولانا کے والد اور نیز استاد مولانا فاروق صاحب اسی قسم کے وکیل تھے۔ ناچار مولانا نے بھی وکالت کا امتحان دیا اور دوسری بار میں کامیابی حاصل کی اور چند مہینے تک اعظم گڈھ اور بستی میں وکالت کی بھی لیکن اس متقشف عالم کے لئے صدق وکذب اور صحت و خطا کی تبدیل سخت نفرت انگیز فرض تھا، مولانا ایک مقدمہ کا عجیب وغریب واقعہ بیان فرماتے تھے۔

---

[1] مکاتب شبلی میں چھپ گئے ہیں۔ "س"

"کسی ٹھاکر نے اپنی کمسن لڑکی بیاہ دی تھی، داماد جوان ہو کر سُسر کو پسند نہ آیا، اُدھر سے رخصتی کا تقاضا تھا اور ادھر سے شدید انکار تھا، ناچار شوہر نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا، لڑکی کا باپ مولانا کے والد کے پاس مقدمہ لے کر آیا، وکیل نے مولانا سے فرمایا کہ جواب دعویٰ تم لکھ دو، مولانا نے قصہ پوچھا تو ساری داستان اس نے کہہ سنائی، ہنس کر فرمایا کہ جب تم خود اقرار کرتے ہو کہ لڑکی اس سے بیاہی جا چکی ہے تو اب کیا ہو سکتا ہے، جاؤ لڑکی کو رخصت کر دو، وہ ہنستا ہوا وکیل صاحب کے پاس آیا، وکیل صاحب نے مولانا سے فرمایا کہ" بس آپ وکیل بن چکے" آخر خود تحریر لکھی اور مقدمہ کی روداد بنائی، مقدمہ لڑا گیا اور جیتا گیا"

وکالت چھوڑ کر کچھ دن امانت کے صیغہ میں نوکر ہوتے، رمضان کے زمانہ میں شدید گرمی میں روزے رکھ کر گھوڑے پر سوار گاؤں گاؤں پھرا کرتے تھے۔ نہ افطار کی فکر نہ سحری کا سامان اور اسی طرح پورا مہینہ گزارے گئے، آخر اس کوچہ میں بھی جی نہ لگا کہ ہادیٔ فطرت پکار رہا تھا کہ شبلی تو اس سے بلند تر کام کے لئے پیدا ہوا ہے، ناچار پھر گھر میں بیٹھ کر مطالعۂ درس و تدریس میں مشغول ہوئے اور قصائد و رسائل لکھنے شروع کئے۔

یہ وہ عہد ہے کہ سرسید کے شور سے تمام ہندوستان گونج رہا تھا، مولوی محمد حسین آزاد کی "سنینِ اسلام" نئی نئی نکلی تھی، وہ اکثر زیر مطالعہ رہتی تھی، اسلام و عرب کے مفاخر پڑھ پڑھ کے وجد کرتے تھے، یہ پہلی بار تھی کہ ان کے دل نے قوم کا درد محسوس کیا، مولانا کے ایک نوجوان بھائی مہدی مرحوم علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے، ۱۸۸۲ء میں قدرت کی اس زنجیر نے مولانا کو کالج میں کھینچا، بھائی سے ملنے گئے تو پیر میکدہ کو دل دے آئے۔

پیر کہن سال نے جوہر دانش، ناصیۂ شباب پر نمودار پایا، بے اختیار مصر ہوئے کہ آپ ہمارے مدرسہ میں کیوں نہیں رہتے، مولانا نے قبول فرمایا اور فارسی و عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے اور آخر اتنے انقلابات اور گردشوں کے بعد دائرۂ تقدیر کا خط مرکز تک پہنچا۔

سید صاحب نے خود اپنی کوٹھی میں رہنے کے لئے کمرہ دیا، مولانا حالی بھی قیام فرما تھے،

مسٹر آرنلڈ بھی آگئے تھے، شب و روز کچھ عجیب سی صحبت رہتی تھی، قدیم و جدید کی آمیزش اور آویزش کی یہ صورت غیب سے نکل آئی۔ سید صاحب کا کتب خانہ دیکھ کر مولانا فرماتے تھے کہ میں باغ باغ ہو گیا، مصر و یورپ کے تمام جدید و قدیم مطبوعات الماریوں میں بہ ترتیب سجے تھے۔ فرماتے تھے کہ میں کئی کئی گھنٹے الماریوں کے پاس کھڑا رہتا تھا اور کبھی تھک کر انہیں الماریوں کے پاس زمین پر بیٹھ جاتا تھا۔

سنینِ اسلام کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پہلے سے تھا، تاریخ کی ان نئی کتابوں کو دیکھ کر اُن کے اشہبِ شوق کو نئی مہمیز لگی اور تاریخی تصنیف و تحقیق کا ولولہ پیدا ہوا پہلے چھوٹے چھوٹے تاریخی رسالے اور قومی نظمیں لکھیں، گذشتہ تعلیم اور مثنوی صبح امید وغیرہ اسی فصل کے میوے ہیں، اوّل سارے بلادِ اسلامیہ کی تاریخ لکھنے کا خیال آیا، پھر اس کو گھٹا کر تاریخ بنی العباس شروع کی، لیکن جس قدر آگے بڑھتے گئے، میدان زیادہ کشادہ فراخ اور نتیجہ صبر آزما اور دیر طلب نظر آنے لگا، ناچار "نامورانِ اسلام" کی منزل پر مسافر نے دم لیا اور المامون شروع ہو کر ختم ہوئی، اس کے بعد رفتہ رفتہ اور کتابیں تصنیف ہوئیں، بعض بعض اہم مباحث پر کانفرنس میں رسائل لکھ کر پیش کئے اور قبولِ عام کی سند حاصل کی۔

۱۸۹۲ء میں "سیرۃ النعمان" سے قلم نے فراغت پائی تھی اور "الفاروق" کا تخیل تھا کہ مصر و شام و روم کا سفر پیش آیا، مسٹر آرنلڈ کی معیت میں قسطنطنیہ روانہ ہوئے، وہاں سے مصر ہوتے ہوئے چھ مہینے کے بعد ہندوستان واپس آئے، جدید اسلامی ہندوستان کا یہ پہلا علمی سفر تھا، جو کسی عالم کی ہمت نے قبول کیا، ان مسافرتوں میں انہوں نے کیا کیا تماشے دیکھے، ان کا خامۂ نقاش خود سفرنامہ میں اُن کی رنگین تصویریں دکھا چکا ہے۔

واپس آکر کالج میں وہ قصیدہ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے۔

قاصدِ خوش خبر امروز نوا ساز آمد ۔۔۔ کز سفر یار سفر کردۂ ما باز آمد
از سفر شبلی آزادہ بہ کالج برسید ۔۔۔ یا مگر بلبل شیراز بہ شیراز آمد

دوستاں مژدہ کہ آں بلبلِ خوش لہجہ دگر   اندریں تازہ چمن زمزمہ پرداز آمد

سید صاحب اس زمانہ میں کالج کے برائے نام سکریٹری تھے، اصل سید محمود بن گئے تھے، جن کے طرزِ عمل سے ہر شخص نالاں تھا، مولانا نے کئی بار استعفیٰ دیا، مسٹر بک نے نامنظور کیا۔ آخر ۱۸۹۸ء کی مئی میں کالج سے رخصت لی۔ سید صاحب اور مسٹر بک مُصر تھے کہ مولانا یہاں ششماہہ قیام کریں، ابھی وہیں تھے کہ جون ۱۸۹۸ء میں سید صاحب نے انتقال کیا۔ ۱۶ سال کی خدمت کے بعد ۱۸۹۸ء میں کالج کی پروفیسری سے وہ مستعفی ہو کر اپنے وطن اعظم گڈھ چلے آئے "الفاروق" زیرِ ترتیب تھی، مولانا نے ۱۸۸۴ء میں نیشنل اسکول ایک انگریزی کا مدرسہ یہاں قائم کیا تھا، اب واپسی کے بعد اس کے انتظام و ترقی میں بھی مصروف ہوئے۔ علی گڈھ میں صحت اچھی نہیں رہی تھی، آب وہوا کی تبدیلی کی غرض سے ۱۸۹۹ء میں کشمیر گئے، لیکن وہاں کی آب وہوا راس نہ آئی، علیل ہو گئے، تاہم "الفاروق" کی تالیف و تحریر جاری تھی، فرماتے تھے کہ "الفاروق" کی آخری سطریں جس دن قلم نے لکھی ہیں سخت بخار تھا گھنٹوں تک ہوش نہ آیا، اس مرض نے اس قدر طول کھینچا کہ مہینوں تک لکھنا پڑھنا یک قلم متروک ہو گیا اور بمشکل صحت ہوئی، قصیدۂ کشمیریہ میں یہی واقعات منظوم ہوتے ہیں اور اسی مرض سے صحت پر مولانا حالی نے وہ تہنیت لکھی جس کا مطلع یہ ہے۔

للہ الحمد پس از ناخوشی و رنج دراز   شبلی ما ہمراداز سر بالیں برخاست

یہیں کے قیام کے زمانہ میں "الفاروق" چھپ کر نکلی، یہاں کچھ ہی روز قیام رہا، کہ ان کے والد کے انتقال کے سبب سے کچھ ایسی خانگی الجھنیں پیدا ہو گئیں کہ وہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور سیدھے حیدر آباد کا رُخ کیا، وہاں مولوی سید علی بلگرامی نے ان کو اپنا مہمان کیا اور انہی کی تحریک سے حیدر آباد میں علوم و فنون کی نظامت کا عہدہ قبول فرمایا اور پھر یہیں الغزالی، سوانح مولانائے روم، علم الکلام الکلام اور موازنہ ترتیب تصنیف ہوئی اور موازنہ کے سوا اور کتابیں یہیں سے چھپ کر شائع ہوئیں۔

ہم نے اب تک ندوۃ العلماء کی داستان نہیں چھیڑی، ندوۃ العلماء کا تخیل مولانا محمد علی صاحب کانپوری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ارباب فہم کی تجویز تھی، مولانا اس قسم کے کاموں کے لئے سراپا انتظار تھے، دوسرے ہی اجلاس سے شریک ہو گئے، مصر و قسطنطنیہ کے سفر نے تعلیم و نصاب تعلیم و طریقۂ اصلاح تعلیم کے متعلق بہت سے نئے خیالات پیدا کر دیئے تھے، چنانچہ اسی جوش میں دارالعلوم کا خاکہ تیار کیا اور اب بھی اس کو کوئی پڑھے گا تو فوراً کہہ دے گا کہ مصنف قسطنطنیہ کی فضا میں کھڑا ہو کر مسلمانان ہندوستان کے لئے راہ بتا رہا ہے، مولانا مسلمانوں کی ہر قسم کی اصلاح کو علماء کی اصلاح پر منحصر رکھتے تھے؛ اور علماء کی اصلاح طریقۂ تعلیم کی اصلاح پر موقوف جانتے تھے، اس بنا پر دارالعلوم اور ندوہ ہی اُن کے نزدیک کام کا اصلی طریقہ تھا، مولوی محمد علی صاحب کے استعفاء کے بعد ندوہ میں جب انحطاط شروع ہوا تو خود لکھنؤ چلے آئے اور دارالعلوم کو تقریباً ۱۹۰۴ء میں اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اس کے بعد ندوہ کی جو خدمتیں انہوں نے انجام دیں اور جس حد تک اس کو ترقی دی اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، خیرہ چشموں سے کامیابی کی یہ درخشندگی دیکھی نہ گئی، رخنہ اندازی شروع کی، یہاں تک کہ ۱۹۱۳ء میں ملول ہو کر علیحدہ ہو گئے۔

دنیاوی حیثیت سے مولانا نے جو وقار حاصل کیا وہ بھی کم نہ تھا، ۱۸۹۲ء میں سلطان ترکی نے تمغۂ مجیدی عنایت کیا، ۱۸۹۴ء میں شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا، الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے، اسی زمانہ میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر ہوئے، ۱۹۰۰ء میں امیر عبدالرحمٰن خان والی کابل نے ترجمہ کا محکمہ قائم کیا، اس کے لئے ہندوستان سے مولانا کا انتخاب کیا لیکن مولانا نے جانے سے انکار کیا، تقریباً ۱۹۰۸ء میں اڈنبرا مسلم سوسائٹی کے پریسیڈنٹ ہوئے، ۱۹۱۰ء میں شملہ گورنمنٹ اورنٹیل کانفرنس میں مدعو ہوئے، ۱۹۱۲ء میں الہ آباد کی سرکاری ورنیکلر اسکیم کمیٹی میں شریک ہوئے اور گورنمنٹ نے مولانا ہی کی تجویز پر مسئلہ کا فیصلہ کیا، ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسوں میں بلائے گئے، حکام صوبہ اور والیان ریاست اکثر خلوص سے ملتے تھے، گزشتہ

موقع تاج پوشی میں ہز مجسٹی نے شرف ملاقات بخشا، بھوپال، رامپور، جزیرہ اور حیدر آباد کے رؤسا مولانا کے قدردان تھے، انہیں کے ہاتھوں حیدر آباد میں مشرقی یونیورسٹی کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔

مولانا کے مُرغِ شہرت کی پرواز ہندوستان کی فضا سے نکل کر دوسرے ملکوں تک وسیع ہو چکی تھی۔ ہندوستان، مصر و شام و ترکی و جزائر ملایا، بلکہ انگلینڈ سے پیرس اور برلن سے علمی استفتے اور سوالات ہمیشہ آیا کرتے تھے، مسٹر ارنلڈ انگلینڈ سے، موسیو بوا پیرس سے، ڈاکٹر محمود لبیب برلن سے علمی استفادہ کرتے تھے، ۱۸۹۵ء کی اورنٹیل کانفرنس میں جو اٹلی میں منعقد ہوئی تھی شرکت کا ارادہ تھا کہ دفعۃً بیمار ہوگئے اور نہ جا سکے، ۱۹۱۳ء میں ترکی کی طرف سے مدینہ یونیورسٹی کے قیام کا جو خیال تھا اس کے واضعینِ نصاب میں مولانا کا بھی نام تھا۔

ادھر وقفِ اولاد کی مہم اٹھائی اور باحسن وجوہ اس کو کونسل تک پہنچا کر کامیابی کیساتھ ختم کیا، اشاعتِ اسلام کی عظیم الشان اسکیم کئی بار لکھی اور ہر بار قدم آگے بڑھا کر پیچھے ہٹ گئے، ندوہ میں قرآن پاک کا درس جاری کیا۔ آخر میں دار المصنفین کا ارادہ تھا کہ قوم میں اہلِ کمال پیدا ہوں، سب سے آخری اور اہم تصنیف "سیرۃ نبوی" زیر تالیف و نظر ثانی، کچھ اجزاء تیار ہو چکے تھے، کچھ باقی تھے کہ پندرہ روز کی علالت کے بعد ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو صبح کے وقت وفات پائی، ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۵۷ ہی برس کی عمر پائی، ہنگامہ مشرق (غدر) میں ظہور کیا اور ہنگامہ مغرب (جنگِ یورپ) میں مخفی ہوئے "بدر الاسلام" سیرۃ نبوی میں پہلی تصنیف کی اور سیرۃ نبوی پر آخری دم توڑا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اس جاں کاہ حادثہ پر ہندوستان سے مصر اور مصر سے یورپ تک تمام عالم نے ماتم کیا۔

تصنیفات بہ ترتیب زمانہ حسبِ ذیل تصنیفات یادگار چھوڑیں، رسالہ گزشتہ تعلیم، الجزیہ کتب خانہ اسکندریہ، المامون، رسائل شبلی، سیرۃ النعمان، الفاروق، سفرنامہ، الغزالی، علم الکلام الکلام، سوانح مولانائے روم، موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم، مقالات شبلی، مضامینِ عالمگیر

سیرۃ النبی، مجموعۂ کلام اُردو، یہ تمام تصانیف اردو زبان میں ہیں، عربی میں اسکات المعتدی بدر الاسلام، الجزیہ، النقد علی التمدن الاسلامی اور بعض مضامین ہیں جو مصری رسالوں میں لکھے، فارسی میں دیوانِ شبلی، دستۂ گل، بوئے گل اور بعض خطوط۔

یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ مولانا کا کوئی سلسلۂ تصنیف مکمل نہیں ہوا۔ ناموران اسلام کے سلسلہ میں صرف المامون اور الفاروق مرتب ہو سکی، علم کلام کے سلسلہ میں علم الکلام، الکلام، الغزالی اور سوانح مولوی روم تصنیف ہوئی۔ شعر العجم کی پانچ جلدوں میں سے چار جلد چھپ سکی، پانچویں جلد کے اجزا بحالتِ مسودہ موجود ہیں، سیرۃ النبی کی ناتمامی کا داغ تو اخیر وقت تک اُن کے دل میں رہا، اپنی زندگی میں دوستوں سے فرماتے تھے کہ "سیرۃ کو تمام ہی کرنا ہے، گو جان دے کر ہی سہی" آخر اسی مقولہ کے مطابق اسی دُھن میں اس بزرگ نے جان ہی دی۔ رَحِمَهُ اللّٰهُ رَحْمَةً وَاسِعَةً۔

آہ! کہ بہت کچھ کہنا ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ ہمارے سینوں میں جو کچھ وسعت ہے وہ کاغذ کے صفحوں میں نہیں۔

حدیثِ عشق خوش بود است و شبلی خوشتر کرد است
شنیدن می تواں زیں حرف رنگین داستانے را

(اگست ۱۹۱۶ء)

قافلہ کا آخری مُسافر

نواب وقار الملک مرحوم

علم والے علم کا دریا بہا کر چل دیئے　　واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے

کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیئے　　کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جلا کر چل دیئے

نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبر و سیاست کا ماتم کیا، مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا، مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان پر نوحہ کیا، لیکن نواب وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور الوالعزمانہ اخلاق کی گم شدگی پر فریاد۔

یہ ہستی گراں مایہ جس نے ہماری دنیا کو ۲۷ جنوری ۱۹۱۷ئ میں الوداع کہا، ہمارے کارفرما قافلہ کا آخری مسافر تھا، اُس کے بعد وہ دور جو انقلاب ہند کے بعد شروع ہوا تھا ختم ہوگیا، وہ دور جو انگریزی کالجوں کی کائنات نہیں بلکہ بوریا نشین مدارس کا نتیجہ تھی گزر گیا، وہ دور جو قدیم تعلیم اور قدیم اخلاق کے نمونوں کو پیش کرتا تھا، منقطع ہوگیا یعنی آئندہ ہماری قسمت کے مالک عربی مدارس کے شملے نہ ہونگے، بلکہ انگریزی درسگاہوں کے ہیٹ ہونگے، اب شرق، مشرق کی قومیت پر حکومت نہیں کریگا، بلکہ مغرب، اب لیڈری اور رہبری جمہور کیلئے جوش دل اور اخلاص عمل ضروری نہ ہوگا بلکہ صرف ایک کامیاب عہدہ اور ایک عمدہ سوٹ فیا ویلاہ علی فقید الاسلام ویا خیباہ للمسلمین۔

مرحوم کو سب سے پہلے میں نے دار العلوم ندوہ میں دیکھا، غالباً ۱۹۰۳ئ یا ۱۹۰۴ئ میں پست قد، فربہ جسم، چھوٹی گردن، کچی پکی لمبی داڑھی، سر گھٹا ہوا اور سر پر ایک ترکی ٹوپی

منڈھی ہوئی، ساتھ ایک ملازم اور اس کے کندھے پر جانماز۔

۱۹۰۶ء میں دارالعلوم کی طرف سے مولانا شبلی مرحوم کے زیر ہدایت طالبعلموں کا ایک وفد بریلی و مراد آباد و رامپور و امروہہ میں مدرسہ کے لئے چندہ کی فراہمی کے لئے گیا تھا، اس وفد میں راقم الحروف بھی تھا، یہ وفد امروہہ میں دارالعلوم کے ایک مدرس مولانا سید علی زینبی کے مکان پر ٹھہرا تھا اور من جملہ دوسرے ممتاز اصحاب کے نواب صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا، موصوف کی جس چیز نے ہم کو گرویدہ کیا وہ انکی بے مثال خاکساری اور تواضع تھی، چند گم نام و بے نشان طالب علموں کی ایسی قدر و منزلت فرمائی جو بیان سے باہر ہے، مرحوم کا مکان گلی کے اندر تھا۔ اللہ اکبر! مسلمانوں کا یہ مسلّم لیڈر چند بے مایہ طالب علموں کی مشایعت میں گھر سے گلی اور گلی سے سڑک تک چلا آیا اور یکہ پر ان کو سوار کر کے واپس گیا اور دوسری دفعہ اصرار کر کے اپنے گھر پر مدعو کیا۔

مولانا شبلی مرحوم نے جب ندوہ میں قدم رکھا تو اپنے قدیم احباب کو ندوہ کی مالی اعانت کی طرف متوجہ فرمایا، مرحوم کا جو جواب آیا وہ کچھ اب بھی یاد ہے، ان کو غالباً چھ سو کے قریب حیدر آباد سے پنشن ملتی تھی، نصف علی گڑھ کے نذر، پھر نصف کا سالانہ حساب لکھا تھا، جس میں غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کے سلسلۂ امداد کے بعد چند روپے رہ جاتے تھے جو ان کے ذاتی صرف میں کام آتے تھے، آخر میں لکھا تھا کہ آپ فرمائیں تو اسی میں سے کاٹ کر کچھ حاضر کروں۔

مولانا شبلی مرحوم، نواب وقار الملک کے سچے اور پکے کیرکٹر کے ثبوت میں دو واقعے بیان فرماتے تھے، ایک طرف تو اس واقعہ کا کہ وہ کبھی سرسید کی ماتحتی میں ملازم رہے تھے، ان کو سرکار کہتے تھے، حیدر آباد کے وفد میں سرسید کی ساتھ مولانا شبلی بھی گئے تھے، انہوں نے خود اپنا دیکھا ہوا واقعہ بیان کیا کہ ایک مجلس میں سرسید اور سر وقار الامراء دونوں تشریف فرما تھے، نواب صاحب ہاتھ جوڑ کر سرکار ایک طرف

سر وقار الامراء کو کہہ رہے تھے، تو دوسری طرف حسب دستور اسی طرح سرسید کو بھی، حالانکہ وہ حیدر آباد میں اس وقت بہت بڑی شخصیت بن چکے تھے۔

لیکن انہیں سرسید نے جب زبردستی سید محمود کو اپنا جانشین بنایا تو نواب صاحب نے نہایت صفائی سے انہیں لکھا کہ اسلام میں دو ہی شخص گزرے ہیں، ایک معاویہ جنہوں نے یزید کو اپنا جانشین بنایا اور ایک آپ جو محمود کو اپنا جانشین بنا رہے ہیں۔ اور اسی پر بس نہیں کی بلکہ اس زمانہ میں روزانہ "پیسہ" اخبار میں سرسید کے خلاف ایک نہایت پر زور مضمون لکھ کر بھیجا، لیکن اس واقعہ کے چند ہی روز بعد سرسید نے وفات پائی، مرحوم نے تار بھیج کر اس مضمون کو رکوا دیا، غالباً ۱۹۰۱ء تھا، یوپی کے کوئی لفٹننٹ گورنر ولایت واپس جا رہے تھے، ان کی مشایعت کے لئے معززین اسٹیشن جا رہے تھے، مولانا شبلی مرحوم عالمانہ شان سے ایک سبز عبا پہن کر تشریف لے گئے، جب واپس آئے تو فرمایا کہ مجھ کو نواب وقار الملک کو معمولی سادہ کپڑوں میں دیکھ کر بڑی شرم آئی۔ ان چند واقعات سے مرحوم کے پورے کیرکٹر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

رفیقۂ زندگی

آخر خدا کی مرضی پوری ہوئی، دو ماہ شدید علالت کے بعد میری رفیقۂ زندگی نے ۲۷ سال کی عمر میں اس عالم کو الوداع کہا، استاد مرحوم کی وفات کے بعد یہ دوسرا سانحہ ہے، جس نے میرے سکونِ خاطر کو درہم کر دیا، اپنے یکسالہ صغیر السن بچہ کو چھوڑ کر بڑی بیکسی میں جان دے دی۔ یہ ۱۲؍ اپریل ۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے، لیکن اب تک حواس بجا نہیں ہوئے۔ میری حیاتِ منزلی کی اس بربادی کے غم میں جن احباب نے تعزیت ناموں کے ذریعہ سے شرکت کی ہے، اُن کا ممنون ہوں، لیکن بہتر ہو تاکہ میرے بجائے دعائے خیر سے اس مرحومہ کو یاد کرتے کہ اب میری قلبی تسلّی اسی کی روحانی تسلّی میں ہے، خدا عفت و وفا کے اس پیکر کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

مرحومہ نے تیرہ سال تک میری زندگی کی رفاقت کی، دس برس سے صحت خراب تھی، اور کبھی کامل صحت اس عرصہ میں اس کے تنِ زار کو میسر نہ آئی، علاج کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہوا، پچھلے دس برس میں اس انتشارِ حال اور پراگندگی خاطر کے باوجود مجھ سے جو کچھ قوم وملت کی خدمتیں انجام پاسکیں وہ بجائے خود تعجب انگیز ہیں کہ اس طویل عرصہ میں کبھی میرے دل و دماغ نے فراغِ خاطر نہ پایا۔

میں مرحومہ کی زندگی میں غالبؔ مغفور کا یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔

میں بھی تمہیں بتاؤں کہ مجنوں نے کیا کیا   فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

اس پیکرِ وفا نے اپنی جان دے کر بھی علم و ملّت کی خدمت گزاری کے لئے کشاکشِ غمِ پنہاں سے فرصت عطا کی، لیکن ایک ایسا کانٹا دل میں چُبھ کر رہ گیا جو شاید عمر بھر نہ نکلے۔

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا — عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ — تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
گوش محرومِ پیام و چشم محرومِ جمال — ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

مرگِ یار

وارداتِ حالیہ

ہم سفر وادیٔ ہستی میں وہ دلبر نہ ہوا — شمع اس راہ میں اس کا رخِ انور نہ ہوا
ہجر کا خوف کبھی، اور کبھی محشر کا رنج — چین گاہے دلِ مضطر کو میسر نہ ہوا
تیر جو آئے فلک سے ہدف ان کا میں تھا — ظلم کیجے نہ کبھی اس کو جو مجھ پر نہ ہوا
درد اٹھ اٹھ کے مرے دل میں ٹھہر جاتا ہے — کیوں رگِ دل کی جگہ سینہ میں نشتر نہ ہوا
یہ تماشائے جہاں خواب ہے میں مانتا ہوں — پر یہ کیوں خواب مرے واسطے شب بھر نہ ہوا
کس سے کیجئے دلِ شیدا گلۂ تنہائی — مسند آرا مرے پہلو میں جو دلبر نہ ہوا
نازِ بیجا تو اٹھایا ہے، پہ مرنے والے — میں ترے نازِ بجا کا کبھی خوگر نہ ہوا
تیرے جانے پہ گماں تھا کہ ہو محشر برپا — تو گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا
دل کو کیوں موردِ احساس بنایا یارب — حسرت اس کی ہے کہ یہ دل ہوا پتھر نہ ہوا
حیف اس خون کی قسمت جو مژہ سے ٹپکے — قطرۂ اشک ہوا، بادۂ احمر نہ ہوا
گر قضایائے جہاں قابلِ تغییر نہیں — کیوں نہ کہیے کہ مرے واسطے داور نہ ہوا
دل میں بیٹھا ہو کوئی اس سے تسلی تو نہیں — پردۂ دل میں جو ہے بر سرِ منظر نہ ہوا
قہر آلود نظر میں، نگہِ لطف بھی تھی — لطف فرما نہ رہا جب وہ ستمگر نہ ہوا

باعثِ رنج ہے امید کا پیدا ہونا
یارب اس خرمنِ امید میں اخگر نہ ہوا

غمزدہ
سلیمان

جمادی الاخریٰ ۱۳۳۵ھ، اپریل ۱۹۱۷ء

جسٹس سیّد کرامت حسین

جسٹس سید کرامت حسین کی ناگہانی موت گو عام دنیائے علم کیلئے کچھ کم باعثِ حسرت نہیں ہے لیکن ہمارے لئے اس سے زیادہ غم افروز ہے۔ مرحوم ہماری مجلس کے نائب صدر تھے اور ہمیشہ اپنے قیمتی مشوروں سے ہماری اعانت کرتے تھے۔ وہ خود بھی علمی مشاغل میں مصروف رہتے تھے، آخر عمر میں "المرآۃ" نام ایک ضخیم کتاب عورتوں کے حقوق وخصائص پر تصنیف فرمارہے تھے۔ ان کی سادگی اخلاص کا ایثار اور خالص علمی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

وہ لکھنؤ کے خاندانِ اجتہاد سے تھے، انہوں نے عربی کی تکمیل کے بعد انگریزی کیطرف توجہ کی اور لندن جاکر بیرسٹر ہوئے، انکو فلسفہ سے خاص ذوق تھا، جدید فلسفہ کے دقائق کو اردو میں لکھنے کی ابتدا انہیں سے ہوئی، سالمات کی اصطلاح انہیں کی بنائی ہوئی ہے، اردو میں افرادکاسیہ کے نام سے ان کا بڑا اچھا رسالہ ہے، وہ ہندوستان واپس آکر علی گڑھ کالج میں پہلے قانون کے پروفیسر ہوئے۔ اسی زمانہ میں مولانا شبلی سے ان کی ملاقات اور راہ ورسم ہوئی۔ عربی فلسفہ، لغت یعنی عربی فیلالوجی سے ان کو بڑی مناسبت تھی۔ المقدمہ کے نام سے عربی میں ان کا ایک رسالہ نہایت مفید ہے۔

آخر میں الہ آباد ہائیکورٹ میں جج ہوگئے تھے۔ اس سے الگ ہونے کے بعد لکھنؤ میں قیام کیا تھا، مسلم گرلز اسکول انہیں کے وقف سے وجود میں آیا۔

اس زمانہ میں دارالمصنفین نیا نیا قائم ہوا تھا ہمارے ارکانِ خاص میں مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی اور مولوی عبدالباری صاحب ندوی جدید فلسفہ کے عشاق میں تھے اور اسوقت اُن کے نزدیک سب بڑا کام یہ تھا کہ اُردو زبان میں جدید فلسفہ کی اہم کتابوں کو منتقل کیا جائے، اس بناء پر جسٹس سید کرامت حسین صاحب سے اس تجویز کو خاص تعلق تھا اور اسی لئے وہ دارالمصنفین کے نائب صدر منتخب ہوتے اور جب تک جیتے رہے وہ اس راہ میں ہماری رہنمائی کرتے رہے۔

اُن سے ملنے کا اتفاق اس وقت ہوا جب وہ ہائی کورٹ کی ججی سے پنشن پاکر لکھنؤ میں مہاراجہ صاحب محمود آباد کے مکان قیصر باغ میں مقیم تھے۔ غالباً دو تین بار ملاقات ہوئی، دراز قد، گداز بدن، خشخاشی داڑھی، سانولا رنگ، پورے متین وسنجیدہ اور بھاری بھرکم۔

جمادی الاخری ۱۳۳۵ھ اپریل ۱۹۱۷ء

مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی

افسوس کہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی کا انتقال ہو گیا، بقول علامہ شبلی مرحوم، مولانا حالی کے بعد کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی ہیں، افسوس کہ دوسرا حالی بھی اس مہینہ ہماری دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مرحوم کا سہل اور رواں کلام ہمارے بچوں کا ابتدائی سبق تھا۔ وہ اپنی پیرانہ سالی کی مرتعش زبان سے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اس پیار سے سمجھاتے تھے کہ وہ نصیحت کی گراں باری کو کھلونا سمجھ کر اٹھا لیتے تھے، افسوس کہ یہ کھلونے بنانے والا بھی اب نہ رہا۔

مدارس میں اُردو فارسی کی مدرسی کی سرکاری خدمت سے گوشہ نشین ہو کر وہ ہمہ تن علمی خدمات میں مصروف ہو گئے تھے، تدوین کلام خسرو کے سلسلہ میں قرآن السعدین کی تقریظ و تحشیہ سے فارغ ہو کر حیاتِ خسرو کی ترتیب میں مصروف تھے۔ اس کے علاوہ قواعد اردو اور لغاتِ اردو کی تکمیل کا کام شروع ہو رہا تھا، جو افسوس کہ ناتمام رہا۔ میرٹھ میں ایک مدرسہ "بناتُ المسلمین" بھی اُن کے اعمالِ حسنہ کی یادگار ہے۔

محرم ۱۳۳۶ھ، نومبر ۱۹۱۷ء

مولوی عبدالغنی صاحب وارثی

اس مہینہ ہماری قوم کے ایک اور فاضل نے داغ مفارقت دیا، یعنی جناب مولوی عبدالغنی صاحب وارثی عظیم آبادی نے وہ مضافاتِ بہار میں سے استھاواں نام ایک مردم خیز قصبہ میں پیدا ہوئے تھے، عربی کے فاضل اور انگریزی کے عالم تھے، عربی کی تعلیم آرہ کے مدرسہ میں پائی تھی۔ اس وقت انگریزی کا نیا نیا دَور تھا، انہوں نے عربی کتابیں ختم کر کے اس وقت علی گڑھ کے مدرستہ العلوم میں انگریزی پڑھی، جب کہ وہ ایک اسکول کا جھونپڑا تھا، انگریزی تعلیم کے بعد انہوں نے بانکی پور میں اخبار نویسی کی زندگی اختیار کی، پھر حیدرآباد گئے، اور مترجمی کے عہدے پر ممتاز ہوئے اور آخر رفتہ رفتہ اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل سرکار حیدرآباد ہوئے۔ حیدرآباد میں وہ اس بزم کے ممبر تھے جس کے صدر نشین علامہ شبلی، مولوی عبدالحلیم شرر، اور مولوی عزیز مرزا مرحوم تھے، چند مہینہ ہوئے کہ پنشن پاکر خانہ نشین ہوئے تھے کہ دفعتہً ۱۰جون ۱۹۱۸ء کی شب کو درد سینہ سے وفات پائی۔

مرحوم کو اخلاق و تصوف سے فطری ذوق تھا، اسی لئے ان کی تصنیفات زیادہ تر اسی موضوع پر ہیں۔ یوذاسف و بلوہر جو اصل میں ایک ہندی قصہ اور بُودھ کی زندگی اور تعلیم کا خلاصہ ہے۔ مسلمانوں کے عہد عروج میں اس کا عربی میں ترجمہ ہوا تھا، پھر کلیلہ و دمنہ کی طرح وہ عربی سے دنیا کی اکثر زبانوں میں منتقل ہوا۔ مولوی صاحب مرحوم عربی سے اُردو میں اس کا نہایت عمدہ ترجمہ کر کے ہندوستان کی کھوئی ہوئی دولت کو پھر ہندوستان واپس لائے، یہ قصہ اس قدر پُر اثر اور ہندی تمثیلات سے اس قدر مملو ہے کہ شبہ ہوتا ہے کہ کیا موجودہ انجیل اسی

سے ماخوذ ہے، عربی میں اخلاق کی ایک اور چھوٹی سی کتاب ہندوشاہ کی "الکلم الروحانیہ فی الحکم الیونانیہ" ہے، مرحوم نے اس کو بھی اپنی زبان میں منتقل کیا۔ اولیاء اللہ کے حالات میں امام شعرانی کی ایک مستند ضخیم کتاب عربی میں ہے، اس کو بھی نعمتِ عظمٰی کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا، عربی کی الف لیلہ اور ابن شداد کی سیرۃ صلاح الدین کا ترجمہ بھی انہوں نے بعض امرائے دکن کی فرمائش سے کیا تھا۔ لیکن شائع نہیں ہوا۔ آج کل رسالہ الناظر میں (شاید لین پول کی) انگریزی تاریخ اسپین کا نہایت صحیح ترجمہ عربی ناموں کی صحت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ پچھلی بار جب مولوی صاحب سے وطن میں ملنے کا اتفاق ہوا تو فرماتے تھے کہ اب اس فرصت میں امام شعرانی کی لائف پوری کروں گا، افسوس کہ خود ان کی لائف پوری ہو گئی۔

ماہ شعبان ۱۳۳۶ھ مطابق جون ۱۹۱۸ء

مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازیپوری

جناب مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری کا واقعہ وفات علماء کے طبقہ میں خاص حیثیت سے اثر انگیز ہے، مولانائے مرحوم نے گو طبعی عمر پائی لیکن اس خیال سے کہ وہ اس عہد میں اگلی صحبتوں کے تنہا یادگار تھے۔ ہم ان کے لئے اس سے درازی عمر کے متوقع تھے، مولانا اتباعِ سنت، طہارت تقویٰ، زہد وورع تبحر علم، وسعتِ نظر اور کتاب وسنت کی تفسیر وتعبیر میں یگانہ عہد تھے، اپنی عمر کا بڑا حصہ انہوں نے علم دینیہ خصوصاً کتاب مجید اور حدیث شریف کے درس وتدریس میں گزارا اور سینکڑوں طلبہ انکے فیضِ تربیت سے علماء بن کر نکلے، ابتداً چشمۂ رحمت غازیپور میں، پھر مدرسہ احمدیہ آرہ میں اپنا مسندِ درس بچھایا، آخر عمر میں دلی کے دارالحدیث میں قیام فرمایا، لیکن خانگی حوادث کے باعث پریشان حال رہے، اب افسوس کہ یہ شمعِ نور وہدایت ۲۱ صفر ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۶ نومبر ۱۹۱۸ء کو ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

مجھے لکھنؤ میں مولانا سید عبدالحیٔ صاحب ناظم ندوہ کی قیام گاہ پر مولانا سے ملاقات کی سعادت ایک دو دفعہ حاصل ہوئی، دُبلے پتلے، نحیف، داڑھی کے بال خفیف، سادی وضع، صورت سے متواضع اور حلیم معلوم ہوتے تھے۔

مرحوم کا اصلی وطن گو موضع اعظم گڑھ تھا، مگر قیام بیشتر غازی پور میں رہا، اسلئے غازیپوری کے نام سے شہرت پائی، ابتدائی تعلیم چشمۂ رحمت غازی پور میں ہوئی، یہاں مولوی رحمت اللہ صاحب غازی پوری، اور مولوی فاروق صاحب چریاکوٹی سے پڑھا، پھر جونپور جاکر مدرسۂ امام بخش میں مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی سے درسیات پڑھیں اور آخر میں حدیث کی کتابیں مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی سے پڑھیں اور مسلک میں انہیں کی تعلیم کا اثر ان پر غالب ہوا۔

دسمبر ۱۹۱۸ء

مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی

اخبارات سے یہ خبر معلوم ہو چکی ہو گی کہ جناب مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی نے ۷ رنومبر ۱۹۲۰ء کو بعارضہ فالج بھوپال میں انتقال کیا، مفتی صاحب مرحوم عربی درسگاہوں کی قدیم تعلیم کے بہترین نمونہ تھے، ہندوستان کے مشاہیر علماء میں اُنکا شمار تھا، وہ ادب میں مولانا فیض الحسن صاحب اور دینیات میں مولانا احمد علی صاحب محدث کے شاگرد تھے، مولانا فیض الحسن صاحب کے انتقال کے بعد اورینٹل کالج لاہور کی پروفیسری کی جگہ انکو ملی اور انکی عمر کا بڑا حصہ اسی درسگاہ میں گزرا، اخیر زمانہ میں وہ دارالعلوم ندوہ کے مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے تھے اور اسکے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس ہوئے وہیں سے بیمار ہوکر اپنے صاحبزادہ جناب مفتی انوار الحق صاحب ایم اے ناظم و مشیر تعلیمات بھوپال کے پاس گئے تھے جہاں انہوں نے وفات پائی، غالباً وفات کے وقت مفتی صاحب مرحوم کی عمر ستر کے قریب ہو گی، تعلیمی خدمات کے علاوہ مفتی صاحب کا بڑا کارنامہ انجمن مستشار العلماء لاہور ہے، جو ایک قسم کا دارالافتاء ہے۔ مرحوم نے بعض عربی کی درسی کتابوں پر حواشی بھی لکھے تھے۔ ان کی وفات سے علماء کی صف میں ایک ایسی جگہ خالی ہے جس کے بھرنے کی اب آئندہ امید نہیں۔

ربیع الاول ۱۳۳۹ھ

نومبر ۱۹۲۰ء

غمِ اکبر!

محرم سنہ ۱۳۴۰ھ میں ہماری زبان کا زندہ دل شاعر اس دنیا سے چل بسا۔ اس گلستان نما خزاں آباد کی بہت سی بہاریں اس کی آنکھوں نے دیکھیں، وہ اس وقت عالمِ وجود میں آیا تھا، جب ہندوستان انقلاب کی کروٹیں لے رہا تھا، اس لئے لامحالہ اس کی زبان سے وہی نالے بلند ہوئے جو قوموں کے انقلاب اور ملکوں کے تغیرات کی خبر دیتے ہیں۔ اس کے ضخیم دیوان کے اوراق ہماری سیاسی، اخلاقی، معاشرتی، تخیلی اور تعلیمی انقلابات کی تاریخ ہے۔ آئندہ نسلیں اس کے صفحات کو پڑھیں گی اور انیسویں بیسویں صدی کے اسلامی ہندوستان کی تصویر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گی۔ اس کی زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا اہم واقعہ گزرا ہو جس کو اس نے اپنے کاشانۂ خیال میں جگہ نہ دی ہو۔ زبانِ خلق نے اس کو لسان العصر کا خطاب دیا اور اس سے بہتر لقب اس کے لئے دوسرا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس میں تین صفتیں ایک ساتھ جمع تھیں، وہ فطری فلسفی، پاک مشرب صوفی اور زندہ دل شاعر تھا، اس کا نمکِ ظرافت ہمارے عیوب کے زخموں پر کسی قدر تیز چرکا لگاتا ہو، تاہم اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ درحقیقت نمک نہیں مرہم تھا۔ سرسید کے زمانہ سے لے کر اب تک تمام ہندوستان تمدنِ جدید کے حسنِ منظر پر والہ وشیدا تھا لیکن صرف ایک اکبر کی زبان تھی جو برملا اس کے عیوب ونقائص واشگاف کرتی رہتی تھی۔

وہ مکروہاتِ عالم سے آزردہ اور حیاتِ دنیا سے بیزار تھا۔ اشعار کے علاوہ اس کا شاید ہی کوئی خط اس بیان سے خالی ہو۔

وہ اکثر اپنے خطوط میں مجھے لکھا کرتے تھے۔

اوّلیت نا شدہ ختم است من آخر شدہ ام

آخر اس شکوہ سنج حیات کی حیات بھی آخر ہوگئی۔

مرحوم کو سب سے پہلے میں نے شاید ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں مولانا شبلیؒ کے پاس دیکھا تھا، دبلا پتلا بدن، چہرہ پر جھریاں، گال سکڑے ہوئے، چشم گریاں، مگر دل خنداں، اس کے بعد لکھنؤ اور الہ آباد میں بار بار ملاقاتیں ہوئیں، جیسے جیسے ملتا گیا، ہنسوڑ شاعر کے بجائے دانائے فطرت حکیم کے رنگ میں وہ مجھ پر ظاہر ہوتا گیا۔ ایک دفعہ ایک خط میں مجھے لکھا تھا۔

اپنے غم خانہ کا دروازہ کرو بند اکبر

اب نہیں کوئی سوا موت کے آنے والا

اب اس کے غم خانہ کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا اور وہ موت جس کے آنے کی وہ راہ دیکھا کرتا تھا آگئی۔

بوڑھے اکبر! مبارک ہو کہ تیرے دل کی مراد پوری ہوگئی اور تجھے مسرت جاوید نصیب ہوئی۔

ستمبر ۱۹۲۱ء

ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی

ماہِ گزشتہ میں ایم مہدی حسن (افادی الاقتصادی) کا انتقال ادبیاتِ اردو کے لئے ایک سخت حادثہ ہوا، مرحوم ایک سحر نگار ادیب اور ایک خاص طرزِ انشاء (اسٹائل) کے موجد تھے، معارف کے افق پر یہ برق ایک سے زائد بار چمکی اور یقین ہے کہ ناظرین کے دلوں میں "شبلی سوسائٹی اور معاصرانہ چشمک" کے لکھنے والے کی یاد ابھی بالکل تازہ ہوگی، مرحوم کو مولانا شبلی کی ذات سے گہرا تعلق تھا، اسی لئے وہ معارف کو بھی بہت عزیز رکھتے تھے اور دارالمصنفین کی مجلسِ انتظامی کے رکن تھے، ادب و انشاء کا ایسا ذوقِ سلیم رکھنے والے افراد مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ۲۲ نومبر کو یہ ماہتابِ کمال پیوندِ خاک ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

گورکھپور وطن تھا، مشرقی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم حاصل کی تھی۔ ترقی امینی سے تحصیلداری تک بتدریج ترقی کی تھی۔ نہایت مہذب اور سنجیدہ تھے، مزاج میں نفاست اور لطافت حد درجہ تھی۔

ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۰ھ

دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء

مولانا رشید احمد صاحب سالم انصاری

ماہ گزشتہ کا سب سے بڑا علمی حادثہ جناب مولانا رشید احمد صاحب سالم انصاری کی وفات ہے، مرحوم نے تقریباً بیس پچیس برس مسلسل ہماری زبان کی خدمت کی۔ عربی و فارسی کے وہ لائق ادیب تھے، اُن کا علمی شوق و ذوق فطری تھا۔ ان کی زندگی کا اکثر حصہ مطالعہ اور کتب بینی میں صرف ہوتا تھا، قلمی کتابوں کی تلاش اور جستجو میں انہوں نے ہندوستان کا گوشہ گوشہ چھان ڈالا تھا۔ آخر میں ذی الحجہ سنہ ۱۳۴۰ھ میں جب علی گڑھ میں خاکسار اُن سے ملنے گیا تو اُن کو بستر مرگ پر پایا اور یہی اُن کا مرض الموت تھا، اس عالم میں بھی جتنی دیر اُن کے پاس بیٹھنے کا اتفاق ہوا وہ علمی تذکرے کرتے رہے اور جہانگیر نامہ کے ایک قلمی نسخہ کو بڑی محنت سے ترتیب دیا تھا، اس کی اشاعت کا تذکرہ کرتے رہے۔ اردو مترجمات میں المدنیۃ والاسلام، النصرانیۃ والاسلام، کتاب التوحید، الفوز الکبیر، وغیرہ مفید تالیفات یادگار چھوڑی ہیں، ترک موالات کے سلسلہ میں مرحوم علی گڑھ کالج چھوڑ کر جامعہ ملیہ میں چلے آئے تھے اور یہیں سے رخصت ہوئے، خدا مغفرت ارزانی فرمائے۔

صفر سنہ ۱۳۴۰ھ

اکتوبر سنہ ۱۹۲۲ء

مولانا محمد یونس فرنگی محلی مرحوم

بے مہریٔ دہر بین کہ دریک ہفتہ   گل سرزد و غنچہ گرد و بشگفت و بریخت

نہایت رنج و افسوس اور حسرت و اندوہ کے ساتھ ہم ناظرین کو یہ خبر سناتے ہیں کہ ملک کی بزم دانش کا ایک نوجوان ممبر اٹھ گیا، مولانا محمد یونس فرنگی محلی مرحوم نے پچھلے مہینہ لکھنؤ میں مرض دق وفات پائی۔ مرحوم مولانا عبدالحی مرحوم فرنگی محلی کے نواسے تھے اور اپنے ذاتی علم و فضل میں اپنے ہمعصر نوجوانوں میں ممتاز تھے۔ ۲۴، ۲۵ برس سے زیادہ عمر نہ تھی، معقولات اور فلسفہ سے ان کو خاص دلچسپی تھی اور اپنی عمر کا بڑا حصہ انہیں کی تحقیق اور کاوش میں بسر کیا۔ خود اپنے ذاتی شوق سے انگریزی اور فلسفۂ جدید حاصل کیا۔ دارالمصنفین اور معارف سے مرحوم کو خاص محبت تھی، کئی سال سے ان کی صحت مخدوش تھی، بایں ہمہ وہ اپنے علمی انہماک سے باز نہیں آتے تھے۔ گزشتہ سال عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہو کر گئے تھے، وہاں مرض نے طول پکڑا، آخر وطن آکر اس شہید علم نے جان دی، مرحوم کی ایک کتاب "روح الاجتماع" دارالمصنفین سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے اور اپنی ایک اور دوسری تصنیف ابن رشد کا مسودہ دارالمصنفین میں بھیج چکے تھے۔ جو عنقریب چھپ کر شائع ہو گی۔ مرحوم کے دوستوں کو اُن کی ذات سے بڑی بڑی توقعات تھیں اور خیال تھا کہ ان کی کوششوں سے فرنگی محل کی عقلی اور فلسفیانہ شان پھر دوبارہ زندہ ہو گی۔ افسوس کہ دستِ اجل نے امان نہ دی، انا للہ

ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۱ھ

دسمبر سنہ ۱۹۲۲ء

مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب

ناظم ندوۃ العلماء

چند مہینوں سے معارف کا پہلا صفحہ علم وفن کے بزرگوں پر ماتم کے لئے مخصوص ہو گیا ہے، آج ہم دوسروں پر ماتم کرتے ہیں، کل دوسرے ہمارا ماتم کریں گے، دنیا کی یہ بزم ماتم اس فانی کائنات کے وجود کے ساتھ قائم ہے اور اسی کے ساتھ قائم رہے گی۔ یہ حوادث آباد عالم جس کو ہم تم قائم مستمر اور مسلسل جان رہے ہیں، ہر آن و ہر لحظہ اس طرح بدل رہا ہے کہ غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ جو نقشہ، جو کیفیت، جو صورتِ حال اس آن ہے وہ اُس آن نہیں، ایک مستمر تغیر اور ایک مسلسل انقلاب جاری ہے اور پردہ دار کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ (ہر روز ایک نئے رنگ میں جلوہ گر ہے) لیکن بایں ہمہ انقلاب و تغیر بظاہر اس کے قیام، استمرار اور تسلسل میں فرق نہیں آتا، سمندر کی لہریں ہر آن بدل رہی ہیں، مگر سمندر کی صورت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا، صورتیں مٹتی جاتی ہیں، شکلیں فنا ہوتی جاتی ہیں، مگر اس آئینہ خانہ کی آبادی اور صورت گری میں کوئی فرق نہیں آتا۔

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی

ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی!

دوسری فروری ۱۹۲۳ء کی شام کو اس مجلس کا جو ممبر اٹھا ہے، اس کا اس دنیا میں مجازی نام عبدالحئی تھا، مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب ناظم ندوۃ العلماء عہد جدید کے اولین علماء میں تھے، سادات رائے بریلی کے مشہور خانوادۂ علم و عمل سے تھے، جس کے بعض افراد سلاطین کے درباروں میں اور بعض فقر و تصوف کی خانقاہوں میں ممتاز تھے، بعض درس و تدریس کی چٹائیوں پر اور بعض تالیف و تصنیف کی مسندوں پر جلوہ آرا تھے، اس خاندان کے آخری رکن مولانا سید احمد صاحب شہید بریلوی تھے، جو سید صاحب

کے نام سے عموماً مشہور ہیں اور جو مولانا اسمٰعیل صاحب شہید کے پیر تھے اور وہ اپنے عہد کے اس فرقہ کے جو ہندوستان میں اسلام کی غربت کی چارہ سازی کیلئے اٹھا تھا اور جو دینی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے مسلمانوں کو بیدار کرنا چاہتا تھا، امام اور امیر المومنین تھے، بنگال سے لے کر پنجاب تک غدر سے پہلے مجاہدین کا جو سیلاب سکھوں کے مقابلہ کیلئے اٹھا تھا، اس کا منبع سید موصوف ہی کی ذات تھی، بالآخر سکھوں کے ایک معرکہ میں پٹھانوں کی بیوفائی سے اپنے رفقائے خاص کے ساتھ بہادری سے شہید ہوئے اور شکست خوردہ جماعت سرحد پار یاغستان کی پہاڑیوں میں پناہ گزین ہوئی اور مجاہدین کے نام سے اب تک قائم ہے، چمر قند اس کا صدر مقام ہے اور سید صاحب کے دوبارہ ظہور کی منتظر ہے۔

مولانا عبدالحیٔ مرحوم کے والد ماجد بھی ایک فاضل یگانہ تھے۔ شعر و سخن، تاریخ و سیر کے ماہر اور داستانِ کہن کی بولتی زبان تھے، ان کا سفینہ ایک یادگار چیز ہے اور ان کا تذکرہ اُن کے عہد کا تاریخی سرمایہ ہے، مولانا عبدالحیٔ مرحوم کو یہ ذوقِ فن باپ ہی سے وراثت میں ملا تھا۔

مولانا مرحوم نے ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنؤ میں مولانا سید امیر علی صاحب ملیح آبادی، مولانا فتح محمد صاحب تائب اور مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی سے تعلیم پائی، حدیث شیخ حسین صاحب محدث یمنی سے بھوپال میں پڑھی، پھر کانپور آئے، اس وقت ندوۃ العلماء کا مرکز یہی شہر تھا، مولانا سید محمد علی صاحب ناظم تھے، ان کی نگاہِ انتخاب فوراً اس جوہر قابل پر پڑی، وہ دن ہے اور ان کی وفات کا دن ہے کہ ندوہ ان کی خدمات سے کبھی محروم نہ رہا۔ ندوہ پر کیا کیا انقلابات آئے، کتنے ارکان بدلے، کتنے منتظمین آئے اور کتنے گئے، کتنے معتمد اور ناظم عزل و نصب ہوئے، کتنے فتنے اور حوادث پیدا ہوئے، مگر ان تمام حالات و حوادث کے طوفان میں ثبات و استقلال کی صرف ایک چٹان تھی، جو اپنی جگہ پر تھی اور وہ مولانا سید عبدالحیٔ صاحب مرحوم کی ذات تھی۔

باوجود شغلِ مطب، فرائضِ ندوہ اور مذہبی رجوعِ عام کے وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے، اسلامی ہندوستان کے پورے ہزار سالہ عہد میں شعراء و مشائخ اور سلاطین کے سینکڑوں تذکرے

اور تاریخیں لکھی گئیں، لیکن آزاد بلگرامی کی تصنیفات کو چھوڑ کر کوئی مختصر سا رسالہ بھی مستقل یہاں کے علماء اور فضلائے فن کے حالات میں نہیں لکھا گیا، مولانا مرحوم نے اس نقص کو محسوس کیا، اور پورے بیس برس اس کام پر انہوں نے صرف کئے اور اس عرصہ میں ہندوستان کی اس سرحد سے سرحد تک کوئی کتب خانہ نہیں چھوڑا جہاں ان کو ذوقِ طلب کھینچ کر نہ لے گیا ہو اور بالآخر تقریباً آٹھ دس جلدوں میں علماء ہند کی پوری سوانح عمریاں جمع کیں، اس کا مقدمہ لکھا، جس میں ہندوستان کے اسلامی علوم وفنون کی تاریخ مرتب کی، عربی میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا ایک صفحہ بھی نہیں، جو کچھ معلوم ہے وہ انگریزی کی زبانی، مرحوم نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ، سلاطین اسلام، یہاں کے اسلامی تمدن، مساجد، مدارس، عمارات، شفا خانے اور دیگر خصوصیات پر ایک پوری کتاب تیار کی، جو دارالمصنفین کے اہتمام سے جامعہ ملیہ پریس میں چھپ رہی ہے (افسوس کہ یہ کتاب چھپ نہ سکی)۔

مرحوم کے تذکرۂ شعرائے اردو کا ذکر اس سے پہلے ہی پرچہ میں آیا تھا اور اس کے چند صفحے بھی ناظرین کے نذر کئے گئے تھے، تذکرہ کا آخری باب یعنی متاخرین کا حصہ انہوں نے ہمارے پاس نہیں بھیجا تھا، معلوم نہیں کہ وہ ترتیب بھی پا سکا تھا یا نہیں، سورت کانفرنس کی خواہش پر انہوں نے گجرات کی علمی تاریخ لکھ کر پیش کی تھی، جو ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے چھپ کر شائع ہوئی ہے، علاوہ ازیں چند اصلاحی رسائل، نور ایمان، اصلاح وغیرہ چھپے ہیں، طبیب العائلہ (فیملی ڈاکٹر) طب میں بھی ان کا ایک رسالہ اردو میں چھپا ہے۔

مرحوم نے اپنی معنوی یادگاروں کے ساتھ چند ظاہری اولادیں بھی چھوڑی ہیں، ان کے بڑے صاحبزادے کی عمر ۲۴، ۲۵ کے قریب ہوگی، مگر باپ کو یہ دھن تھی کہ علم وفن کا کوئی شعبہ اس یادگار خاندان کی ملکیت سے باہر نہ چھوٹے، ندوہ میں عربی ادب کی کتابیں انہیں پڑھوائیں، حدیث دیوبند بھیج کر، طب خود پڑھائی، علوم عربیہ سے فارغ کر کے ان کو انگریزی شروع کرائی، چند سال میں بی ایس سی کی ڈگری حاصل ہوئی، پھر لکھنؤ میڈیکل کالج میں داخل کیا اور اب دو برس

اُن کے ختم تعلیم میں باقی ہیں[1]۔ خدا سے دعا ہے کہ برادر عزیز کامیابی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کریں۔ علم وفن اور دین وملت کی خدمت میں اپنے نامور باپ کے جانشین ثابت ہوں۔

اس ہیچمدان نے ادب عربی میں مقامات حریری اُن سے پڑھی تھی اور اُردو مضمون نویسی کا آغاز انہیں کے حکم اور حوصلہ افزائی سے شروع کیا تھا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

رجب ۱۳۴۱ھ،

فروری ۱۹۲۳ء

---

[1] ان کا نام ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ہے، جو باپ کے بعد نواب علی حسن خان کے اخیر زمانہ میں ندوۃ العلماء کے ناظم مقرر ہوئے اور اب تک اسی عہدہ پر قائم ہیں، لکھنؤ میں ڈاکٹری کے پیشہ کے ساتھ صلاح وتقویٰ، زہد وورع کے ساتھ معروف ہیں اور خاموشی کے ساتھ تبلیغ دین میں مصروف رہتے ہیں۔

مرحوم کے دوسرے صاحبزادے جو دوسری بیوی سے ہیں اس وقت بالکل ہی کم سن تھے، اس لئے ان کا ذکر اس وقت نہ کیا جاسکا، آج وہ سید ابوالحسن علی ندوی کے نام سے مشہور روزگار ہیں اور تبلیغ دین کے کام میں پورے انہماک کے ساتھ مصروف ہیں۔ وہ تین سال سے حجاز میں دعوت کے کاموں میں لگے ہیں، امسال حجاز اور مصر کی فضائیں ان کی دعوت کے نغموں سے مسحور ہیں اور اسی مناسبت سے وہ ایک سال سے حجاز اور مصر میں مقیم ہیں، اللہ تعالیٰ نے عربی تقریر وتحریر کی دولت ان کو عنایت فرمائی ہے جس کو وہ بحمداللہ کہ دین کی راہ میں لٹا رہے ہیں۔

سر آسوتوش مکرجی

گزشتہ ماہ کا سب سے بڑا علمی اور تعلیمی حادثہ سر آسوتوش مکرجی کی وفات ہے۔ بنگال کا یہ سپوت فرزند گو ایک نامور بیرسٹر، ایک قابل جج ہائیکورٹ، ایک ایک بڑا مصنف، ایک مشہور ریاضی دان تھا، تاہم اس کی ناموری، قابلیت، بڑائی اور شہرت کا سب سے بڑا مظہر یہ تھا کہ اس نے تقریباً بیس سال تک ہندوستان کی سب سے بڑی درس گاہ کلکتہ یونیورسٹی پر بحیثیت وائس چانسلر سب سے عمدہ اور بہتر حکمرانی کی، ان کی اس تعلیمی فرمانروائی کا زمانہ بنگال کی تعلیمی ترقی اور امتحانات کی وسعت اور یونیورسٹی کے انتظامات کی خوبی اور معاملات تعلیمی میں حکومت کے مقابلہ میں پوری قوت کے ساتھ اپنے حقوق کی حفاظت کے لحاظ سے ہندوستان کا تعلیمی عہد زریں کہا جاسکتا ہے، موصوف نے اپنے بست سالہ عہد فرمانروائی میں یہ ثابت کر دیا کہ جہاں تک یونیورسٹی کا تعلق ہے بنگال حکومت کی بے جا قید سے آزاد و مختار ہے، ۲۹ر مئی ۱۹۲۴ء ان کی وفات کا دن بنگال کے دائرۂ تعلیم کے لئے ایک سانحۂ عظیم ہے۔

ذیقعدہ ۱۳۴۲ھ

جون ۱۹۲۴ء

شاہ بدرالدین سجادہ نشین پھلواری

ابھی گزشتہ مہینہ کے معارف میں ہم نے حضرت امیر شریعت صوبہ بہار اور امارت شرعیہ صوبہ بہار کا تذکرہ کیا تھا، خیال میں بھی نہ تھا کہ اس کے ایک ہی مہینہ کے بعد ہم کو حضرت ممدوح کی دائمی مفارقت کا ماتم کرنا پڑے گا، حضرت مولانا شاہ بدرالدین سجادہ نشین پھلواری اس عہد کے جنید و شبلیؒ تھے، اُن کا زہد و ورع، نزاہت و اتقاء، علم و عمل، صورت و سیرت، ہر چیز نمونۂ سلف تھی، کم و بیش چالیس برس تک یہ علم و عرفان کی شمع صوبہ بہار میں روشن رہی اور اس کی روشنی دُور دُور تک پھیلتی رہی، اُن کے شب و روز کے چوبیس گھنٹے ذکر و فکر اور مطالعۂ کتب کے سوا اور مشاغل میں کمتر صرف ہوتے تھے، ان کی نشست گاہ ایک کتب خانہ تھی، اُن کے چاروں طرف کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا اور اس کے بیچ میں یہ زندہ کتب خانہ جلوہ فرما رہتا تھا، اس عہد میں یہی ایک ہستی تھی جو ظاہر و باطن، علم و معرفت، حقیقت و شریعت کا مجمع البحرین تھی اور جس سے ہزاروں اور لاکھوں علم و معرفت کے پیاسے سیراب ہوتے رہتے ہیں، پھلواری کا سجادہ اس بزرگ ذات کی رونق افروزی سے چشمۂ خورشید تھا، افسوس کہ یہ آفتاب اب ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔

وہ میرے والد مرحوم کے پیر بھائی تھے، دونوں مولانا شاہ علی حبیب صاحب قدس سرہ، سجادہ نشین پھلواری سے مستفید تھے، خاکسار کو آغاز عمر میں ۱۸۹۸ء میں پھلواری کی خانقاہ میں چند ماہ بسلسلۂ طلب علم والد ماجد مرحوم کے حسب ہدایت رہنے کا اتفاق ہوا تھا، اس وقت سے اخیر عمر تک اس ہیچمدان پر خاص نظر عنایت تھی، کبھی کبھی مکرمت ناموں سے سرفراز فرماتے، تو "اعز اخواں" کے الفاظ سے خطاب فرماتے، دارالمصنفین کی کتابوں کو پسند فرما کر قیمتاً منگواتے تھے اور معارف کو بھی اپنے مطالعہ سے سرفراز فرماتے تھے۔

صفر ۱۳۴۲ھ، ستمبر ۱۹۲۴ء

آہ! ابوالحسنات ندوی

ہمارے لئے یہ کتنا غم ناک سانحہ ہے کہ آج ہمارا قلم اس کا ماتم کرے جس کا قلم کل تک قوم وملت کا ماتم گسار تھا، ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ کا واقعہ ہے کہ مولوی ابوالحسنات ندوی نے اس عالم آب وگل کو خیر باد کہا، وہ ہماری کوششوں اور ندوہ اور دارالمصنفین کی تعلیم وتربیت کی سب سے بڑی کمائی تھے، ان کی موت نے ہماری علمی مجلس کو وہ صدمہ پہنچایا ہے جس کی تلافی شاید آخر وقت تک نہ ہوسکے، اب جب دن آئے تھے کہ وہ ملک وقوم کی دماغی وذہنی رہبری کرسکیں تو یک بیک دستِ قضا نے ہم سے وہ ہمارا بڑا سرمایہ چھین لیا جس سے ہم بڑی توقع رکھتے تھے۔

مولوی ابوالحسنات ایک نہایت ہی ذہین، طباع اور بلند حوصلہ نوجوان تھے، (پٹنہ کے ضلع میں اشرف پوران کا وطن تھا، ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی، مجھ سے انکی ملاقات ۱۹۱۲ء میں الہلال کلکتہ میں ہوئی، میں نے ان کو جوہر قابل پاکر خود پڑھانا شروع کیا جب کلکتہ چھوڑا تو انہیں لکھنؤ ندوہ میں بھجوادیا۔ جہاں انہوں نے چند سال تعلیم پائی) ندوہ کی تعلیم کے بعد ۱۹۱۸ء میں وہ دارالمصنفین آئے اور آخر دم تک ان کا رشتہ اسی علمی مجلس سے بندھا رہا۔ یہاں رہ کر انہوں نے جو علمی مضامین لکھے ہیں وہ تاریخی حیثیت سے ہمیشہ یادگار اور قابل مطالعہ رہیں گے، تحریک خلافت کے سلسلہ میں ان کے مضامین نے خاص اہمیت حاصل کرلی تھی اور وہ "ترک وخلافت" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوگئے تھے، اس کے علاوہ ہندوستان کے اسلامی مدارس پر ایک پُر از معلومات مبسوط مضمون لکھا تھا، جسے وکیل امرتسر شائع کرنے والا ہے، اس کے ساتھ ہی اورنگ زیب کے خطوط کی ترتیب کا کام شروع کررہے تھے، لیکن پانچ

سال کی مسلسل علالت نے ان کی امیدوں کے برآنے کا موقع نہ دیا اور وہ اپنے خیالات اپنے ساتھ لے گئے، زمانہ علالت ہی میں انہوں نے جمال الدین افغانی کی سوانح عمری کا مواد بھی جمع کرنا شروع کیا تھا، مگر افسوس کہ زمانہ نے ان کو کچھ کرنے کی مہلت نہ دی، انہوں نے شاعرانہ طبیعت پائی تھی، فارسی کے ساتھ خاص ذوق تھا اور ان کی فارسی و اُردو کی غزلیں قصائد و ترکیب بند عرصہ تک پڑھنے والوں کو گرم رکھیں گے (مرحوم نے اپنی طالبعلمی کے زمانہ میں اپنے بعض فارسی قصیدے حضرة الاستاذ کی خدمت میں بھیجے تھے، جن کو دیکھ کر مولانا نے مرحوم کی استعداد کی تعریف کی تھی، جن کا ذکر مکاتیب شبلی میں ہے۔

مرحوم پانچ سال سے مسلسل بیمار تھے، ابتدا میں پاؤں میں درد ہوا، وہ درد زخم ہوا، اور زخم نے ناسور کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے ساتھ ہی بخار رہنے لگا۔ علاج کے لئے انہوں نے کلکتہ، لکھنؤ وغیرہ کے طویل سفر کئے، اسی سلسلہ میں وہ راجگیر (بہار) کے پہاڑی مقام پر گئے ہوئے تھے کہ وہاں کی خاک نے اس قیمتی گوہر کو ۱۲ ربیع الثانی کو ہمیشہ کے لئے اپنی آغوش میں لے لیا۔ ان کا وطن بہار تھا، وہیں پیدا ہوئے اور وہیں سپرد خاک بھی، خاندان میں صرف ایک بھائی ہیں، خداوند تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے کہ ہمارے پاس اس دعا کے سوا اور کیا ہے۔

ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ

نومبر ۱۹۲۴ء

جناب شوق قدوائی

نہایت افسوس ہے کہ کہنہ ادیب و شاعر شیخ احمد علی صاحب متخلص بہ شوق نے ۲۷ اپریل کو گونڈہ میں انتقال کیا، مرحوم ۱۸۸۲ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان لکھنؤ سے آزاد نام کا اخبار نکالتے تھے، جو اس عہد کے معزز و مشہور اخباروں میں تھا اور اس زمانہ کے ادبار کا مظہر خیال تھا اور سرسید کی تحریکات سے کافی ہمدردی رکھتا تھا، کئی چھوٹی چھوٹی مثنویوں کے بھی وہ مصنف تھے، امیر مرحوم کے وہ شاگرد تھے اور غالباً وہ اس خانوادۂ تربیت کی آخری یادگار باقی تھے، انہیں کے عہد میں اردو کی نئی شاعری کا آغاز ہوا، مرحوم اُن قدیم شعرا میں تھے، جنہوں نے اس نئے رنگ کے قبول کرنے میں جھجک نہیں کی۔

ترانۂ شوق کے علاوہ ان کی غالباً آخری مطبوعہ مثنوی عالم خیال کے چار رخ اُردو شاعری میں ایک نئی چیز ہے، کاش اُن کے احباب و اعزہ ان کے کلام کا مجموعہ شائع کر کے انکی روحانی یادگاروں کو زندہ رکھ سکیں۔

رمضان المبارک ۱۳۴۳ھ

اپریل ۱۹۲۵ء

فرنگی محل کی آخری شمع بجھ گئی!

آہ! مولانا عبدالباری!

وَمَا كَانَ قَيْسٌ هُلْكُهُ هُلْكُ وَاحِدٍ

قیس کا مرنا صرف ایک آدمی کا مرنا نہیں ہے

وَلٰكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

بلکہ پوری قوم کی بنیاد کا گر جانا ہے۔

دریغا! کہ آج قلم کو اس مجسمۂ علم و اخلاص کا ماتم کرنا ہے، جس کے وصف و مدح کا فرض اس کو بارہا ادا کرنا پڑا ہے، دارالعلم والعمل فرنگی محل کی کہنہ عمارتوں میں فضل و کمال، ایمان و معرفت اور زہد و ورع کی جو آخری شمع جل رہی تھی وہ ۱۹، ۲۰ کی درمیانی شب میں ہمیشہ کیلئے بجھ گئی۔

فرنگی محل کے متاخرین میں حضرت استاذ استاذی مولانا عبدالحیؒ کے بعد مولانا عبدالباری کی ذات نمایاں ہوئی تھی، جو بزرگ اجداد کی بہت سی روایات کی حامل تھی، ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت، درس و تدریس، درس و تدریس، تلاش و مطالعہ، تحریر و تالیف ان کے روزانہ مشاغل تھے، ان دینی و علمی مناقب کے ساتھ دین۔ ملت کی راہ میں ان کا جان فروشانہ جذبہ اور مجاہدانہ اخلاص ہم رنگ شہدا تھا۔

ذاتی اخلاق، جود و سخا، تواضع و انکسار، علم کی عزت، صداقت، حق گوئی ان کے اوصاف گراں مایہ تھے، وہ بے کسوں کے ملجا، مسافروں کے ماوی اور تنگدستوں کے دستگیر تھے، عبادت گزار، شب زندہ دار اور حق کے طلبگار تھے۔ ہندوستان میں ان کی ذات ذی اقتدار علماء کی حیثیت سے اس وقت فرد تھی، جدید تعلیم یافتوں کی سیاسی جدوجہد کو مذہبی تحریک بنا دینا یقیناً انہیں کا

کارنامہ شمار کیا جائے گا۔ اس لئے ان کی یہ غیر متوقع موت صرف فرنگی محل کا نہیں بلکہ اسلام کا سانحہ ہے اور بنابریں ان کی جواں مرگی ہمیشہ کے لئے تاریخ اسلام کا ایک اندوہناک واقعہ شمار ہوگا۔

شمع بجھ گئی، مگر اس کے دھویں کی سیاہی سے جریدۂ عالم پر یہ ہمیشہ لکھا نظر آئے گا۔

رفتم واز رفتنِ من عالمے تاریک شد

من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

مولانا مرحوم کا سن غالباً ۴۷ کے قریب ہوگا، مولانا عبدالحئی صاحب کے شاگرد خاص مولانا عین القضاۃ صاحبؒ سے لکھنؤ میں تحصیل کی، پھر حجاز گئے، وہاں حدیث کی سند لی، ملک شام کا سفر کیا، علماء سے فیض اٹھایا، مدینہ منورہ سے ہندوستان واپس آئے اور خدام کعبہ میں پرجوش شرکت کی، پھر مجلسِ خلافت اور جمعیۃ العلماء کی تاسیس میں حصہ لیا۔ ترکِ موالات کے علمبردار بنے۔ دوسری طرف فرنگی محل میں مدرسۂ نظامیہ کے نام سے ایک باقاعدہ مدرسۂ عربیہ کی بنیاد ڈالی اور اس کو ایک باقاعدہ مدرسہ بنایا، جس سے متعدد اصحابِ فکر اور اہلِ قلم طلبہ پیدا ہوتے۔

انہوں نے اپنے بعد اپنی تالیفات وتصنیفات کی فہرست یادگار چھوڑی ہے، وہ فقہ حنفی کے پرجوش حامی تھے اور ان کی قلمی وعلمی کوششیں زیادہ تر اسی کے متعلق صرف ہوتی رہیں، اُن کی چھوٹی بڑی تصنیفات ورسائل کی فہرست ..ا کے قریب ہوگی، جن میں سب سے زیادہ مفید کارآمد ان کی اُردو تفسیر تھی، جو افسوس کہ ناتمام رہی، امام محمد کی سیر کبیر کا کام بھی اُن کے پیشِ نظر تھا، علم حدیث میں بھی ان کے ایک دو رسالے ہیں۔

افسوس کہ یہ چشمۂ فیض اب ہمیشہ کے لئے خشک ہوگیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

مرحوم کی خدمت میں نیازمندِ ندوہ کے ایک خادم کی حیثیت سے اس وقت سے تھا، جب وہ حجاز سے لوٹ کر آئے تھے اور مولانا شبلی مرحوم سے کبھی کبھی ملنے آیا کرتے تھے، یہ واقعہ ۱۹۰۸ء

یا اس کے پس وپیش کا ہوگا، اس کے بعد وہ ندوہ کے رکن منتخب ہوئے تو اور تعلق پیدا ہوا۔۔ مگر ایک دو سال کے بعد ۱۹۱۴ء میں استعفار دیدیا، طرابلس کی جنگ کے زمانہ میں شوکت علی مرحوم نے جب خدام کعبہ کی مجلس کی بنیاد ڈالی اور وہ اس کے صدر ہوئے اور یہیں سے ان کی سیاسیات کا ذوق بڑھنا شروع ہوا تو قرب اور بڑھا، ۱۹۱۳ء میں ہنگامہ مسجد کانپور میں محمد علی و شوکت علی اور راجہ صاحب محمود آباد اور سر علی امام اور لارڈ ہارڈنگ کی گفت و شنید میں مسلمانوں کی مذہبی نمائندگی کا فریضہ انہیں نے انجام دیا، اس کے بعد جب گزشتہ بڑی جنگ کے خاتمہ میں ترکی اور ملک شام و عراق و حجاز کے حصے بخرے ہونے لگے تو اس زمانہ میں مشہور ہین اسلامی مصنف مشیر حسین قدوائی لندن میں تھے، مولانا سے ان کا سلسلۂ نیاز قدیم تھا، وہ لندن سے مولانا کو اسلامی سیاسیات کی مختلف تجویزیں لکھ لکھ کر بھیجا کرتے تھے اور ادھر محمد علی و شوکت علی صاحب نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی، ان دوگونہ تعلقات کی بنا پر مولانا اسلامی سیاسیات میں پیش از بیش بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ ۱۹۱۸ء میں لکھنؤ میں ترکی اور خلافت کے مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک بڑی نمائندہ کانفرنس جس میں تمام ہندوستان کے اکابر علمار اور زعمار اور عام مسلمان جمع ہوئے تھے، اس دردناک سانحہ کے وقت بھی اس سے زیادہ دردناک سانحہ یہ تھا کہ لکھنؤ کے رہنما متحد نہ تھے، مولانا عبدالباری ایک طرف اور چودھری خلیق الزماں اور بعض جدید تعلیم یافتہ لیڈر دوسری طرف نبرد آزما تھے، کانفرنس کا وقت آگیا، رفاہِ عام میں مجمع ہوگیا، نمائندے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے، دونوں طرف دو صدر، ایک طرف سے مسٹر فضل الحق صاحب کلکتہ اور دوسری طرف سیٹھ ابراہیم پونہ صدارت کے منتظر تھے، مگر گتھی سلجھتی نہ تھی، یہاں تک کہ کانفرنس شروع ہوگئی، بے مزہ تقریروں اور تفرقہ انداز گفتگوؤں میں صبح سے شام ہوگئی، یہاں تک کہ جلسہ اخیر عصر کو ختم کیا جا رہا تھا کہ مولوی سید ظہور احمد صاحب مرحوم وکیل و سکریٹری مسلم لیگ نے مجھ سے کہ اسٹیج پر صدر کے قریب بیٹھا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا رسمی طور سے پوچھا کہ آپ تو کچھ نہیں کہیں گے، میں نے کہا اگر آپ اجازت دیں۔ صدر سیٹھ ابراہیم

صاحب نے جن سے میری پونہ کی ملاقات تھی، خوشی سے اجازت دی، میں کھڑا ہوگیا، اللہ تعالیٰ کا عجیب فضل وکرم کہ خدا جانے مجھ میں کہاں سے ایسی موثر گویائی آگئی کہ ۱۵ منٹ کی تقریر میں صدر سے پائیں گریہ وبکا کا محشر بپا ہوگیا اور بگڑا ہوا جلسہ دم کے دم میں بن گیا، مولانا کو اس سے بڑی خوشی ہوئی اور برملا فرمایا کہ آخر ایک عالم ہی کی سیاست کامیاب ہوئی اور یہی واقعہ مولانا کے اس عاجز کے ساتھ حسن ظن کا سبب بن گیا، بڑی نوازش فرمائی، ۱۹۱۹ء کے دسمبر میں امرتسر کی خلافت کانفرنس میں جب یورپ کو وفد جانا طے ہوا تو میرا نام علماء کے نمائندہ کی حیثیت سے داخل فرمایا اور انہوں نے اپنی بہت سی تجاویز کے ساتھ یورپ کو روانہ فرمایا، وفد کو پہنچانے بمبئی تک آئے، اس موقع پر بمبئی میں جو شاندار استقبال ہوا وہ بھی یادگار تھا، چند اسٹیشن پہلے سے ٹرین سے اتار کر ہم لوگ اسپیشل سے بمبئی لائے گئے، بہرحال اس سفر میں ہفتہ بھر کی روداد سفر مولانا کو لکھتے رہنا میرے سپرد تھا، چنانچہ اس خدمت کو برابر انجام دیتا رہا، اور وہ خطوط ہندوستان بھر کے اخباروں میں اس زمانہ میں چھپے تھے، واپسی پر مولانا نے اپنے مدرسۂ نظامیہ کی طرف سے ایک مجمع میں مجھے ایڈریس پیش کر دیا، اخباروں میں یہ اعلان کیا کہ اب ان کی اپنی کے بعد ملت کی خدمت ان کے سپرد کر کے سیاسیات سے دست کش ہوتے ہیں، مولانا کی یہ شفقت اور اخلاص وفد حجاز تک قائم رہا۔ حجاز کے مسائل میں ان کی رائے دوسری تھی، اس سلسلہ میں ان سے اختلاف رائے ہوا، تاہم ذاتی تعلق اخیر وقت تک قائم رہا۔

جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ

جنوری ۱۹۲۶ء

ہماری جماعت کا لعل شب چراغ گم ہوگیا

آہ! عبدالرحمان

اس دو سال کے عرصہ میں ندوۃ العلماء نے اپنے کیا کیا گوہر آبدار کھوئے! ابوالحسنات مرحوم مفتی یوسف مرحوم اور آہ کس زبان سے کہیں عبدالرحمان مرحوم! دارالعلوم ندوہ نے اپنی تیس برس کی مدت میں جتنے کارآمد اور علم دین کے خادم پیدا کئے، یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ عبدالرحمان ان سب میں بہتر تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی ذات میں علم و عمل کی ساری خوبیاں جمع کر دیں تھیں۔

لَيْسَ مِنَ اللهِ بِمُسْتَنْكَرٍ   اَنْ يَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِيْ وَاحِدٍ

خدا سے یہ محال نہیں، کہ دنیا کو ایک ذات میں جمع کر دے

مرحوم کا وطن نگرام تھا، جو ضلع لکھنؤ کا ایک مردم خیز قصبہ ہے یہاں کے انصاریوں کا خاندان مدت سے اپنے آس پاس اور اطراف اودھ میں علم و ارشاد کی مسند ہے، مرحوم اسی خاندان کے فرزند تھے، وفات کے وقت ستائیس سال کی عمر تھی، گویا ۱۹۰۷ء کی پیدائش ہوگی، ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے اعزہ سے حاصل کی غالباً ۱۹۰۷ء میں وہ دارالعلوم میں داخل ہوئے، اسوقت میں مدرسہ میں ادبیات کا معلم تھا اور مرحوم نے کچھ ابتدائی کتابیں مجھ سے پڑھیں تھیں، مرحوم کا بچپن آنکھوں کے سامنے ہے، اسی زمانہ سے جب وہ مدرسہ میں بہت چھوٹے سے تھے، وہ اچھی صاف اور سلجھی ہوئی تقریر کرتے تھے، چھوٹی سی عمر اور چھوٹے سے قد میں ان کی یہ ادا ایسی دل فریب تھی کہ وہ جلسوں میں تماشہ بن جاتے تھے۔ مولانا شبلی مرحوم جو اچھی استعداد اور قابل جوہر کے ہمیشہ جویاں رہتے تھے وہ خاص طور سے مرحوم کی تربیت سے دلچسپی رکھتے تھے، ایک دو دفعہ جلسوں میں وہ اپنے ساتھ ان کو لے کر گئے، مدرسہ سرائے میر (اعظم گڑھ) کے پہلے یا دوسرے اجلاس میں

مولانا جب ان کو ساتھ لائے تو اس بچہ کی زبان سے ایسے اچھے خیالات اور ایسی سنجیدہ تقریر سن کر لوگ حیرت میں آگئے۔

سنہ ۱۹۰۸ء میں آریوں نے شدھی کا پہلا فتنہ اٹھایا تھا، مولانا شبلی مرحوم اس سے بے حد متاثر ہوئے تھے، گروکل کے اصول پر مولانا نے خدام الدین کی ایک جماعت بنائی تھی، جس میں اُن طلبہ کو داخل کیا تھا، جن کے والدین یا اولیاء اپنے بچّہ کو صرف مذہب کی خدمت کے لئے وقف کر سکیں، یہ بچے سادہ پہننے، سادہ کھانے اور سادہ رہنے کا عہد کرتے تھے اور زمین پر سوتے تھے، اس جماعت میں جو طلبہ داخل ہوئے ان میں ایک یہ مرحوم بھی تھے، یہ جماعت مٹ گئی، اس کا بانی رخصت ہوگیا، حالات بدل گئے، مگر عبدالرحمٰن مرحوم نے اس حیثیت سے جو عہد کیا تھا، اس کو اخیر تک پورا کیا۔

مرحوم نے سات آٹھ برس دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی، غالباً سنہ ۱۹۱۵ء میں انہوں نے مدرسہ سے تعلیم کی فراغت حاصل کی، اس سے ایک سال پہلے دیوبند جا کر مولانا محمود حسن صاحب سے بیعت کی اور اجازت حاصل کی، سنہ ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی مرحوم نے جو کام چھوڑے تھے ان کے متوسلین اور شاگردوں نے ان کا بار اپنے ناآزمودہ کار کندھوں پر اٹھا لیا، ان میں ایک دارالمصنفین کا قیام اور دوسرا مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کا چلانا تھا، میرے ساتھ مولانا مسعود علی اور مولانا عبدالسلام ندوی نے دارالمصنفین کا کام سنبھالا اور دوسری طرف مولانا حمید الدین صاحب کے زیر ہدایت مولانا شبلی متکلم ندوی نے مدرسہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا، تعلیم سے فارغ ہو کر مرحوم بھی وابستگانِ شبلی کی جماعت میں داخل ہو گئے اور چار برس تک مدرسہ سرائے میر میں رہ کر درس و تدریس کا فرض انجام دیا اور مدرسہ میں زیر تربیت چند اچھے لڑکے[1] پیدا کئے، اس اثناء میں اضلاع مشرقی میں جونپور سے گورکھپور تک اُن کی اصلاحی تقریریں مقبول ہو رہی تھیں، اسی زمانہ میں حضرت مولانا حمید الدین صاحب کے زیر سایہ قرآن پاک کا فیض حاصل کیا۔

[1] جن میں سے ایک آج مولانا امین احسن کے نام سے مشہور ہیں۔

ترکِ موالات کے شباب میں جب سرکاری مدارس توڑے جا رہے تھے، مدرسہ عالیہ کلکتہ پر چھاپا مارا گیا اور اس کی جگہ مولانا ابوالکلام صاحب نے مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد کلکتہ قائم کیا، اس وقت مرحوم سرائے میر سے کلکتہ گئے اور مدرسۂ اسلامیہ جامع مسجد کلکتہ کی صدر مدرسی کا عہدہ قبول کیا، مولانا ابوالکلام قید ہوئے مدرسہ کی مالی حالت جیسی تھی وہ ظاہر ہے، اس مدرسہ کو مرحوم نے چند سال تک جس ایثار، جس محنت، جس جفاکشی سے چلایا وہ حد درجہ حیرت انگیز ہے، مدرسین کو سنبھالنا، لڑکوں کو تسکین دینا اور پھر شہر میں اس کا اثر قائم رکھنا معمولی بات نہ تھی، اس تمام مدت میں شاید ہی ان کو اپنے ذاتی معاوضہ کی فکر ہوئی یا اُن کو وہ ہر ماہ مل سکا ہو، اس راہ میں کئی کئی وقت ان پر ایسے گزرے کہ فاقوں تک نوبت پہنچ گئی، لیکن پیشانی پر بل تک نہ پڑنے دیا۔

کلکتہ میں اس زمانہ میں شہر خلافت کمیٹی کے وہ صدر منتخب ہوئے اور پورے شہر کو اپنے اخلاص، ایثار و محبت سے گرویدہ بنا لیا، خلافت کانفرنس کلکتہ میں وہ صدر استقبالیہ بنائے گئے اور کامیاب خدمات انجام دیں، جن کی یاد اب تک اہل کلکتہ کے دل میں ہے۔ ۱ر مارچ کو جب میری زبانی کلکتہ میں اُن کی وفات کی خبر پہنچی تو وہاں کے قومی کارکنوں کو سخت صدمہ ہوا وہ متوقع تھے کہ اجلاس جمعیۃ العلماء کے موقع پر میرے ساتھ وہ مرحوم بھی ہونگے اور جب اُن کو معلوم ہوا کہ میرے ساتھ وہ نہیں بلکہ ان کی حسرتوں کی نعش آئی ہے تو چہروں پر ایک عجیب عالم طاری ہوگیا۔

مدرسۂ اسلامیہ کلکتہ کے بانیوں نے جب مدرسہ کو بند کرنے کا تہیّہ کرلیا، تو ان کے دوستوں نے ان کو وہاں سے ہٹا لینا مناسب سمجھا، چنانچہ وہ میرے اصرار پر کلکتہ سے لکھنؤ آئے اور ۱۹۲۳ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ادب و تفسیر کی خدمت اُن کے سپرد کی گئی، جس کو انہوں نے آخر تک انجام دیا۔

اُن کو وجعِ مفاصل کی اکثر شکایت رہتی تھی، مئی ۱۹۲۵ء میں وہ اس عارضہ میں بیمار

تھے اور نقیہ ہوگئے تھے، اس وقت سے جو ان کی علالت کا سلسلہ شروع ہوا وہ ۵؍مارچ ۱۹۲۶ء کو ختم ہوا، بیچ بیچ میں تندرست بھی ہوتے گئے، مگر مسلسل صحت قائم نہیں رہی، ستمبر ۱۹۲۵ء میں ان کو معدہ وجگر کی خرابی کی بیماری ہوئی اور یہ ممتد رہی، نومبر میں کچھ افاقہ ہوا تو وہ اجلاس ندوۃ العلماء کے جلسہ میں گئے، وہاں سے واپس آکر پھر طبیعت خراب ہوئی، مدرسہ سے رخصت لے کر مکان گئے اور اس کے بعد وہ اکثر رخصت ہی پر رہے، بہرائچ میں اُن کے بعض اعزہ مطب کرتے ہیں، اُن کے اصرار پر وہ بغرض علاج بہرائچ گئے اور وہاں اصل مرض میں افاقہ ہوتا رہا کہ دفعتہً ان کے داہنے پاؤں میں سرطانی پھوڑا نمودار ہوا۔ جس پر ۵؍مارچ ۱۹۲۶ء کو عمل جراحی کیا گیا، جو بظاہر کامیاب ہوا، یہ پھوڑا اس قدر کم اہم سمجھا گیا کہ اُن کے وطن میں بھی اس کی اطلاع کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

۵؍مارچ ۱۹۲۶ء کا دن گزر کر رات کو کچھ گھبراہٹ کے آثار ظاہر ہوئے، مگر صبر واستقلال کے اس مجسمہ نے تیمارداروں کو خود مطمئن کر دیا، ۶؍مارچ کی صبح کو نماز فجر کے وقت نبض جب غیر منتظم پائی گئی، تو ان کے طبیب ومعالج ورفیق وعزیز حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ "اس وقت انہوں نے جو جوابات دیئے وہ ایسے شخص کی زبان سے جس کی حالت بالکل غیر ہو رہی ہو، حد درجہ حیرت انگیز تھے" اس کے بعد خود وضو کیا اور نماز فجر ادا کی، اُدھر سلام پھیرا اور ادھر ایک ہچکی کے ساتھ عبدالرحمان رحمان کے پاس پہنچ گیا، اسی دن کی شام کو بعد مغرب لکھنؤ سے دارالمصنفین خبر پہنچی، یہ تار برقی نہ تھی ایک بجلی تھی جو دل پر گری اور تمناؤں کے خرمن کو خاک وسیاہ کر گئی۔

مرحوم کی وفات سے نوجوان طبقۂ علماء میں جس رکن کی کمی ہوئی اور ہندوستان میں مذہبی اصلاحی تحریک کو جو صدمہ پہنچا، اس کا یقین ان کو کس طرح دلائیں جو اس سے واقف نہ تھے، وہ ان لوگوں میں نہ تھا، جو مسائلِ مذہبی اور ضروریاتِ زمانہ میں تطبیق دیتے وقت مذہب کا پلہ ہلکا کر دیتے ہیں، وہ ہمیشہ سے ایک خاموش مذہبی آدمی تھا، تقویٰ اور دینداری اسکے فضل وکمال کا زیور تھا، اکثر وہ لوگ جو اصلاحی خیالات رکھتے ہیں عملاً مذہب میں کمزور ہوتے ہیں مگر اس کی ذات خشک وتر کا مجموعہ تھی، وہ حد درجہ مذہبی اور حد درجہ مصلحانہ تھا،

اس کی تحریر وتقریر کا ایک ایک حرف مذہبی واخلاقی اصلاحات کا دفتر ہے۔

اس کے قلمی خیالات کا پہلا عکس مقالہ خواتین اسلام ہے، اس کو رسالہ کی صورت میں ہر ہائنس سرکار عالیہ بھوپال کے اعلان پر غالباً ۱۹۱۸ء میں مرحوم نے لکھا تھا، یہ رسالہ ۷۵ صفحوں کا اپنے موضوع میں منفرد ہے، اس میں آیات واحادیث کی روشنی میں عورتوں کے فضائل، مناقب، حقوق، فرائض اور اولیات بیان کئے ہیں، اتفاق سے میرا بھوپال جانا ہوا، تو معلوم ہوا کہ ہر ہائنس نے اس کو پسند فرمایا اور دیکھا کہ اپنے دست خاص سے جابجا اس پر بعض مباحث کے متعلق مزید تفصیل چاہی ہے، میں اس رسالہ کو بھوپال سے اپنے ساتھ لیتا آیا اور جون وجولائی ۱۹۲۱ء کے معارف میں تھوڑی تمہید کے ساتھ شائع کیا۔

سرائے میر کے قیام کے زمانہ میں مدرسہ کے طلبہ کے لئے حدیث وادب کی تعلیم کیلئے آلائی الحکم نام سے مرحوم نے ایک رسالہ لکھا اور وہ چھپا، اس میں وہ حدیثیں یکجا کی گئی ہیں جو معنوی تعلیم کے علاوہ لفظی حیثیت سے بھی ادب عربی کی جان ہیں، انہی دنوں میں میری تالیف لغات جدیدہ کو جس کی ترتیب عربی سے اُردو ہے، انہوں نے بدل کر اردو سے عربی کر کے میرے پاس بھیجا، وہ مسودہ اب تک غیر مطبوع ہے، اسی زمانہ میں عید اضحی کا ایک عربی اُردو خطبہ لکھا تھا۔

قیام کلکتہ کے زمانہ میں سیاسی مضامین مختلف مذہبی اور فرضی افسانوں کی صورت میں لکھے، اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے، اس قسم کے مضامین کا ایک مجموعہ "درس آزادی" کے نام سے لاہور کے ایک تاجر کتب نے شائع کیا ہے، "عدم تشدد کی فتح" ایک اور سیاسی رسالہ کا عنوان ہے، جو کلکتہ میں لکھا گیا تھا، خلافت کانفرنس کلکتہ کا استقبالیہ خطبۂ صدارت بھی مطبوع ہے، انجمن تبلیغ الاسلام ترکرام کے صدر کی حیثیت سے یہ سُن کر کہ آریہ سیتارتھ پرکاش کو عراق عرب میں شائع کرنا چاہتے ہیں، مرحوم نے مولانا ثناء اللہ امرتسری کی حق پرکاش کا حشو وزوائد نکال کر عربی میں ترجمہ کیا، اور اس کا نام نور الحق رکھا اور وہ زیر طبع ہے، ندوہ میں میری فرمائش سے عربی میں منطق پر ابتدائی رسالہ

لکھا، عزیز مرحوم کے اصلاحی خیالات کا سب سے بڑا مظہر سچ لکھنؤ تھا، جس کے وہ شریک انشار تھے، دو سال سے ہر ہفتہ وہ کسی نہ کسی مفید عنوان پر نہایت سادہ عبارت اور پُرتاثیر انداز میں مضامین لکھا کرتے تھے۔

مرحوم نے ندوہ میں انگریزی بھی پڑھی تھی اور اس میں تھوڑی استعداد بھی پیدا کی تھی، قدیم عربی تصنیفات کے مطالعہ کا بھی شوق تھا اور اس میں بڑی وسعتِ نظر پیدا ہوگئی تھی، مرحوم کا اصل فن ادب نہ تھا تاہم وہ اس فن کی مشکل کتابیں پڑھاتے تھے، عربی میں برجستہ انشار پردازانہ مضامین لکھتے تھے، چنانچہ رسالہ الجامعہ کلکتہ میں دو تین مضامین ان کے نکلے تھے، عربی میں بلاتکلف گفتگو کرتے تھے اور اسی طرح فلسفہ وکلام کی کتابیں بھی وہ دیکھتے تھے، مگر اصلی ذوق ان کا اصلاحی وتجدیدی تھا، اسی لئے علامہ ابن تیمیہ کی تصانیف کے وہ بے حد شائق تھے، سرائے میر کے قیام کے زمانہ میں حضرت مولانا حمید الدین سے تفسیر کا جو فیض اٹھایا، وہ اثر ان پر مستقل قائم ہوگیا، مشہور کتب احادیث پر بھی ان کی خاصی نظر تھی۔

یہ فضل وکمال، تقریر وتحریر، مطالعہ، وسعت نظر تو الگ چیزیں ہیں، مرحوم کی زندگی کا اصلی جوہر اُس کے اخلاق تھے، سرتاپا انکسار، سرتاپا تواضع، حد درجہ فروتن، مگر اسی کے ساتھ حد درجہ بے نیاز، غنی نفس، بلند حوصلہ، اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا حد درجہ لحاظ رکھنے والا، مطیع فرمانبردار، مگر اسی کے ساتھ خدا کے سوا ہر بڑائی سے نڈر اور ہر کبریائی سے بے خوف، ترکِ موالات کے زمانہ میں اعظم گڑھ اور کلکتہ میں ان کی سیاسی تقریریں حد درجہ بلا انگیز ہوتی تھیں، مگر اُس کا دل کبھی خوف سے آشنا نہیں ہوا، بڑوں بڑوں کے سامنے اظہارِ حق میں خاکساری وتواضع کے اس پیکر کی آنکھ نہیں جھپکی، اس کا پورا عہد جوانی وشباب اس زہد وسادگی سے گزرا کہ زہد وسادگی کو بھی اس کی جوانی پر رحم آگیا ہوگا، گاڑھے کا لمبا کُرتا، سادی دُوپلی ٹوپی اور اسی کا پائجامہ جو پہلے پہنا، وہ اخیر تک جسم پر رہا، ترکِ موالات سے اس کی وفاداری بہتیروں کی طرح صرف دکھاوے کی نہ تھی، بلکہ وہ جلوت میں جس طرح ظاہر کرتا تھا، خلوت میں بھی اسی طرح تھا، ہیں

نے شیروانی پہننے کے لئے بہت اصرار کیا، مگر غریبانہ تبسم کے سوا جو اس کے چہرے کا نور تھا اور کبھی کچھ جواب نہ دیا، جاڑوں میں کبھی ایک دو کمبل سے زیادہ نہیں اوڑھا، وہی بچھونا وہی اوڑھنا۔

وہ انسان کی صورت میں ایک فرشتہ تھا، اُس نے نوجوان ہو کر اپنے اخلاق اور دینداری سے بوڑھوں کو شرمایا، ایک دفعہ ایک تقریب سے جس میں ہم سب شریک تھے، وہ صرف اس لئے اٹھ آئے کہ اس میں انگریزی باجہ بجے گا، عبدالرحمٰن! تو گیا اور ہمیشہ کے لئے گیا، تو نے علماء اور مسلمانوں کے سامنے اپنی زندگی کا نمونہ پیش کیا، اہلِ ایمان کی شہادت ہے کہ تیری زندگی خدا کے حضور معتبر ٹھہری، تو رحمتِ الٰہی کی گود میں مسرور ہوگا، لیکن ہم تیری جدائی میں اشک بار ہیں، تیرا جسم لحدِ خاکی میں ہے، مگر تیری یاد تیرے دوستوں کے دلوں میں ہے، تیری رُوحانی آرزو پوری ہو چکی، لیکن تیری ذات سے ہماری مادی آرزوئیں ناتمام رہیں اور شاید اب وہ ہمیشہ کے لئے ناتمام رہیں، مرنا ایک دن سب کو ہے، افسوس اس کا ہے کہ تو آیا اور گیا، مگر لوگ تجھے پہچاننے نہ پائے۔

شعبان ۱۳۴۴ھ

مارچ ۱۹۲۶ء

آہ! عماد الملک مرحوم

نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور مولانا شبلی کی وفات کے بعد ہماری بزم علم و ادب صرف ایک چراغ سے روشن تھی، لیکن افسوس کہ ۳/ جون ۱۹۲۶ء کو باد حوادث کے جھونکوں نے اس کو بھی گل کر دیا، نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی کی وفات ایک ایسا جاں گداز حادثہ ہے، جس پر قدیم و جدید دونوں گروہ یکساں رنج و الم کے ساتھ ماتم کریں گے، ایک طرف تو وہ انگریزی زبان کے بہت بڑے عالم اور انشار پرداز تھے، دوسری طرف قدیم مشرقی علوم و فنون میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے اور ان کے بقاء و قیام اور اشاعت میں نہایت دلچسپی اور ہمدردی کے ساتھ ہر ممکن اعانت کے لئے آمادہ رہتے تھے، دائرۃ المعارف، دار المصنفین، ندوہ، مسلم یونیورسٹی، غرض اس وقت قدیم و جدید علوم و فنون کے جس قدر مرکز ہندوستان میں قائم ہیں سب کے سب ان کی علمی دلچسپی، علمی اعانت اور علمی سرپرستی کے ممنون تھے، اب اُنکے در و دیوار سے ایک مدت تک اُن کے ماتم کی صدائے بازگشت آتی رہے گی کہ

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

نواب صاحب مرحوم کا خاندان اودھ کے مشہور مردم خیز قصبہ بلگرام سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اُن کے دادا ماجد چونکہ اعلیٰ انگریزی سرکاری ملازمت کے سلسلہ سے بہار، بنگال میں رہتے تھے، اس لئے ان کی پیدائش اور ابتدائی نشو و نما کا دور بہار اور بنگال میں گزرا، وہ ضلع گیا میں ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے اور چودہ پندرہ سال کی عمر تک خانگی طور سے مقامی علماء سے عربی و فارسی کی تحصیل کی، اس طرح عربی کی متوسطات تک تعلیم کے بعد انگریزی کی طرف توجہ کی، پہلے

بھاگلپور میں، پھر پٹنہ میں اور اس کے بعد کلکتہ کے انگریزی اسکولوں میں تعلیم پاکر ۱۸۶۱ء میں آنرز کے ساتھ درجۂ اول میں بی، اے پاس کیا تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے علمی ذوق کی مناسبت سے ملازمت کے لئے سر رشتۂ تعلیم کو پسند کیا اور کیننگ کالج لکھنؤ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، لیکن قدرت کو ان سے بلند کام لینا تھا، وہ انگریزی زبان کے بہت بڑے ادیب تھے ۱۸۷۲ء میں سر سالار جنگ اعظم جو اس وقت دولتِ آصفیہ کے مدار المہام تھے، بطریق سیر و سیاحت لکھنؤ آئے، ان کو انگریزی کے اچھے پرائیویٹ سکریٹری کی ضرورت تھی، جو انگریزی مراسلات کے کاموں کو انجام دے سکے، لکھنؤ میں جنرل بارو نے اس کے لئے ان کا انتخاب کیا اور ان کو پسند کیا اور حیدرآباد طلب فرمایا، چنانچہ وہ ۱۸۷۳ء میں حیدرآباد پہنچ کر سر سالار جنگ کے پرسنل اسسٹنٹ مقرر ہوئے اور ۱۸۷۶ء تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے، اس کے بعد سر سالار جنگ یورپ کے سفر سے جب واپس آئے تو ان کو اپنا پرائیویٹ سکریٹری اور صیغۂ متفرقات کا معتمد مقرر کیا، جس میں سر رشتۂ تعلیم اور متعدد چھوٹے چھوٹے محکمے شامل تھے۔ اس کے بعد جب اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خان بہادر مسند آرائے سلطنت ہوئے تو نواب صاحب کو اپنا پرائیویٹ سکریٹری مقرر فرما کر علی یار خان موتمن جنگ بہادر کا خطاب عطا فرمایا اور چند سال کے بعد ان کو عماد الدولہ اور پھر عماد الملک کے خطابات عطا ہوئے، تھوڑے زمانہ کے بعد وہ ریاست کے محکمۂ تعلیمات کے ناظم یعنی ڈائرکٹر اور شہزادہ ولی عہد میر عثمان علی خان بہادر کی تعلیم و تربیت کے نگراں مقرر ہوئے، انہوں نے اپنی مفوضہ سرکاری خدمات کو جس خوبی سے ادا کیا اس کا اعتراف انگریزی گورنمنٹ نے بھی کیا، گورنمنٹ انگریزی نے ۱۹۰۳ء میں ان کو اپنی مجلس وضع قوانین کا رکن نامزد کیا، پھر چند سال کے بعد جب اصلاحات مارلے نافذ ہوئیں، تو وہ وزیر ہند کی مجلس کے رکن ہو کر انگلستان چلے گئے اور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۰۹ء تک اس معزز منصب پر وہاں رہے، وہاں ان کی صحت اچھی نہیں رہی، اس لئے مستعفی ہو کر ہندوستان واپس آ گئے، اب اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان کی جگہ پر حیدرآباد کی مسند پر اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان جلوہ فرما تھے نواب سالار جنگ ثالث

جو ابھی نوجوان ہی تھے، مدار المہام مقرر ہوئے تھے، اعلیٰ حضرت عثمان علی خان نے نواب عماد الملک کو اُن کی مدد کے لئے مشیر المہام مقرر کیا، لیکن یہ زمانہ جلد ختم ہو گیا اور نواب صاحب گوشہ نشین ہو کر صرف علمی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔

نواب صاحب کو حقیقت میں صرف علمی ہی ذوق تھا اور وہ اسی لئے بنے تھے، ان کا سارا دن کتابوں کے مطالعہ میں گزر جاتا تھا، دقیق علمی کتابوں سے تھک جاتے تھے تو انگریزی افسانوں کی کتابیں پڑھا کرتے تھے، عربی کی الف لیلہ سے ان کو بڑی دلچسپی تھی، اخیر زمانہ میں اُن سے جب ملاقات ہوئی، اس کی تعریف ضرور فرمائی، ان کا ذاتی کتب خانہ بہت اعلیٰ درجہ کا تھا، جس میں عربی، فارسی، انگریزی فرنچ کی عمدہ عمدہ کتابیں تھیں، کچھ خاندانی قلمی کتابیں تھیں، مگر اکثر خود انکے ذاتی ذوق و شوق کا نتیجہ تھیں، میں نے ۱۹۰۸ء میں اس کتب خانہ کو دیکھا تھا، عربی شعراء کے سادہ اشعار کو نہایت پسند کرتے تھے۔ انگریزی نہایت سادہ اور سہل ممتنع لکھتے تھے اور نہ صرف انگریزی نثر میں کمال رکھتے تھے، بلکہ انگریزی کے بہت بڑے شاعر بھی تھے، مگر اس کے باوجود ان کو یہ بڑا کمال حاصل تھا کہ اُردو گفتگو اور تحریر میں کوئی انگریزی لفظ نہیں بولتے تھے، بلکہ ہندوستانیوں سے وہ انگریزی میں بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے اور اس کے عجیب عجیب واقعے سننے میں آئے ہیں، اخیر عمر میں مولانا شبلی مرحوم کی تحریک سے انہوں نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ شروع کیا تھا جو سولہ پاروں تک ہو کر ضعف بصارت و علالت کی وجہ سے رک گیا، اس ترجمہ میں بالکل بائیبل کی زبان اختیار کی ہے، انگریزی کے علاوہ فرانسیسی زبان کے بھی ماہر تھے اور اس سے بے تکلف ترجمہ کر سکتے تھے۔ بنگالہ میں نشو و نما ہونے کی وجہ سے بنگالی زبان بھی بے تکلف بولتے تھے، ان کو اردو شاعری سے بھی ویسی ہی دلچسپی تھی، چنانچہ میرؔ کے کلام کا انتخاب بھی انہوں نے کیا تھا جو چھپ گیا ہے، ان کی اُردو تحریر بالکل سادہ لیکن رواں ہوتی تھی اور انہوں نے بہت سے علمی، ادبی، فلسفیانہ اور تاریخی مضامین لکھے، جن کا مجموعہ رسائل عماد الملک کے نام سے ابھی چھپا ہے، وہ ہمیشہ علماء و فضلاء کے قدر دان رہے، ان کو ایک عالم یا طالب العلم کی صحبت میں جا ہے

وہ کتنی ہی کم حیثیت کیوں نہ ہو، بڑا لطف آتا تھا۔

مولانا شبلی مرحوم سے ان کا تعلق سرسید کے زمانہ سے اور انہیں کے واسطہ سے ہوا تھا، چنانچہ مرحوم ان کی بڑی قدر فرماتے تھے، "الفاروق" کی تالیف میں ان کی حوصلہ افزائی کو بھی دخل ہے، جامعہ عثمانیہ جس کا پہلا نام حیدرآباد کی مشرقی یونیورسٹی پڑا ہوا تھا، اس کے نصاب اور خاکہ کی تیاری کے لئے مولانا شبلی مرحوم کا انتخاب انہیں کے اشارہ سے ہوا تھا اور [illegible] میں مولانا شبلی مرحوم کی ماہانہ تنخواہ میں دوسو ماہوار کا اضافہ نواب صاحب ہی کی تحریک سے اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان نے منظور فرمایا۔

مولانا شبلی مرحوم سے اسی تعلق اور دارالعلوم ندوہ کی تعلیم میں مشرقی و مغربی علوم و فنون کی جامعیت کی بنا پر اس سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے، چنانچہ ۱۹۰۷ء میں انہوں نے ندوہ کو اپنا قیمتی کتب خانہ عطا فرمایا اور ہر موقع پر طلبا ندوہ کی سرپرستی و قدردانی کرتے رہے، آج دائرۃ المعارف حیدرآباد میں ندوہ کے جو فارغ التحصیل طلبہ کام کر رہے ہیں، وہ ان کی اس قدردانی و سرپرستی کے مشکور و معترف ہیں اور ندوہ سے اپنی اس دلچسپی کو حیدرآباد کی تعلیمی کانفرنس کی صدارتی تقریر میں ظاہر بھی کر دیا ہے۔

مولانا شبلی کی نسبت اور ایک علمی مرکز ہونے کی حیثیت سے انہوں نے دارالمصنفین کے ساتھ ابتدا ہی سے اپنا شغف ظاہر فرمایا اور جس کو اخیر زندگی تک قائم رکھا، چنانچہ جب دارالمصنفین قائم ہوا تو انہیں کی سفارش سے مولانا شبلی مرحوم کی تین سو ماہوار سرکار آصفیہ نے دارالمصنفین کے نام منتقل کر دی، اس کے ساتھ خاص اپنی جیب سے انہوں نے اس کے لئے سالانہ سو روپے کی رقم مقرر فرمائی اور مجھے لکھا کہ دارالمصنفین پہلا انسٹیٹیوشن ہے جس کے لئے میں یہ مستقل رقم مقرر کرتا ہوں، لیکن یہ رقم ان کے حوصلہ کے مطابق نہ تھی، اس لئے اس پر ہمیشہ تاسف و ندامت کا اظہار کرتے رہے، وہ دارالمصنفین کی مجلس منتظمہ کے پہلے صدرنشین تھے اور اخیر تک اس تعلق کو قائم رکھا، معارف کا بالاستیعاب ہمیشہ مطالعہ فرماتے تھے اور جو مضمون پسند آتا اس پر خوشی

ظاہر کرتے اور اس کے لکھنے والے کے حالات دریافت فرماتے، مولانا عبدالباری ندوی سے ان کا تعارف اسی طرح ہوا، دارالمصنفین کی تصنیفات جب اُن کی خدمت میں بھیجی جاتی تھیں تو ان کو لازمی طور پر پڑھتے تھے اور اگر ضعف و علالت کی وجہ سے خود نہیں پڑھ سکتے تھے تو دوسروں سے پڑھوا کر سنتے تھے اور ان تصنیفات کے پہنچنے پر مجھے جو خط لکھتے تھے، اُس میں اُن کی داد دیتے تھے، اور اپنی مسرت کا اظہار کرتے تھے، علمی حیثیت سے ان کی سب سے بڑی یادگار مجلس دائرۃ المعارف حیدرآباد ہے، جو ہندوستان میں اپنے قسم کی پہلی یادگار ہے، آج ہندوستان میں عربی زبان کی قدیم و نادر کتابوں کی طبع و اشاعت کا کوئی سامان نہیں ہے، جدید تعلیمیافتہ گروہ کو تو اسکی پرواہی نہیں، لیکن قدیم تعلیمیافتہ جماعت نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں کی، نواب صاحب مرحوم پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور حیدرآباد میں اس غرض کے لئے ایک مستقل انجمن دائرۃ المعارف کے نام سے قائم کی، جو ہر سال عربی کی نادرالوجود کتابوں کو اڈٹ کر کے شائع کرتی ہے، چنانچہ ابھی حال میں قائم کی، مستدرک اور امام رازی کی مباحث شرقیہ جیسی اہم اور نادرالوجود کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور متعدد نادرالوجود قلمی کتابوں کی تصحیح ہو رہی ہے، نواب صاحب مرحوم کی یہ ایک ایسی یادگار ہے جو اگر مستقل طور پر قائم رہی تو ہمیشہ علماء و فضلاء کو اپنا گرویدۂ احسان رکھے گی اور اس سے ریاست حیدرآباد کے علمی وقار میں بھی نمایاں اضافہ ہوگا۔

خاکسار کی ملاقات ان سے پہلے پہل حیدرآباد میں ہوئی، جس کی صورت یہ ہوئی کہ مرحوم نے مولانا شبلی کی تحریک سے اپنا جو کتب خانہ ندوہ کو دیدیا تھا، اس کتب خانہ کو حیدرآباد سے لانے کیلئے مولانا مرحوم نے میرا انتخاب کیا، چنانچہ سب سے پہلی دفعہ میں حیدرآباد روانہ ہوا، جناب مولوی عبدالغنی صاحب وارثی کے یہاں جو میرے وطن کے قریب کے اور عزیز بھی تھے اور مولانا کے دوست تھے، قیام ہوا اور انہوں نے مولانا شبلی مرحوم کی خواہش کے مطابق نواب صاحب سے جا کر ملایا اور اس سلسلہ سے تقریباً ایک مہینہ تک نواب صاحب کے پاس

روزانہ آنے جانے کا کام جاری رہا، وہ ایک ایک کتاب نکال کر مجھے دیتے تھے اور میں اس کو علیحدہ رکھتا جاتا تھا، اس کے بعد سے آخر عمر تک نواب صاحب کے علمی تعلقات کا سلسلہ برابر جاری رہا، خصوصاً حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی وفات کے بعد جو نومبر ۱۹۱۴ء میں ہوئی، اُن کی شفقتِ بزرگانہ سے یہ تعلقات برابر بڑھتے رہے، خط و کتابت کا آغاز اس طرح ہوا کہ استاذ مرحوم کی وفات پر جو اُردو مرثیہ میں نے لکھا تھا وہ ان کے پاس بھیجا، جواب میں ایک ایسا نکتہ حوالۂ قلم فرمایا جو ہمیشہ میرے لئے رہنما ثابت ہوا، فرمایا، عرض ہنر اس وقت تک نہیں کرنا چاہئے جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ اب اس ہنر میں میرا کوئی حریف نہ ہو سکے گا، حیدرآباد جب جانا ہوتا تو شفقت سے ملتے، دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے، اسلامی علوم و فنون و تمدن و تاریخ گفتگو کا موضوع ہوتا، ہمیشہ اپنے مکتوبات سے ممنون فرماتے، افسوس کہ دستِ اجل نے اس سلسلہ کو بند کر دیا، ان کی تصنیفات میں اُردو کا ایک مجموعۂ مضامین اور انتخابِ دیوانِ میر ہے، ایک زمانہ میں عربی کا بھی ایک رسالہ جاری کیا تھا، ان کا انگریزی ترجمۂ قرآن جو پندرہ سولہ پاروں تک پہنچا تھا وہ ہنوز مسودہ کی صورت میں ہے، اخیر زندگی میں سہو غالب ہو گیا تھا اس لئے وہ ایک ہی قسم کی بات بار بار کرتے رہتے تھے، اخیر زمانہ میں جب ان سے ملاقات ہوئی، عربی کی الف لیلہ کے ذریعہ سے مسلمانوں کے تمدن پر ایک کتاب لکھنے کی برابر فرمائش کرتے تھے، افسوس کہ یہ جلیل القدر ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا اور اب کوئی اس کی جگہ لینے والا نہیں۔

جون ۱۹۲۶ء

مولوی نورالہدیٰ ندوی بہاری

مولانا عبدالرحمان مرحوم کے ماتم سے ابھی آنکھیں خشک نہیں ہوئی تھیں کہ ہم کو ندوہ کے ایک دوسرے قابل فرزند مولوی نورالہدیٰ ندوی کے ماتم میں اشک بار ہونا پڑا، جو مقاصد ندوہ کی تکمیل میں ابھی تگ ودو کر رہا تھا، مرحوم نے تقریباً سات سال تک ندوہ میں عربی کی تعلیم حاصل کی، پھر تین سال مدرسۂ الٰہیات کانپور میں بسر کرکے انگریزی شروع کی اور اس سال بی اے آنرز کا امتحان دیا تھا اور اس کے بعد ہم ان سے مقاصدِ ندوہ کے مطابق ہر قسم کی علمی توقعات قائم کرسکتے تھے، جس کے آثار ان کی زندگی کے نہایت ابتدائی دور سے نمایاں تھے اور تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ ان میں بھی تدریجی ترقی ہوتی جاتی تھی، چنانچہ وہ پہلے ندوہ میں طلبہ کے قلمی رسالہ الاصلاح کے اڈیٹر رہے پھر کلکتہ میں ایک روزنامہ کو اڈٹ کیا، رسالہ حور جو کلکتہ سے نکل کر چند ماہ کے بعد بند ہوگیا، انہیں کے دستِ بازو کے بل پر نکلتا رہا۔ معارف میں بھی انہوں نے بعض مضامین لکھے تھے، لیکن اب تکمیل کے بعد جب کہ یہ توقعات باضابطہ اور مستقل صورت اختیار کرتیں،

این ماتم سخت است کہ گویند جوان مرد

ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ

جون ۱۹۲۶ء

مولانا شررؒ

عین اس وقت جب ہم اردو رسالوں کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈال رہے ہیں، اُردو کا وہ سب سے پرانا رسالہ اور اس کا وہ اڈیٹر یاد آتا ہے جس نے سال کے آخری مہینہ کی آخری تاریخوں میں ہماری دنیا کو الوداع کہا، یعنی مولانا عبد الحلیم شرر صاحب لکھنوی، اڈیٹر دل گداز، مولانا ہمارے انشار پردازوں میں سب سے پرانے انشار پرداز تھے، اکہتّر برس کی عمر میں بعارضۂ فالج وفات پائی، مرحوم نے اپنی عزت اور شہرت تنہا خود اپنے قلم سے حاصل کی تھی، وہ اپنی شہرت کیلئے کسی نامور ہستی سے انتساب کے ممنون نہ تھے، انہوں نے اپنے تمام معاصرین میں سب سے زیادہ اپنی زبان کی خدمت کی فرصت پائی، ہمارے خیال میں ۱۸۸۲ء سے انہوں نے اپنے کام کا آغاز کیا اور جو اخیر زمانۂ وفات دسمبر ۱۹۲۶ء تک قائم رہا، بیچ بیچ میں کبھی کبھی حیدر آباد کے قیام کی مصروفیتیں پیش آجاتی تھیں، تاہم ان کا تسلسل کبھی ٹوٹنے نہیں پایا، ۴۶ برس کا عہد خدمت اُن کے کسی معاصر کو میسر نہیں آیا، پھر اُن کے ادبی اور علمی خدمات کی گوناگونی اور کثرت بھی اُن کا خاص امتیاز ہے اور یہ کہنا بھی سچ ہے کہ انہیں کی تصنیفات نے اردو میں سینکڑوں انشار پرداز پیدا کئے اور ملک میں تاریخ کا مذاق پیدا کیا اور سنجیدہ تصنیفات کے لئے حُسن قبول کا راستہ صاف کیا۔

خاکسار کو مولانا کا پہلا شرف نیاز ۱۹۰۴ء میں حاصل ہوا اور یاد آتا ہے کہ وہ اس وقت حیدر آباد سے واپس آئے تھے اور اتحاد اور پردۂ عصمت نکالنا شروع کیا تھا، وہ عربی زبان کے مستند عالم تھے، بچپن میں وہ اپنے نانا کے ساتھ واجد علی شاہ کے مٹیا برج میں رہے تھے اور اس طرح جب ہوش سنبھالا، تو اپنے کو سخنورانِ اُردو کی آغوش میں پایا، لکھنؤ آکر عربی علوم کی باقاعدہ تعلیم مولانا عبد الحیٔ صاحب مرحوم فرنگی محلی کے حلقۂ درس میں پائی تھی اور حدیث کی تعلیم دہلی میں جاکر مولانا سید نذیر حسین محدّث سے حاصل کی تھی، اسی لئے مولانا کا میلان زیادہ تر

اہل حدیث کے مسلک کی طرف تھا اور عقائد میں وہ سخت اور غالی اشعری تھے، امام ابوالحسن اشعری سے ان کو خاص عقیدت تھی، عربی کے ساتھ ان کو انگریزی سے بھی واقفیت تھی اور کسی قدر فرنچ سے بھی آشنا تھے، یورپ کی بھی سیر کر آئے تھے، واپسی میں جب وہ جبرالٹر (جبل طارق) سے گزرے ہیں تو مسلمان مورخ کی آنکھوں کے سامنے اندلس (اسپین) کی تصویر کھنچ گئی، وطن پہنچ کر سب سے پہلے اس کی یاد میں آنسو گرائے اور اسپین پر ایک پُر درد مضمون لکھا جو اس زمانہ میں بہت مقبول ہوا تھا۔

بظاہر وہ صرف ایک ناولسٹ یا افسانہ نگار تھے اور اسی حیثیت سے لوگ ان کو زیادہ تر جانتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ عربی علم وادب، محاضرات وتاریخ کے بھی ماہر تھے، ان کے مضامین کا بڑا ماخذ آغانی کی ضخیم جلدیں ہوتی تھیں اور وہ ان کو نہایت پسند تھیں، وہ روایتوں میں تنقید اور جانچ پڑتال نہیں کیا کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کو اپنے موضوع کے لحاظ سے اس کی ضرورت بھی نہ تھی، ان کی تصنیفات میں منصور موہنا، درگیش نندنی، فتح اسپین، مقدس نازنین، ملک العزیز ورجنا، فردوس بریں، اور فلورا فلورنڈا مشہور ناول ہیں، تاریخوں میں تاریخ سندھ اور تاریخ سسلی اور سوانح عمریوں میں خاتم المرسلین، ابوبکر شبلی، جنید بغدادی ان کی مشہور تالیفات ہیں، مرحوم گو شاعر تھے، شرر تخلص تھا مگر غیر مقفی اشعار کے نمونوں کے علاوہ آغازِ شباب کے بعد کبھی انہوں نے اپنا کوئی کلام شائع نہیں کیا، ان کا آخری علمی کارنامہ تاریخ اسلام ہے۔ جس کو وہ جامعہ عثمانیہ کی فرمائش سے لکھ رہے تھے اور کچھ حصے اس کے لکھ بھی چکے تھے۔

مرحوم اخلاق کے لحاظ سے باوضع، خاکسار، پابند اوقات اور ملنسار تھے، چھوٹوں سے ملنے میں اُن کی عزت اور تعظیم اور ان کے کارناموں کی قدر شناسی میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے تھے، چوک میں منشی نثار حسین صاحب اڈیٹر پیامِ یار اور خواجہ عشرت کی دُکان پر ان کی شام کی نشست ان کی وضعداری کی دلیل تھی، ان کی کتابوں کی بڑی مانگ تھی اور تمام مطبع والے بے پوچھے گچھے ان کی کتابیں چھاپتے رہے، مگر انہوں نے کبھی کوئی بازپرس نہ کی، مرحوم رات کو جاگ کر

کام کرنے کے عادی تھے، چنانچہ وہ رات کا کھانا ایک بجے کھا کر سوتے تھے، ان کی موت نے ۱۸۵۷ء سے شروع ہونے والے عہدِ علمی کا خاتمہ کر دیا۔

"دل گداز" جو اُن کا خاص رسالہ تھا، جس میں وہ زیادہ تر تاریخی مضامین اور قصص شائع کیا کرتے تھے، اس کا آخری نمبر جو اُن کے قلم سے نکلا، وہ دسمبر ۱۹۲۶ء کا ہے، یہ "دلگداز" کی چھبیسویں جلد کا آخری نمبر ہے، لیکن اس کی اشاعت کا زمانہ چھبیس برس سے یقیناً زیادہ ہے، حیدرآباد کی اقامت کے زمانہ میں اس کی اشاعت میں ناغہ ہو جاتا تھا" دلگداز" کے علاوہ تین اور رسالے بھی اپنے نام سے نکالے ہیں، موجودہ پردہ کے خلاف پردۂ عصمت انہوں نے نکالا اب سے پہلے انہیں نے مسلمانوں میں ہندو مسلم اتحاد کی باقاعدہ تحریک کی اور اُس کے لئے اتحاد نکالا کچھ دنوں کے لئے تصوف کا بھی ایک رسالہ نکالا تھا، جس کا نام اس وقت یاد نہیں آتا، مہذب نام ایک اور صحیفہ نکالا تھا، بہر حال وہ جو کچھ تھے، ہماری زبان کے نامور مصنف، ہندوستان کا فخر اور لکھنؤ کی آبرو تھے، اُن کے فانی جسم نے مفارقت کی، مگر ان کی ابدی زندگی انشاء اللہ ہمیشہ قائم اور باقی رہے گی۔

جمادی الثانی ورجب ۱۳۴۵ھ

جنوری ۱۹۲۷ء

جنابِ شادؔ مرحوم عظیم آبادی

ابھی نثرِ اردو کے ماتم سے ہم فارغ نہیں ہوئے تھے کہ نظمِ اردو کے پرانے استادِ عظیم آباد کے مشہور باکمال شاعر میر علی محمد شادؔ کی موت کی خبر آئی، ۸؍ جنوری ۱۹۲۷ء کو غالباً ۸۲ برس کی عمر میں اپنے وطن عظیم آباد پٹنہ میں وفات پائی، ساٹھ برس سے زیادہ کی مشقِ سخن تھی، لاکھوں شعر ان کے نتائجِ فکر ہیں، میرؔ اور انیسؔ کے مقلد اور متبع تھے، اس دور میں وہ پورب میں زبانِ اردو کے تنہا استاد رہ گئے تھے، ہم وطنی کے باوجود کبھی ان کی ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوسکا، البتہ تحریری نیاز ایک مدت سے جاری تھا، کچھ دنوں سے ہوش و حواس بھی بجا نہ تھے، تاہم شعر برابر وردِ زبان تھا۔

آخر ہے عمر، ضیق ہیں، دل بھی ہے جان بھی

مردانہ باش! ختم ہے یہ امتحان بھی!!

مرحوم کی تصنیفات میں دیوان اور کلامِ منظوم کے علاوہ نوائے وطن وغیرہ نثر کی کتابیں بھی ہیں، مرحوم کا ایک طویل والانامہ بھی میرے پاس رکھا ہے، جس میں اپنی تصنیفات کی پوری کیفیت لکھی ہے، افسوس کہ ان کا پورا کلام کوششوں کے باوجود بھی یکجا ہوکر طبع نہ ہوسکا، جو کام کہ ان کی غایت احتیاط کی بنا پر ان کی زندگی میں نہ ہوسکا، شاید اب اُن کے مرنے کے بعد انجام کو پہنچ جائے، اپنے طرز کے وہ تنہا مالک تھے اور زمانہ کا رنگ دیکھ کر توقع نہیں کہ اس طرز کا نمونہ پھر پیدا ہوسکے۔

جمادی الثانی و رجب ۱۳۴۵ھ

جنوری ۱۹۲۷ء

شمس العلماء حافظ نذیر احمد کلکتہ

افسوس ہے کہ شمس العلماء حافظ نذیر احمد صاحب محقق آثار قدیمہ عجائب خانہ کلکتہ نے گزشتہ ماہ اس دار فانی کو الوداع کہا، مرحوم بنگال کے ان چند ممتاز اہل علم میں تھے جن پر اس صوبہ کو ناز تھا، معارف کے صفحات بھی اکثر ان کے مضامین سے زینت پاتے رہے ہیں، ہندوستان کے قلمی کتب خانوں اور نادر علمی جواہر کے گوشہ گوشہ سے ان کو واقفیت تھی اور ایشیاٹک سوسائٹی کی طرف سے کتابوں کی تلاش میں انہوں نے تمام ہندوستان کو چھان ڈالا تھا، چند سال سے عجائب خانہ کلکتہ میں آثار قدیمہ کی تحقیق کا کام ان کے سپرد ہوا تھا، افسوس کہ بنگال کا یہ نادر محقق اس عجائب خانہ عالم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

شوال ۱۳۴۵ھ

اپریل ۱۹۲۷ء

حضرت گرامی

ہندوستان کے کہنہ مشق اور فارسی کے مسلم الثبوت شاعر حضرت گرامی نے ۲۶ مئی ۱۹۲۷ء کو چند روزہ علالت کے بعد اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، مرحوم پنجاب کے ضلع جالندھر کے رہنے والے تھے، فارسی شاعری سے اُن کو فطری لگاؤ تھا، کچھ دنوں امرتسر کے ایک اسلامی مدرسہ میں معلم رہے، پھر اعلیٰ حضرت نظام سابق مرحوم کی قدر شناس نگاہ نے ان کو تاکا اور اپنے دربار کا فارسی شاعر مقرر کیا، اخیر عمر میں حیدرآباد سے جالندھر آ کر جب قیام کیا تو ان کی صحبت اور فیضِ اثر سے متعدد نوجوان اردو شاعر پیدا ہوئے، جن میں ابوالاثر حفیظ اور ساِلک کے نام سب سے اونچے ہیں، ڈاکٹر اقبال نے بھی جب سے فارسی میں کہنا شروع کیا، ان سے استفادہ میں دریغ نہیں کیا، زبان کے معاملہ میں وہ ان کی سند تھے، افسوس ہے کہ اب کشورِ ہند ایسے یگانہ نامور کے وجود سے خالی ہوگیا۔

مرحوم سے صرف ایک دفعہ آل انڈیا شعراء کانفرنس دہلی منعقدہ ۱۹۲۳ء میں ملاقات ہوئی تھی، بے حد ملنسار، متواضع اور مرنجان آدمی تھے، ایک سال پہلے تک ان کے اکثر خطوط میری عزت بڑھاتے رہتے تھے اور کبھی کبھی معارف کے صفحوں کو بھی اپنے نغموں سے معمور کیا کرتے تھے، مولانا شبلی مرحوم کے تعلق اور ان سے حیدرآباد کی یک جائی اور شاعری کی ہم پیشگی کا اثر یہ تھا کہ وہ مولانا مرحوم کی اس یادگار کو بزرگانہ محبت کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے، افسوس کہ یہ فیض اب ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔

ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ

جون ۱۹۲۷ء

مولوی بشیرالدین احمد مرحوم

افسوس ہے کہ اردو کے ایک کہنہ مشق مصنف کی جسمانی یادگار مولوی بشیرالدین احمد خلف مولانا ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم نے بھی اپنی جگہ خالی کی، ۴ر اگست کی شب کو بعارضہ فالج دہلی میں وفات پائی، تاریخ بیجاپور، فرامین شاہی، عصائے پیری اور کئی تاریخی اور ادبی کتابوں کے وہ مصنف تھے اور اس عہد میں بسا غنیمت تھے۔

ربیع الاول ۱۳۴۶ھ

ستمبر ۱۹۲۷ء

مسیح الملک مرحوم

ہمارے شمسی سال کے خاتمہ کو تین راتیں باقی تھیں کہ نصف شب کو ہمارے ملک کا آفتاب غروب ہوگیا، مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی اچانک وفات درد دل سے ہوئی، ہائے یہی "درد دل" ان کی زندگی کا سرمایہ تھا اور یہی ان کی وفات کا بہانہ بن گیا، وہ جس کی مسیحائی سے لاکھوں نے زندگی پائی تھی، خود اس کی زندگی کسی کی مسیحائی کی ممنونِ احسان نہ بنی، حکیم صاحب کی وفات خاندان کا ماتم نہیں، دلّی کا ماتم نہیں، قوم کا ماتم ہے، فضل و کمال کا ماتم ہے، اخلاق و شرافت کا ماتم ہے، سنجیدگی و متانت کا ماتم ہے، عقل و رزانت کا ماتم ہے، فکر و اصابت کا ماتم ہے، آزادی و حریت کا ماتم ہے، اخلاق و ایثار کا ماتم ہے، ہندوستان اور مسلمانانِ ہند کے طالع و بخت کا ماتم ہے۔

مرثیہ ہے ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا

ہندوستان کا وہ کونسا شریف انسان ہے جس کی گردن اس شریف خانی یادگار کے شخصی یا قومی منت سے گراں بار نہیں، وہ کونسی قومی مجلس ہے جو اُن کے احسانات کے بوجھ سے دبی نہیں ہے، مسلمانوں کا وہ کونسا کام ہے جو اُن کی مشکل کشائی کا ممنون نہیں، علی گڑھ ہو کہ ندوہ، دیوبند ہو کہ جمعیۃ العلماء، مسلم لیگ ہو کہ کانگریس، خلافت ہو کہ طبّیہ کانفرنس، ہندوستانی دواخانہ ہو کہ طبیہ کالج سب اُن کے خوانِ منت کے برابر کے ریزہ چین تھے، جامعہ ملیہ یعنی قوم کے خوابِ حریت کی تعبیر حسی، اس کا وجود مستقل اگر تھا، تو صرف حکیم صاحب کے دستِ بازو سے۔

ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا ملک کا جو چراغ تھا، نہ رہا

حکیم صاحب کی وفات سے یوں تو ہر قومی درس گاہ اور ہر قومی مجلس، جو ان کی رائے و

مشورہ و اعانت و سفارش سے، یا ان کے بذل و عطا اور جود و کرم سے مستفید تھی، متاثر ہوئی، لیکن جامعہ ملیہ جس کی ہستی صرف اُن کی ذات سے قائم تھی اور جس کی امارت صرف اسی ایک ستون پر کھڑی تھی، وہ متزلزل ہو کر رہ گئی، یہ تسکین ہے کہ حکیم صاحب کی یادگار کے نام سے اس کو پکارا جا رہا ہے اور قوم میں ان کی اس یادگار کی بقا و قیام کا کافی احساس نظر آتا ہے، اگر اس یادگار کے لئے قوم میں عملاً بھی یہی سرگرمی قائم رہی تو اس قومی محسن اعظم کی موت جامعہ کی زندگی کا سبب بن جائے گی، ہمیں یقین ہے کہ منت پذیر قوم اور احساس شناس ملک اس علمی و تعلیمی یادگار کی مالی اعانت و امداد میں اپنے فرض کا پورا احساس کریگا۔

جامعہ کے کارکنوں نے اس یادگار کی بقا و قیام کے لئے ملک و قوم سے آٹھ لاکھ روپے کی اپیل کی ہے، ملک کے بڑے بڑے رہنماؤں نے اس اپیل کی تائید کی ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی مسابقت الی الخیر کا عملی ثبوت دیں، تاکہ جامعہ جو کم سے کم احسان اور دوں کا اٹھا سکتی ہے وہ اٹھائے، عنقریب جامعہ کی طرف سے مختلف وفود صوبوں میں دورہ کرنے کے لئے نکلیں گے، اس وقت ہر صوبہ کے مسلمانوں کو اس کار خیر اور صدقہ جاریہ میں شرکت کرنی چاہیے۔

مرحوم سے میری ملاقات ۱۹۱۰ء میں ندوہ کے جلسہ کی تقریب سے مولانا شبلی مرحوم کے ذریعے سے ہوئی، یہ تعلق قومی کاموں کے سلسلہ میں بڑھتا ہی گیا اور خلافت جمعیۃ العلماء اور کانگریس کی تحریکوں کے ساتھ عہد بہ عہد ترقی پذیر رہا، سیاسیات میں میرا شمار انہیں کی جماعت کے ساتھ ہمیشہ رہا۔

رجب ۱۳۴۶ھ

جنوری ۱۹۲۸ء

علامہ ابوالفضل عباسی، مولوی وحید الدین سلیم، سید امیر علی

ماہ رواں کے افسوس ناک علمی حادثوں میں دو مشہور نامور مسلمان مصنفین اور اہل قلم کی وفات ہے، ایک سید امیر علی بالقابہ اور دوسرے مولوی سید وحید الدین سلیم پانی پتی، اس سے پہلے چند ماہ ہوئے کہ ایک اور کہنہ مسلمان فاضل مصنف علامہ ابوالفضل عباسی چریا کوٹی وکیل گورکھپور کی وفات کی خبر ملی تھی ان بزرگوں کا یکے بعد دیگرے یوں رخصت ہوتے جانا علم اور قوم کی بدنصیبی ہے۔

علامہ ابوالفضل عباسی چریا کوٹی استاذنا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی کے شاگرد تھے اور ان چند مستثنیٰ علماء میں تھے، جنہوں نے اس عہد میں جب انگریزی کفر سمجھی جاتی تھی انگریزی تعلیم حاصل کی، چنانچہ علی گڑھ کالج کے ان طلبہ میں تھے، جو اُس کے سب سے کم دیرپا مشرقی شعبہ علوم میں داخل تھے، مرحوم وکالت کے ساتھ ہمیشہ مذہبی و تاریخی تالیف و تصنیف میں مصروف رہتے تھے، چنانچہ قرآن پاک کا اُردو ترجمہ الاسلام، تاریخ اسلام، انگریزی میں قانونِ محمدی کی بعض کتابیں، انتخاب دو دواوین، اور ایک دو اصلاحی افسانے یادگار چھوڑے، "الاسلام" اور "تاریخ اسلام" مرحوم کی بہترین تصنیفات ہیں، مرحوم کی عمر غالباً کم و بیش ستر ہوگی،

صفر ۱۳۴۷ھ

اگست ۱۹۲۸ء

مولوی وحید الدین سلیم

مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، عربی اور اردو کے ادیب تھے، وہ مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری کے شاگرد تھے، لاہور کے مشرقی شعبہ میں تعلیم پائی تھی اور وہیں سے تحریر و انشاء اور ترجمہ و تالیف کا شوق اپنے ساتھ لائے تھے، سنہ ۱۸۹۰ء کے بعد سے غالباً وہ سرسید مرحوم کے علمی مددگار مقرر ہوئے یعنی سرسید کی تصنیفات اور مضامین کیلئے عربی کتابوں سے معلومات فراہم کیا کرتے تھے، پھر معارف نام کا ایک علمی رسالہ انہوں نے علی گڑھ سے نکالا جس نے اہلِ علم میں بڑی عزت حاصل کی، چند سال نکل کر یہ بند ہو گیا، پھر سنہ ۱۹۰۴ء کے قرب میں وہ علی گڑھ گزٹ کے ایڈیٹر ہوئے اور بالآخر اُس سے بھی الگ ہو کر خانہ نشین ہو گئے، سنہ ۱۹۱۱ء میں جب لکھنؤ سے مسلم گزٹ نکلا جس نے مسلمانوں کی اس نئی سیاسی بیداری میں خاصہ حصہ لیا، تو مولانا شبلی مرحوم کے مشورہ سے وہی اس کے اڈیٹر مقرر ہوئے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے بڑی خوبی سے اس فرض کو انجام دیا، مسلم گزٹ کے بند ہونے کے بعد وہ پھر خانہ نشین ہو گئے اور آخر غالباً سنہ ۱۹۱۶ء میں یا اس کے گرد و پیش زمانہ میں وہ حیدرآباد گئے اور جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اسی منصب پر اس مہینہ میں انہوں نے بلیح آباد (ضلع لکھنؤ) میں وفات پائی، مرحوم کی عمر ستر سال کے قریب ہوگی۔

مرحوم نے چھوٹے بڑے مضامین بے شمار لکھے، اُن کی خاص خصوصیت زود نویسی تھی، وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے اور بڑے بڑے ہفتہ وار اخبار کو ایک رات میں بیٹھ کر پورا کر لیتے تھے اور ان کی کوئی مستقل تصنیف، "وضعِ اصطلاحات علمیہ" کے سوا دوسری نہیں،

نئے الفاظ کے تراشنے اور وضع کرنے میں ان کو پوری مہارت تھی، علی گڑھ گزٹ اور مسلم گزٹ کی اڈیٹری کے زمانہ میں بہت سے اردو الفاظ وضع کر کے انہوں نے پھیلائے ہیں، منجملہ اُن کے ایک لفظ "نمائندہ" جو آج اس قدر کثیر الاستعمال ہے، انہیں نے اس لفظ کو جدید فارسی اخبارات سے لے کر اردو میں علی گڑھ گزٹ کے ذریعہ سے رائج کیا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا،

صفر ۱۳۴۷ھ

اگست ۱۹۲۸ء

جسٹس سیّد امیر علی مرحوم

سید امیر علی مرحوم تمام تر جدید تعلیم کے پیداوار تھے، مگر انہوں نے بزرگوں کے سُنے سنائے معلومات اور ذاتی کدوکاوش سے یورپ میں اسلام کی بڑی خدمت کی، وہ یورپ میں تمام اسلامی کاموں اور تحریکوں کے رکن رکین سمجھے جاتے تھے ان کے مذہبی اور سیاسی خیالات سے گو ہم موافقت نہ کر سکیں، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے قلم کی ضوافشانی سے اسلام کے متعلق یورپ کے بہت سے خیالات باطلہ کے بادل پھٹ گئے، ان کی دو کتابیں اسپرٹ آف اسلام اور ہسٹری آف سارسنیس ہمیشہ یادگار رہیں گی، ان دونوں کتابوں کے ترجمے اکثر اسلامی زبانوں میں موجود ہیں، حتی کہ عربی میں بھی ہو چکے ہیں، ۷۹ سال کی عمر میں اس جہان فانی کو الوداع کہا، مرحوم سے ۱۹۲۰ء میں کئی دفعہ لندن میں ملنے کا موقعہ ملا تھا، رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

صفر ۱۳۴۷ھ

اگست ۱۹۲۸ء

مولانا حکیم برکات احمد صاحب بہاری ٹونکی

پچھلے مہینہ ایک اور فاضل زمانہ نے اپنی جگہ خالی کر دی، یکم ربیع الاول ۱۳۴۷ھ کو استاد الوقت مولانا حکیم برکات احمد صاحب بہاری ٹونکی نے وفات پائی، مرحوم اس عہد کے ان یگانہ اساتذہ میں تھے، جن کے حلقۂ درس نے سینکڑوں کاملین فن پیدا کئے، جناب عبداللہ صاحب ٹونکی کی طرح مرحوم کا خاندان بھی بہار سے ٹونک جاکر آباد ہوا تھا، یہ پندرہ برس مولانا عبدالحق خیرآبادی کی صحبت میں رہ کر علوم عقلیہ وحکمیہ میں سرآمد روزگار بنے تھے، ساتھ ہی علم حدیث اور علوم دینیہ کا فیض قاضی محمد ایوب صاحب بھوپال سے حاصل کیا تھا، والی ٹونک انکی پوری قدردانی فرماتے تھے اور ان کو اپنی ریاست کا فخر سمجھتے تھے، دُور دُور سے طلبہ آکر ان کے حلقہ تعلیم میں شریک ہوتے تھے اور کامیاب ہوکر واپس جاتے تھے، افسوس کہ یہ سرچشمۂ فیض ہمیشہ کے لئے خشک ہوگیا، "رحمۃ اللہ وبرکاتہ" (۱۳۴۷ھ) ۱۳۴۷ھ تاریخ وفات جس نے نکالی ہے اس پر بھی خدا کی رحمت، رحمۃ اللہ وبرکاتہ علیہ۔

مرحوم کی بعض فلسفیانہ تصنیفات شائع ہوئی ہیں، مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں۔

انہار اربعہ تصوّف میں، القول الضابط فی تحقیق الوجود الرابط، اتمام الکلام فی تحقیق الاجسام، فلسفہ میں، حاشیہ برحاشیہ خیرآبادی، برحاشیہ شرح مواقف کلام میں، حاشیہ برجامع ترمذی، حدیث میں، مرحوم نہ صرف اپنے علم وفضل میں، بلکہ اپنے محاسنِ اخلاق میں بھی پرانے بزرگوں کی شان رکھتے تھے، کتب بینی کا یہ عالم تھا کہ وہ رات بھی جس میں اُن کی وفات ہوئی مطالعہ سے ناغہ نہ گئی، نوجوان دنیا ان بوڑھے بزرگوں کی مثال پیدا نہ کرسکے گی۔

ربیع الاوّل ۱۳۴۷ھ

ستمبر ۱۹۲۸ء

مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ

یہ مہینہ بھی آہ و ماتم کی صدا سے خالی نہیں، شکر کا مقام تھا کہ اب تک دیوبند میں اکابر کے صحبت یافتہ اور اکابر کی زندہ یادگاریں موجود تھیں، مگر افسوس کہ یہ بھی یکے بعد دیگرے ہم سے رخصت ہو رہی ہیں، مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ عالیہ دیوبند خلف الصدق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ گزشتہ مہینہ حیدر آباد میں سپرد خاک ہوئے اور اب اس مہینہ ۱۸ ر جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ کو دائرہ قاسمیہ کے مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب نے ۷۲ برس کی عمر میں دیوبند میں بمرض فالج انتقال کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مرحوم نے مولانا مملوک العلی صاحب اور مولانا فضل رحمان صاحب گنج مراد آبادی، اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے ظاہر و باطن کا فیض اٹھایا تھا، کم سخن، متین، حلیم اور سادہ مزاج تھے، تقویٰ اور دینداری، ان کے چہرۂ کمال کا خط و خال تھی، حدیث کی درس و تدریس کے ساتھ کتب فقہ کی جزئیات پر ان کی وسعت نظر بدرجۂ اتم تھی، فتاویٰ کے جوابات مختصر لیکن قلّ و دلّ دیتے تھے اور بیالیس برس تک اس خدمت کو انجام دیا۔ ایسے متقی اور محتاط فقیہ اور محدث آئندہ کہاں پیدا ہوں گے۔

زمانہ کا رنگ پلٹ رہا ہے، انقلاب کی لہریں دیواروں تک پہنچ گئی ہیں، جن کے بسنے والے زمانہ کے اس سیلاب سے اپنے گوشۂ عافیت کو محفوظ سمجھتے تھے، علماء کے خیالات بھی بدل رہے ہیں، اختلاط، میل جول اور مبادلہ آرا سے ان کے نقطۂ نظر میں بھی فرق آ رہا ہے، یہ زمانہ

علمائے اسلام کے لئے حد درجہ نازک ہے، ایک طرف تو تقویٰ، دینداری، اسلام کی اصلی رُوح کی حفاظت اور دوسری طرف نئے نئے مسئلے، نئے نئے فتوے اور نئے نئے سوال سامنے آرہے ہیں، مغربی تمدنی قوانین اور اسلامی فقہ اور احکام کے درمیان تطبیق، اگر ممکن ہو اور قانون اسلامی کی ترجیح، اگر تطبیق نا ممکن ہو حد درجہ نازک، لیکن ساتھ ہی حد درجہ ضروری کام ہے، خوشی ہوتی اگر مرحوم اور ان کے رفتار کے زمانہ کے لوگ اس کام کو کر جاتے کہ آئندہ ایسے وسیع النظر علماء کا پیدا ہونا تو ممکن ہے، مگر دنیا کا رنگ دیکھتے ہوئے ایسے محتاط، متقی اور دیندار علماء کے پیدا ہونے کی توقع کم ہے۔

جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ

دسمبر ۱۹۲۸ء

شیخ عبدالعزیز شاویش

افسوس ہے کہ اس مہینہ شیخ عبدالعزیز شاویش نے مصر میں وفات پائی، یہ مفتی محمد عبدہ کے شاگردوں میں تھا ور طبعاً نہایت پُرجوش تھے، نوجوان ترکوں کی انجمن اتحادوترقی کے زمانہ میں یہ اس کے سرگرم حامی تھے، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ یہ اُس کی مذہبی رُوح تھے، انور پاشا مرحوم کے دست وبازو تھے، بلقان کے بعد انہوں نے قسطنطنیہ سے الھدایہ نام ایک علمی، مذہبی، اصلاحی رسالہ عربی میں نکالا تھا، جنگ عظیم میں یہ اتحادیوں کے خلاف عرب میں جہاد کے واعظ اور مبلغ تھے ترکی کے موجودہ انقلاب میں بھی شریک ہوئے اور چاہتے تھے کہ اس انقلاب کے ہاتھ سے معتدل مذہبی اصلاحات اور اتحادِ اسلامی کا سررشتہ نہ چھوٹے، اس لئے انگورہ میں دنیائے اسلام کی ایک علمی وادبی انجمن بنائی، جس کے کتب خانہ میں تمام اسلامی زبانوں کی کتابیں جمع کی جائیں تاکہ ایک نظر میں تمام اسلامی دنیا کی مختلف دماغی سطح معلوم ہوجائے اور اتحادِ اسلامی کی مجسّم شکل سامنے آجائے، مگر مصطفیٰ کمال پاشا کی سُرعتِ رفتار کا وہ ساتھ نہ دے سکے، ناچار مصطفیٰ کمال نے جب خلافت کی قبا اُتار پھینکی اور اپنے کو جیسے وہ تھے سب کے سامنے ظاہر کردیا، تو شیخ نے انگورہ چھوڑ کر مصر میں قدم رکھا اور سیاسیات سے یکسر تائب ہوکر اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلے، یعنی مصر کے تعلیمی محکمہ میں وہ ابتدائی تعلیم کے انسپکٹر مقرر ہوگئے۔

اس خدمت کے ساتھ ساتھ انہوں نے چند ہی سال کے اندر مصری طلبہ کو خطرناک قومیت کے جذبات سے بچانے کا کام اصلاحی حیثیت سے شروع کردیا، پہلے ان کے

لئے مکارم الاخلاق کے نام سے ایک انجمن قائم کی، جس نے اپنے چند ہی اجلاسوں میں طلبہ کو مغربی اخلاق وتمدن کی پیروی سے ہٹا کر اسلامی اخلاق وتمدن کی طرف یک گونہ متوجہ کرنا شروع کر دیا، پھر اس کے بعد نوجوان مسلمانوں کی انجمن ینگ کرسچن مینس ایسوسی ایشن کی طرز پر انجمن شبان المسلمین قائم کی اور طلبہ میں اسلامیت کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی، یہ کام ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ موت نے ان کو ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا کر دیا، درحقیقت ان عام حالات کی بنا پر جن کے سیلاب میں مصر بہتا جاتا ہے، مرحوم کا وجود بہت مفید ہو رہا تھا، امید ہے کہ مرحوم کے رفقا ان کاموں کو ان کے بعد بھی باقی رکھیں گے۔

شعبان ۱۳۴۷ھ

فروری ۱۹۲۹ء

مولانا حبیبُ الرحمٰن عثمانی

اس مہینہ کا سب سے بڑا علمی اور تعلیمی حادثہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا حبیبُ الرحمان عثمانی کی وفات ہے، دیوبند کا مدرسۂ عالیہ اگر ہمارے پرانے مذہبی مدارس کی رُوح ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس مدرسہ عالیہ کی روح حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب عثمانی تھے، مرحوم شاید اس مدرسہ کے مقدس بانیوں کی آخری یادگار تھے، وہ ایک مشہور عالم متبحر، اور عربی کے ادیب تھے، دیگر علوم کے علاوہ عربی نظم و نثر پر ان کو یکساں قدرت حاصل تھی، اسلامی تاریخ سے بھی ان کو ذوقِ کامل تھا، اُردو انشا میں اُن کا سلیقہ خاصہ تھا۔ رسالہ القاسم ان کی علمی کوششوں کی پوری تاریخ ہے، اُن کی اُردو تصانیف میں "اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی" ایک ضخیم کتاب ہے، ان سب کے ساتھ جس چیز میں وہ اپنی جماعت میں سب سے زیادہ ممتاز تھے، وہ اُن کا تدبر، حُسنِ سیاست اور نظم و نسق کی قوت تھی، انہوں نے ۱۳۲۵ھ سے ۱۳۴۸ھ تک جب تک ان کی جان میں جان رہی، مدرسہ دیوبند کے اہتمام اور نظم و نسق کی خدمت انجام دی۔

اُن کی محنت، جان کاہی اور مسلسل خدمات کے ساتھ ساتھ اگر اُن کی جسمانی نحافت کمزوری اور دائم المرضی کو دیکھا جائے تو تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر وہ اس بارگراں کو اٹھائے ہوئے ہیں، ان سب سے مافوق اُن کا اخلاص، تقویٰ، تواضع اور ہر ایک سے حُسنِ خلق کا برتاؤ تھا، راقم الحروف کو مولانا سے سب سے پہلے اپنے ختم طالب العلمی کے بعد ہی دیوبند میں ۱۹۰۸ء میں ملنے کا اتفاق ہوا، اس وقت سے لے کر آخر تک

ان کا یکساں طریق محبت قائم رہا، سب سے آخری دفعہ اسی سال علی گڑھ میں اُن کی زیارت اُن کے ہم نام نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کے دولت کدہ پر ہوئی، دیکھا کہ ضعف ولاغری سے فضل وکمال کا یہ ماہِ درخشاں اب ہلال بن کر رہ گیا ہے، اب یہ ہلال بھی محاق ہو کر دنیا کی نگاہوں سے چھپ گیا ہے، اِنا للہ،

جمادی الثانی ۱۳۴۸ھ

دسمبر ۱۹۲۹ء

مولوی مظہر الحق صاحب پٹنہ

جس طرح ہمارا پرانا سال ایک بڑے قومی حادثہ یعنی پرانی تعلیم کے ایک بہترین نمونہ (مولانا حبیب الرحمان صاحب عثمانی دیوبندی) کے دائمی فقدان پر ختم ہوا، اسی طرح ہمارے نئے سال کا آغاز بھی ایک بڑے قومی حادثہ یعنی نئی تعلیم کے ایک بہترین نمونہ (مولوی مظہر الحق صاحب بیرسٹر پٹنہ) کی دائمی جدائی سے ہوا، مولوی مظہر الحق صاحب مرحوم کی قومی و سیاسی حیثیت تو الگ ہے، اُن کی اخلاقی اور علمی حیثیت بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں ہے، وہ فارسی سے واقف، عربی سے آشنا، انگریزی کے ادیب وخطیب اور فلسفہ کے نہایت دقیقہ رس طالبعلم تھے، اُن کے علمی کارناموں کا آغاز طوفانِ نوح کی بحث سے ہوا، اپنے پٹنہ اور وقت گورکھپوران کے ابتدائی علمی مباحث کے جولان گاہ تھے، ان کی سب سے آخری علمی تحریر غالباً وہ ہے جو ابھی ابھی پونہ سے شائع ہونے والی انگریزی کی کتاب تصوف وروحانیات پر مقدمہ ہے، وہ نسباً فاروقی تھے، اس لئے اُن کی اخلاقی قوت وجرأت کیا سلطنت اور کیا قوم دونوں کے مقابلہ میں برابر تھی، وہ جس کو حق سمجھتے تھے اُس کے اظہار میں نہ اُن کو سلطنت کی پروا ہوتی تھی اور نہ قوم کی، اُن کا یوروپین طرز و معاشرت کو الوداع کہہ کر دفعۃً مشرقی اور خالی مشرقی بن جانا ان کی بے مثال اخلاقی جرأت کا نمونہ ہے، مرحوم کی آخری عمر روح وروحانیت کی تحقیق میں صرف ہوئی، خدا اُن کی روح کو اپنی مغفرت کی لازوال دولت سے مالا مال کرے، کہ اب وہ وہاں پہنچ چکی ہے، جہاں کے کشفِ راز کے لئے وہ بے قرار تھی۔

رجب ۱۳۴۸ھ

جنوری ۱۹۳۰ء

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم جو مفلوج ہو کر دو سال پہلے سے خاموش ہو چکے تھے، اب وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے، علی گڑھ کالج نے قومی خدمت گاروں کی سب سے پہلی جو جماعت پیدا کی تھی، اس میں صاحبزادہ مرحوم سب سے پیش پیش تھے، وہ سر سید کی پالیسی کے سخت ترین مقلد تھے، وہ مسلمانوں کی سیاسی، علمی، تعلیمی، تجارتی، دینی، دنیاوی، غرض ہر قسم کی ترقی کا ذریعہ تعلیم کو سمجھتے تھے، یہی ان کا عقیدہ تھا، اسی عقیدہ پر وہ جئے اور اسی پر مرے، اُن کے قومی کاموں کا آغاز علی گڑھ کالج اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے ہوا اور اسی پر خاتمہ ہوا، وہ جس مسلک پر تھے اُس پر پوری مضبوطی سے قائم رہے، اُن میں مسلمانوں کی تعلیمی خدمت گزاری کا مخلصانہ ولولہ تھا اور مسلم یونیورسٹی کی خدمت کا پورا ارادہ رکھتے تھے، مگر افسوس کہ علی گڑھ کی مکدر فضا ان کی خدمات کو راس نہ آئی، اور یونیورسٹی کو اُن کی کوششوں سے کوئی فیض نہ پہنچ سکا، مرحوم کا دل پسند فلسفہ یہ تھا کہ مسلمان عبدیت اور نیابت الٰہی دونوں کے درمیان تطبیق دیں یعنی یہ کہ ایک طرف تو وہ خدا کے آگے سر جھکائیں اور اپنے کو اس کا لاچار بندہ سمجھیں، دوسری طرف خدا کی خلافت و نیابت سے سرفراز ہو کر عالم اور کل قوائے عالم پر اپنے علم کے زور سے حکمرانی کریں۔

مرحوم ۴، مئی ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے تھے، ۱۸۷۸ء میں علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے تھے، ۱۸۹۱ء میں بیرسٹری کی تعلیم کے لئے ولایت گئے، ۱۸۹۴ء میں کامیاب ہو کر واپس آئے اور علی گڑھ میں پریکٹس شروع کی اور ساتھ ہی کالج اور کانفرنس کی خدمت بھی، ۱۹۱۷ء میں انڈیا کونسل کے ممبر ہو کر انگلینڈ گئے اور ۱۹۲۴ء میں اس عہدہ سے مستعفی ہو کر

ہندوستان آئے، مرحوم کو درحقیقت انگلینڈ کی صحت بخش آب وہوا ہی نے کھالیا، وہاں کی آب وہوا اُن کو بالکل راس نہ آئی، واپسی کے بعد وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوگئے مگر ان کی ناتندرستی نے ان کو فرصت نہ دی، ۱۹۲۶ء میں اس عہدہ کی میعاد انتخاب کے خاتمہ پر جنوری ۱۹۲۷ء میں مسلم یونیورسٹی پر جو نوٹ لکھا وہ مرحوم کی زندگی کا آخری تحریری کارنامہ اور مسلم یونیورسٹی میں طبی شعبہ کا قیام ان کا اخیر علمی کارنامہ ہے، کیونکہ اس کے چند روز بعد جنوری ۱۹۲۷ء میں اُن پر فالج کا پہلا حملہ ہوا اور تین برس اسی امید وبیم کی حالت میں بسر کئے اور آخر ۱۸ جنوری ۱۹۳۰ء (شعبان ۱۳۴۸ھ) میں فالج کا دوسرا حملہ ہوا، جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکے، مرحوم مرنج ومرنجان، خوش اخلاق، متواضع اور خاکسار تھے، مگر اپنی رائے کے سختی سے پابند تھے، مسلمانوں کی ترقی کے اسباب وعلل ونتائج اور ذرائع ووسائل کے جو سبق انہوں نے سرسید مرحوم سے شروع میں پڑھے تھے، وہ آخر تک اُن کو یاد رہے، ایسے پختہ ایمان لوگ حقیقت میں قدر کے لائق ہیں اور بعض خاص حیثیات سے وہ اپنی قوم کی تعمیر کے لئے بے حد ضروری اجزا ہیں۔

مرحوم نے اپنے زمانہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کو بیحد ترقی دی، اس کو مالی حیثیت سے بہت حد تک مستغنی اور بے پروا کر دیا، اس کی علیحدہ عمارت بنوائی، اس میں تعلیمی کتب خانہ جمع کیا، جو گویا تعلیم، فلسفۂ تعلیم اور طریقۂ تعلیم کے بہترین ذخیرہ کا اعلیٰ ترین نمائش خانہ ہے، وظائف کے شعبہ کو ترقی دی، ریاستوں سے کانفرنس کے لئے ماہوار امدادی رقمیں مقرر کرائیں، مگر ان سب کے باوجود افسوس یہ ہے کہ ان کی زندگی کا ہر کارنامہ ناتمام سا رہا، خدا مغفرت فرمائے۔

شعبان ۱۳۴۸ھ

فروری ۱۹۳۰ء

مولانا عبدالحئی سہارنپوری

ہندوستان میں عربی علم وادب ولغت ومحاورات کے جو چند مخصوص ماہرین ہیں۔ ان میں ایک مولانا عبدالحئی صاحب سہارنپوری استاد جامعہ عثمانیہ بھی تھے، افسوس کہ انہوں نے ۲۷ رمضان ۱۳۴۷ھ کو بمقام حیدرآباد دکن، مرض طاعون میں مبتلا ہو کر وفات پائی، مرحوم کے دادا شیخ الحدیث مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری تھے، جو اپنے زمانہ میں علم حدیث کے مرجع کل تھے، ان کے صاحبزادہ اور مرحوم مولانا عبدالحئی صاحب کے والد مولانا عبدالرحمان صاحب ادب عربی کے نامور عالم اور عربی کے شاعر تھے، انہوں نے اندلس کی تباہی کے مشہور مرثیہ کی بحر وقافیہ میں مولانا حالی مرحوم کے اشارہ سے ہندوستان کی تباہی کا بہت پُر درد مرثیہ لکھا تھا، مولانا عبدالحئی مرحوم کی پینتالیس اور پچاس کے درمیان تھی، عربی کے شاعر اور عربی ادب وامثال اور محاورات کے بڑے عالم تھے اور سرکار نظام کی اعانت سے وہ عربی محاورات کا ایک ضخیم لغت فراہم کر رہے تھے، افسوس کہ یہ عظیم الشان کارنامہ بھی اُن کی موت سے ناتمام رہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

میری اُن کی ملاقات دارالعلوم ندوہ میں ۱۹۰۶ء میں ہوئی تھی، جہاں آکر وہ بعض فنون کی تکمیل اور جھوائی ٹولہ میں طب کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ دارالعلوم کا عجیب زمانہ تھا، مولانا شبلی مرحوم زندہ تھے، مولانا حمیدالدین صاحب اور مولانا ابوالکلام صاحب کئی کئی مہینے آکر مولانا مرحوم کے پاس رہتے تھے اور ہر وقت علمی چہل پہل اور علم وادب کی گفتگو رہتی تھی، اس صحبت میں مرحوم بھی شریک رہتے تھے۔

اُن کے والد حیدرآباد میں مطب کرتے تھے، اس تعلق سے حیدرآباد جاکر رہے اور جامعہ عثمانیہ میں استاد مقرر ہوئے، ساتھ ہی ولی عہد بہادر نواب معظم جاہ بہادر (ہزہائنس پرنس آف برار) کی استادی و اتالیقی کے منصب پر بھی سرفراز ہوئے، آخر میں اُن کی رُوحانی بے تابی نے حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف متوجہ کیا، مرید ہوئے اور اجازت پائی، مولانا ان کی دعوت پر ایک دفعہ حیدرآباد بھی تشریف لے گئے، آخر میں قرآن پاک بھی حفظ کرلیا تھا، رمضان کے دن تھے، رات کو تراویح پڑھاتے تھے، اسی حال میں بیمار ہوئے اور صبر وشکر کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے۔

رمضان المبارک ۱۳۴۸ھ

مارچ ۱۹۳۰ء

ڈاکٹر قاسم علی منصوری

مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ کیمیا کے نوجوان لائق صدر ڈاکٹر قاسم علی منصوری ایم، اے، ایم، ایس، سی (کینٹب) پی، ایچ، ڈی، (گوٹنجن) جو ہماری قوم میں اس فن کے مستند ماہر اور یورپ کے درسگاہوں کی متعدد سندوں کے مالک تھے، ۱۰ر مارچ ۱۹۳۰ء کی صبح کو کسی بیماری میں دل کی حرکت بند ہو جانے سے وفات پا گئے، مرحوم کے دل کا یہ عارضہ کیمیائی تجربہ گاہ کے بعض خاص قسم کے گیس کے اثر سے شروع ہوا تھا، جس سے وہ بالآخر نجات نہ پا سکے، اس طرح ہم ان کو شہیدِ علم کا درجہ دے سکتے ہیں، مرحوم کی اس غیر متوقع وفات سے ہمارے ملک کے حلقۂ علم و فن کو بڑا صدمہ پہنچا، خدا مغفرت فرمائے۔

شوال ۱۳۴۸ھ

اپریل ۱۹۳۰ء

والیۂ بھوپال سُلطان جہاں بیگم

خادمۂ ملّت و مخدومۂ اُمّت کا ماتم

علیا حضرت سلطانِ جہاں بیگم، سابق فرماں روائے کشور بھوپال جن کے نام نامی کے ساتھ ہمیشہ قلم کو یہ عادت رہی کہ خلد اللہ ملکھا (خدا ان کی حکومت کو ہمیشہ قائم رکھے) اب وہاں کو سِدھاریں جہاں کی حکومت واقعاً ہمیشہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مغفرت کی لازوال دولت اور اپنی رضا خوشنودی کی غیر فانی سلطنت عطا فرمائے۔

علیا حضرت کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے، جس کا ماتم نہ صرف بھوپال، نہ صرف ہندوستان، نہ صرف مسلمان، بلکہ تمام دنیا کر رہی ہے اور کرے گی۔ وہ نہ صرف اسلام کی بلکہ مشرق کی وہ آخری تاجدار خاتون تھیں، جن کے کارناموں پر مرد سلاطین اور امراء بھی رشک کر سکتے ہیں، اُن کا دورِ حکومت جو تیس سال سے کم نہیں رہا بھوپال کی تاریخ کا زریں عہد ہے،

سُلطانہ مرحومہ مشرقی و مغربی تعلیم و تمدن کا ایسا مجمع البحرین تھیں جو آج مصلحین امّت کا آئیڈیل ہے، اُن کی مشرقی تعلیم پوری اور مغربی واقفیت بقدرِ ضرورت تھی، وہ نہ صرف فرماں روا تھیں بلکہ ہندوستانی خواتین کی رہنما، مسلمانوں کی واحد یونیورسٹی کی رئیسہ علیا مذہبی تعلیم کی سب سے بڑی حامی، مذہبی علوم و فنون کی سب سے بڑی سرپرست، ہندوستان کی معتدل نسوانی اصلاحات کی سب سے بڑی مبلغ، مسلمان عورتوں میں سب سے بڑی کثیر التصانیف اور سب سے بہتر مقررہ، لیکن ان ہر قسم کے انتظامی، اصلاحی، ملکی، علمی اور تعلیمی کارناموں سے بڑھ کر اُن کا حقیقی شرف اُن کی مذہبی گرویدگی، دینی عقیدت اور ایمانی

جوش و ولولہ تھا۔

وہ ہر قومی، مذہبی، و علمی تحریک پر سب سے پہلے لبیک کہتی تھیں اور اس کے لئے عملی قدم اٹھاتی تھیں، مسلم یونیورسٹی، مدرسۂ دیوبند، دارالعلوم ندوہ اور ووکنگ مشن چھوٹے بڑے بیسیوں تعلیمی و مذہبی ادارے ان کی امداد و اعانت کے طوقِ منت سے گرانبار ہیں، دارالمصنفین اور سیرۃ نبوی کو کہا جائے کہ انہیں کے دستِ کرم سے ان کی بنیاد پڑی، خصوصاً "سیرۃ النبی" جیسی اہم کتاب کا عالمِ وجود میں آنے کا شرف صرف اُن کی ذاتِ گرامی کے لئے مخصوص ہے، امید ہے کہ تنہا ان کی یہی نیکی شفاعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے استحقاق کیلئے کافی ہوگی۔

سلطانہ مرحومہ کی ہستی میں رعب و شفقت کی عجیب آمیزش تھی اور ان کے اخلاق میں عجیب کشش تھی۔ ان کا دربار حد درجہ سادہ ہوتا تھا، دربار کے آداب بھی تمام تر شرعی تھے، پردہ کے پیچھے وہ تشریف رکھتی تھیں، کورنش و تسلیمات در کوع و سجود کا وہاں دخل نہ تھا۔ سب سے پہلے السلام علیکم کی بلند آواز ان کی طرف سے آتی تھی، شاید ہی کوئی ان سے ملا ہو اور ان کے اخلاق و معلومات کی وسعت سے متاثر نہ ہوا ہو، علامہ شبلی مرحوم غالباً ۱۹۰۶ء میں ان سے ملے، تو ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے جذبات الندوہ کے چند صفحات میں ظاہر کئے، مجھے دو تین مرتبہ اُن کے حضور میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ مگر ہر دفعہ دیر تک وہ اس اخلاق سے مصروف کلام رہیں کہ مخاطب یہ بھول جاتا تھا کہ وہ کسی خود مختار فرماں روا سے باتیں کر رہا ہے۔

ان کو تصنیف و تالیف کا شوق تھا اور اس کے لئے ایک خاص محکمہ تھا، اس سلسلہ میں ان کے مسودات بارہا دیکھنے، اُن کے برمحل اعتراض اور با موقع سوجھ حیرت انگیز تھی، اپنی تصنیفات کے مسودوں پر وہ خود نظرِ ثانی کرتی تھیں اور اپنے قلم سے اُن پر نشان بناتی تھیں۔

اُن کو رسولِ پاک علیہ الصلوٰۃ سے بے مثال عقیدت تھی، جس کی کھلی دلیل خود سیرتِ نبویؐ کا وجود ہے، مگر اس کے علاوہ ان کی گفتگو تحریر، تقریر، ہر چیز سے اُن کا یہ جذبہ ظاہر

ہوتا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں سیرۃ کی پہلی جلد لے کر جب اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، تو بڑے اشتیاق سے انہوں نے دریافت کیا تھا کہ عالم رویا میں رسول انام علیہ السّلام کی زیارت کس طرح ہوسکتی ہے، عرض کی کتب حدیث و سیرۃ کے مطالعہ اور درود وسلام کی کثرت سے۔

سُلطانہ! تو آج سب سے بڑے سُلطان کے دربار میں حاضر ہے، تیری ایک ایک نیکیاں انشاء اللہ اس دربار میں سفارشی ہوں گی، قبول و مغفرت کا تاج تیرے سر پر ہوگا اور رضا و خوشنودی کے مروارید تیرے گلے میں، سُلطانہ، اب زمانہ ہزاروں کروٹیں بدلے گا، مگر تجھ کو نہ پائے گا، تاہم تیری زندہ جاوید نیکیاں تجھ کو تاابد زندہ رکھیں گی۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام تو

ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ
مئی ۱۹۳۰ء

پروفیسر آرنلڈ

پچھلے مہینہ کے علمی سوانح میں دو فاضلوں کی وفات کے سانحے خاص طور سے اہم ہیں، ان میں سے ایک مغرب نژاد اور دوسرا مشرقی تھا، پہلے کو ہندوستان اور ہندوستان کے مسلمان پروفیسر آرنلڈ کے نام سے جانتے ہیں، یہ فلسفہ کے عالم ہونے کے ساتھ عربی اور اسلامیات کے بھی ماہر تھے، وہ ہندوستان میں محمڈن کالج علی گڑھ کے پروفیسر ہو کر آئے اور یہیں ان کی شہرت کا ستارہ چمکا، یہاں دس برس رہنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر ہوئے، ڈاکٹر اقبالؔ نے ان کی شاگردی یہیں کی، اُن کی خاص خصوصیت علم کے ساتھ ان کا حسن اخلاق تھا، وہ مشرقی علماء کے ساتھ ہمیشہ گھل مل کر رہتے اور لاہور ہو یا علی گڑھ ہر جگہ انہوں نے اپنے رفیق علماء سے کچھ سیکھا، اور ان کو کچھ سکھایا اور خصوصیت کے ساتھ علی گڑھ میں مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے ساتھ اور لاہور میں قاضی ظفرالدین صاحب مرحوم کے ساتھ اُن کے دوستانہ اور علمی تعلقات رہے اور ان واقعات کا نتیجہ علی گڑھ میں اُن کی مشہور تصنیف "دعوتِ اسلام" اور لاہور میں "السنواد السبیل الی معرفۃ الدخیل" ہے۔

مولانا شبلی مرحوم اور ان میں تعلقات ٹھیک استاد اور شاگرد کے تھے، مگر یہ فیصلہ مشکل ہے کہ ان میں استاد کون اور شاگرد کون تھا، مولانا نے اُن سے کچھ فرنچ سیکھی تھی اور انہوں نے اُن سے عربی، مولانائے مرحوم کے سفر ترکی میں سمرنا تک وہی رفیق سفر تھے، مولانا نے اپنے سفرنامہ میں اس کا حال لکھا ہے، بعز روم والے فارسی قصیدہ میں لکھتے ہیں۔

آرنلڈ آں کہ رفیق است وہم استاد مرا

استاد کے استاد سے ۱۹۲۰ء میں لندن میں میری ملاقات ہوئی تھی، وہ اس وقت انڈیا آفس سے متعلق تھے، مولانا مرحوم کے تعلق کے سبب سے مجھ سے بڑی محبت سے پیش آتے، اکثر وہ میرے پاس اور میں ان کے پاس انڈیا آفس میں آیا جایا کرتے اور گھنٹوں وہ اپنی پرانی صحبتوں کا تذکرہ لطف و مسرت کے ساتھ کیا کرتے تھے، میں نے دیکھا کہ علی گڑھ کی صحبتوں کے پرانے نقوش ان کی لوح دل پر ہنوز باقی تھے۔

اسی زمانہ میں وہ انڈیا آفس سے نکل کر اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز لندن میں چلے آئے تھے او اس تعلق سے ہندوستان کے مسلمان طلبہ جو اس اسکول میں جاتے تھے، ان کے ذریعہ سے نامہ و پیام بھی باہم قائم تھا، ابھی اُن کے ایک شاگرد کا خط آیا تھا کہ وہ دعوتِ اسلام (پریچنگ آف اسلام) کا دوسرا اڈیشن کثیر اضافوں کے ساتھ چھپوانا چاہتے ہیں، ہندوستان کے متعلق تم سے کیا مدد مل سکتی ہے، میں نے مذاقاً جواب دیا تھا کہ جب ڈاکٹر صاحب خود لکھیں گے تو اس شرط کیساتھ میں مدد دوں گا کہ طبع اول کے دیباچہ میں جہاں مولانا شبلی مرحوم کی امداد کا شکریہ ہے وہاں طبع ثانی کے حاشیہ پر میرا ذکر خیر بھی کردیا جائے کہ میں بھی اس بزم عالی کے حاشیہ نشینوں میں شامل ہو سکوں مگر افسوس؎

ع آن قدح بشکست وآں ساقی نماند

ہندوستان سے جاکر ان کا سب سے بڑا علمی کام تو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی تالیف میں شرکت ہے کہ اس کے متعدد ایڈیٹروں میں سے ایک وہ بھی تھے اور سب سے آخری کام مسلمانوں کے فنِ مصوری کی تاریخ ہے، ابھی کچھ ہی مہینے ہوئے تھے کہ وہ مصر کی قومی یونیورسٹی میں لکچر دینے آئے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ اس میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ اور سلاطینِ ہند کے تمدنی کارناموں کی پوری تفصیل کریں گے۔ معلوم نہیں یہ کارنامہ کہاں تک پہنچا۔

آرنلڈ، علی گڑھ کالج میں دس برس رہے اور اس طرح رہے کہ اس وقت ان کو کامل مسلمان نہ سہی تو نیم مسلمان تو ضرور ہی ماننا پڑے گا، مسلمانوں کی صورت، مسلمانوں کی وضع،

مسلمانوں کا تمدن، مسلمانوں کے عالموں کی صحبت، ہر چیز مسلمان بنا تھی اور کہا جا سکتا ہے کہ آرنلڈ نے اپنے زمانہ کے کالج میں روح پیدا کر دی تھی کہ اس کی مثال کالج کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، فروری ۱۸۹۸ء میں جب انہوں نے دس برس کے بعد کالج چھوڑا تھا، اس وقت اُن کی الوداعی پارٹی کے موقع پر مولانا شبلی مرحوم نے یہ دو شعر موزوں کر کے پڑھے تھے۔

آرنلڈ آں کہ درین شہر و دریا آمد و رفت
دلبرے بود کہ مارا بہ کنار آمد و رفت
آمد از آں گونہ بکالج کہ بہ گلزار نسیم
رفت زانساں کہ تو گوئی کہ بہار آمد و رفت

یہی دو شعر اس وقت اُن کی دائمی وداع کے موقع پر پڑھے جا سکتے ہیں۔

صفر ۱۳۴۹ھ

جولائی ۱۹۳۰ء

قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری

وہ مشرقی فاضل جس کی موت پر آج ہم کو ماتم کرنا ہے وہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری سابق جج پٹیالہ اور سیرت کی مشہور کتاب "رحمۃ للعالمین" کے مصنف ہیں، وہ علم و عمل، زہد و کمال اور فضل و ورع دونوں کے جامع تھے، روشن دل اور دماغ تھے، اُن کے جدید و قدیم دونوں خیالات حد اعتدال پر تھے، عربی زبان اور علوم دین کے متبحر عالم تھے، توراۃ و انجیل پر فاضلانہ و ناقدانہ نگاہ رکھتے تھے، غیر مسلموں سے مناظرہ کے شائق تھے، مگر ان کے مناظرہ کا طرز سنجیدگی، متانت اور عالمانہ وقار کے ساتھ تھا، مسلکاً اہل حدیث تھے، مگر اماموں اور مجتہدوں کی دل سے عزت اور ان کی محنتوں اور جانفشانیوں کی پوری قدر کرتے تھے۔

وہ ندوۃ العلماء کے دیرینہ رکن تھے اور اسی وساطت سے اُن سے تعارف حاصل ہوا، اور تعارف نے باہم انس و مودت کی صورت پیدا کی، جب مل جاتے دیر تک ہم ذوقی کا لطف قائم رہتا، سیرۃ، جدید مناظرات و کلام اور محاسنِ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو رہتی، اور اس لطف میں تھوڑی دیر کے لئے ہر چیز فراموش ہو جاتی، چند سال ہوئے کہ دارالمصنفین بھی اُن کے فیضِ قدوم سے منور ہوا تھا، بلند قامت، خوش رُو، خوش لباس، وجیہ، گھنی داڑھی، سپید صافہ باندھا کرتے تھے۔

اُن کی مستقل تصنیفات میں رحمۃ للعالمین، الجمال والکمال (تفسیر سورۂ یوسف) اور سفرنامۂ حجاز، یادگار ہیں، ان کے علاوہ چھوٹے بڑے بیسیوں رسائل ان کے قلم سے نکلے، مگر سب سے زیادہ "رحمۃ للعالمین" نے قبولیت حاصل کی، اسلامی مدرسوں میں داخل ہوئی، کورسوں

میں شامل ہوئی، لوگوں نے ذوق وشوق سے پڑھا، خدا رحمۃ للعالمین کے مصنف کو اپنی رحمتِ عالم سے نوازے۔

سات آٹھ برس ہوئے کہ وہ ایک دفعہ حج کر چکے تھے، واپس آکر انہوں نے اپنا سفرنامہ لکھا، دوسری دفعہ امسال حج کو گئے تھے، مکہ معظمہ سے ایک دوست کا خط آیا تھا کہ قاضی سلیمان صاحب امسال حج کو تشریف لائے ہیں اور اپنے "ہمنام" کا ذکر خیر بڑی محبت سے کرتے ہیں اور اس بشارت کی خوشی پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ صابر منزل قرول باغ دہلی سے ایک خط نے آکر اس کا خاتمہ کر دیا، اس میں لکھا تھا کہ قاضی صاحب نے بیمار ہو کر واپسی میں جہاز پر دم توڑا، آہ! اس بحر ہستی میں خدا جانے کتنے جہاز ڈوبے، اور ڈوبیں گے۔

درین بحر کشتی فرو شد ہزار
کہ پیدا نشد تختۂ بر کنار

صفر ۱۳۴۹ھ

جولائی ۱۹۳۰ء

سیّد جالب دہلوی

اس مہینہ اُردو صحافت کو اپنے ایک دیرینہ اہل قلم کی خدمات سے ہمیشہ کیلئے محرومی ہوئی، سید جالب دہلوی جو نہ صرف بحیثیت ایک کہنہ مشق اخبار نویس کے قابل ذکر ہیں بلکہ مرحوم علم کے ایک سچے طالب اور عاشق تھے، ان کی کہنہ مشقی، اخباری وسعت اطلاع، عام معلومات کی آگاہی، تاریخی ذوق، کتب نادرہ سے سچا عشق ان کی زندگی کی خصوصیات تھیں، ہر ہفتہ نخاس جاکر معمولی دوکانوں پر بیٹھ کر قلمی کتابوں کے منتشر و پراگندہ اوراق چن کر بقیمت اٹھالاتے تھے، گھر لاکر ان کی خدمت کرتے، ترک دیکھتے، ہندسے جوڑتے، عبارتیں ملاتے اور اوراق کو جوڑ کر کتاب کو درست کرتے، مرحوم نے کبھی فارغ البالی کی زندگی نہیں بسر کی، مگر اسی عالم میں انہوں نے لاہور، دہلی اور لکھنؤ کے بازاروں سے سات آٹھ ہزار کتابوں کا ذخیرہ فراہم کیا، جن میں بعض بعض بہت نادر کتابیں تھیں، اُن کا ارادہ تھا کہ ان کتابوں کے لئے وہ کوئی خاص مکان بنوائیں، یا کسی قومی درسگاہ کے حوالہ کردیں، خدا جانے مرحوم کی وفات کے بعد اُن پسماندوں کا کیا حشر ہوا،[1] مرحوم سا کہنہ مشق اخبار نویس اور اخبار نویسی کے ایک ایک فن کا واقف کار شاید ہی مسلمانوں میں کوئی دوسرا ہو، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، ان کا سب سے بڑا کمال اُن کا حافظہ تھا، جو ادنیٰ ادنیٰ چیزوں سے لے کر بڑے بڑے اشخاص سے متعلق معلومات ان کے خزانہ میں محفوظ رہتے تھے۔

سید جالب مرحوم پیسہ اخبار کے بعد غالباً سب سے پہلے ہمدرد میں ظاہر ہوئے، ہمدرد

---

[1] مرحوم کے وارثوں نے یہ کتابیں جامعہ ملیہ دہلی کو دیدی تھیں، میں نے انبار کی صورت میں کتب خانہ میں انکو دیکھا۔

کے بند ہونے پر لکھنؤ آکر ہمدم کی ادارت کا فرض انجام دیا اور ابھی دو سال ہوئے ہمدم سے علیحدگی کی صورت میں روزنامہ ہمت جاری کیا، سید جالب کا وجود اگر لکھنؤ میں نہ ہوتا تو بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اخباری حیثیت سے لکھنؤ کا کوئی وزن نہ ہوتا، سید جالب مرحوم کا قلم نہایت محتاط، مرنج و مرنجان اور طرزِ ادا نہایت صاف، سہل اور رواں تھا، اُن کی عام معلومات اس قدر وسیع تھیں کہ جس مسئلے پر کچھ لکھتے تھے اُس کے ہر پہلو کو نمایاں کر دیتے تھے، اُن کی خاص بات یہ تھی کہ سنہ ۲۰ء سے لے کر سنہ ۳۰ء تک ہندوستان کی سیاسیات میں لحہ بہ لحہ طوفانی انقلابات پیدا ہوتے رہے، نشیب و فراز، جوش و سکون ہر ایک دَور آیا اور گزر گیا، مگر اپنے محتاط اظہارِ خیال اور متین طریقۂ تعبیر کی وجہ سے وہ ہر ایک طوفان سے اپنی کشتی ہمیشہ سلامت لے گئے، ہمت گو اب بھی اسی طرح نکل رہا ہے، مگر اس صوبہ کے لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی قدر شناسی کا ثبوت دیں، مالی سرمایہ کے بغیر یہ کام چل نہیں سکتا، صرف ہمت سے ہمت کب تک نکلتا رہے گا۔

صفر سنہ ۱۳۴۹ھ

جولائی سنہ ۱۹۳۰ء

الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن

آہ! مولانا حمید الدّین!

الصّلوٰۃ علیٰ ترجمان القرآن (مفسّرِ قرآن کی نمازِ جنازہ) وہ صدا ہے جو آج سے ساڑھے چھ سو برس پیشتر مصر و شام سے چین کی دیواروں تک ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی نمازِ جنازہ کے لئے بلند ہوئی تھی، حق ہے کہ یہ صدا آج پھر بلند ہو اور کم از کم ہندوستان سے مصر و شام تک پھیل جائے کہ اس عہد کا ابن تیمیہ ۱۱ر نومبر ۱۹۳۰ء (۱۹ر جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ) کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا، وہ جس کے فضل و کمال کی مثال آئندہ بظاہر حال عالمِ اسلامی میں پیدا ہونے کی توقع نہیں، جس کی مشرقی و مغربی جامعیت عہدِ حاضر کا معجزہ تھی، عربی کا فاضلِ یگانہ اور انگریزی کا گریجویٹ، زہد و ورع کی تصویر، فضل و کمال کا مجسمہ، فارسی کا بلبلِ شیراز، عربی کا سوقِ عکاظ، ایک شخصیتِ مفرد، لیکن ایک جہانِ دانش! ایک دنیائے معرفت! ایک کائناتِ علم! ایک گوشہ نشین مجمعِ کمال، ایک بے نوا سلطانِ ہنر، علومِ ادبیہ کا یگانہ، علومِ عربیہ کا خزانہ، علومِ عقلیہ کا ناقد، علومِ دینیہ کا ماہر، علوم القرآن کا واقفِ اسرار، قرآن پاک کا دانائے رموز، دنیا کی دولت سے بے نیاز، اہلِ دنیا سے مستغنی، انسانوں کے ردّ و قبول اور عالم کی داد و تحسین سے بے پروا، گوشۂ علم کا معتکف، اور اپنی دنیا کا آپ بادشاہ، وہ ہستی جو تیس برس کامل قرآن پاک اور صرف قرآن پاک کے فہم و تدبر اور درس و تعلیم میں محو، ہر شے سے بے گانہ اور شغل سے ناآشنا تھی، افسوس کہ ان کا علم، اُن کے سینہ سے سفینہ میں بہت کم منتقل ہو سکا، مسودات کا دفتر چھوڑا ہے، مگر افسوس کہ اُس کے چھپنے اور ربط و نظام دینے کا دماغ اب کہاں، جو چند رسالے چھپے وہ عربی میں ہیں، جن کے عوام کیا، علماء تک ناقدرشناس ہیں، اُن کی زندگی ہمارے لئے

سرمایۂ اعتماد تھی اور ان کا وجود دارالمصنفین کے لئے سہارا تھا، افسوس کہ یہ اعتماد اور سہارا جاتا رہا اور صرف اسی کا اعتماد اور سہارا رہ گیا، جس کے سوا کسی کا اعتماد اور سہارا نہیں، اس سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ یہ ہستی آئی اور چلی گئی، لیکن دنیا ان کی قدر و منزلت کو نہ پہچان سکی اور ان کے فضل و کمال کی معرفت سے نا آشنا رہی۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

زندگی گمنامی میں گزاری، مرنے کے بعد بھی گم نامی کا گوشہ تلاش کیا، متھرا میں جہاں اپنے ایک ہموطن ڈاکٹر سے جو دس برس سے ان کے معالج خاص تھے، علاج کرانے تشریف لے گئے تھے وہیں انتقال فرمایا، عمر شریف سرسٹھ ۶۷ برس کے قریب تھی، مگر دائمی دردِ سر کی شکایت کے سوا قُویٰ بہت اچھے تھے۔

ہم گنہگار اُن کی مغفرت کی دعا کیا مانگیں کہ ان کے انفاس متبرکہ ہمہ تن یادِ خدا، صبر و رضا، شکر و تسلیم میں صرف ہوتے تھے، اُن کی نماز ہمہ تن لطف و محویت ہوتی تھی، ان کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا، اپنی زندگی ہی میں اپنی مغفرت کے کئی خواب دیکھے تھے۔

خداوندا! ہمیں توفیق دے کہ اُن کے نقشِ قدم پر چل کر ہم بھی تیری مغفرت کے سزاوار و مستحق ٹھہریں اور مرنے والے کو اپنی رضا و محبت کی بہشت عطا فرما کہ وہ اسی کا طالب تھا۔

اواخر عمر میں مرحوم کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ وہ چند مستعد طلبہ کو اپنے مذاق کے مطابق تیار کریں، چنانچہ کم از کم دو طالب العلموں کی خاص طور سے انہوں نے دماغی تربیت کی، ہم سب کی دعا ہے کہ وہ مدرسہ اصلاح المسلمین کو سنبھال لیں، جو مرحوم کی سب سے بڑی یادگار ہے، تفسیر کے اجزاء جو مکمل ہوں گے اُن کی اشاعت کی فکر کی جائے گی، مگر آہ! کہ اس ناقدر شناس دنیا میں ان جواہر ریزوں کی کون قدر کرے گا اور کون سرمایہ بہم پہنچائے گا۔

فغاں کہ گشت نیوشندۂ سخن خاموش — وگرچہ گونہ تسلی کنم من این لبِ گوش

اس سے پہلے ہندوستان کے جن اکابر علمار کا ماتم کیا گیا ہے، وہ کل وہ تھے جنکی ولادت اورنشو ونما انقلاب زمانہ سے پہلے ہوئی تھی، آج سب سے پہلی دفعہ ہم سے نئے عہد کے سب سے پہلے عالم کی وفات کے ماتم میں مصروف ہیں، ہم ایک ایسے گریجویٹ عالم کا ماتم کرتے ہیں، جو اپنے علم وفضل، زہد وورع اور اخلاق وفضائل میں سلف صالح کا نمونہ اورجدید علم وفنون کی اطلاع وواقفیت اور مقتضیاتِ زمانہ کے علم وفہم میں عہدحاضر کی سب سے بہتر مثال تھا، اس سے پہلے اُن تمام علمار نے جو نئے علم کلام کا اپنے کو بانی کہتے اور سمجھتے ہیں، جو کچھ کہا اور لکھا وہ دوسروں سے سُنی سنائی باتیں تھیں، لیکن اس جماعت میں یہ پہلی ہستی تھی جس نے فلسفۂ حال کے متعلق نفیاً یا اثباتاً جو کچھ کہا اور لکھا، وہ اپنی ذاتی تحقیق اور ذاتی علم ومطالعہ سے!

آج ہمارے سامنے ایسے متعدد علمار کی مثالیں ہیں جنہوں نے عربی علوم کی تکمیل کے بعد انگریزی تعلیم شروع کی اور بی،اے اور ایم،اے اور پی، ایچ، ڈی کی سندیں حاصل کیں، لیکن اس طرح کہ،

جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اُسے صاف دل سے بھلا دیا

نئے رنگ نے پُرانے رنگ کو اتنا پھیکا کر دیا کہ ان پر اس کا نشان بھی نظر نہیں آتا، لیکن آج ہم جس ہستی کا تذکرہ کر رہے ہیں، اس کا حال یہ تھا، کہ اس کے نئے رنگ کی شوخی سے اس کے پُرانے رنگ کا گہرا پن اور بڑھ گیا تھا اور اس کو دیکھ کر یہ سمجھنا بھی مشکل تھا کہ یہ علی گڑھ کالج اور الہ آباد یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کی سادگی کو دیکھ کر عوام بظاہر اس کو عالم بھی بمشکل ہی باور کر سکتے تھے، مگر وہ تھی جو ابنائے زمانہ میں کوئی نہیں۔

ولادت: اعظم گڑھ سے دو اسٹیشن پہلے پھریہا ایک گاؤں ہے، وہی مولانا کا پدری وطن تھا، اسی پھریہا کو عربی شکل دے کر مولانا اپنے نام کے ساتھ کبھی کبھی فراہی لکھا کرتے تھے، مولانا شبلی مرحوم اور مولانا حمیدالدین دونوں میرے پھپھیرے بھائی تھے، مولانا حمیدالدین کے والد مولوی عبدالکریم صاحب مولانا شبلی کے ماموں تھے، دونوں بھائیوں کی پیدائش چھ برس

آگے پیچھے ہوئی، مولانا شبلی ۱۲۷۵ھ، ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے اور مولانا حمید الدین صاحب ۱۲۸۰ھ، ۱۸۶۳ء میں، مولانا حمید الدین کے حقیقی چھوٹے بھائی شیخ حاجی رشید الدین صاحب ہیں، جو علی گڑھ کالج کے پُرانے تعلیمیافتوں میں ہیں اور سرسید کے عہد کے طالب العلم اُن سے اچھی طرح واقف ہیں۔

مولانا کا اصلی نام تو حمید الدین تھا، مگر وہ اس نام کو جو درحقیقت عربی قاعدہ سے لقب ہے اپنے لئے معنوی حیثیت سے بلند سمجھتے تھے، اس لئے وہ عربی تصانیف میں اپنا نام عبدالحمید لکھتے تھے اور تمام بڑے بڑے عالمانہ آداب والقاب کو چھوڑ کر صرف معلّم کہلانا اپنے لئے پسند فرماتے تھے، بنابریں وہ اپنا نام المعلم عبدالحمید الفراہی کتابوں کی لوحوں پر لکھا کرتے تھے۔

تعلیم: مولانا نے پہلے حفظ شروع کیا اور قرآن مجید کے حافظ ہوئے اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اسی ضلع کے ایک دیہات چتارا کے باشندہ مولوی مہدی حسین صاحب سے پڑھیں، اس زمانہ میں شرفا کی تعلیم کا فارسی ادب سب سے اہم جزو تھا، مولانا کو ادبیات سے فطری لگاؤ تھا، چنانچہ فارسی زبان اور فارسی ادب کا ذوق بچپن سے اُن میں نمایاں تھا، اس وقت مولانا شبلی مرحوم عربی کی اعلیٰ کتابیں اعظم گڑھ میں مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی سے پڑھ رہے تھے، مولانا فاروق صاحب اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم ہونے کے ساتھ فارسی کے بھی بہت بڑے ادیب اور استاد تھے، مولانا حمید الدین صاحب کی آمدورفت یہاں بھی رہا کرتی تھی اور یہ عالمانہ صحبتیں ان کو ملا کرتی تھیں۔

ابھی مولانا کی عمر سولہ برس کی تھی کہ فارسی کے سب سے مشکل گو شاعر خاقانی شروانی کی تتبع میں ایک قصیدہ لکھا جس کی ردیف آئینہ اور قافیہ جوہر، کیفو وغیرہ ہے، سلطان عبدالحمید خان کی مدح میں ہے، مطلع ہے۔

بے جلوۂ رخِ تو بود مضطر آئینہ　　　　خار افگند بہ پیرہن از جوہر آئینہ

بعد کے شعر ہیں۔

گیسوئے بجو شب تو بیار لے وہم بصبح
فرمائے تو بیا ورواز خسا ور آئینہ
گستاخ دیدہ است بروئے تو لاجرم
چشم سپید یافت بدیں کیفر آئینہ
آئینہ واگذار و بیا در دو دیدہ ام
چشمم بود ز آئینہ بہتر ہر آئینہ
در بزم انس خویش چراجائے دادہ
تا می شود برابرِ تو اکثر آئینہ
کے باضمیر شاہ شود ہمسر آفتاب
کے روئے بجو ماہ ترا ہمسر آئینہ

۲۸ شعروں کا قصیدہ تھا، لوگوں کو پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی، یہ فارسی یہ لطیف زبان، یہ شیرینی اور یہ شکوہ دیکھ کر سب کو تعجب تھا، مولانا شبلیؒ فرماتے تھے کہ میں نے اس کو لے جاکر مولانا فاروق صاحب کو دکھایا اور پوچھا کہ آپ کے نزدیک یہ کس کا کلام ہے انہوں نے فرمایا یہ تو نہیں بتا سکتا مگر قدما میں سے کسی کا معلوم ہوتا ہے، مولانا شبلی نے فرمایا یہ حمید کا ہے، حیرت ہوگئی۔

مولانا حمید الدین صاحب فطرۃً نہایت ذہین، طباع اور نہایت دقیقہ رس تھے، اُن کا ذہن نہایت صاف تھا اور اول ہی وہلہ میں بے پیچ و پیچ حقیقت کی منزل مقصود تک پہنچ جاتے تھے، ان کا تیر نظر مسائل کی تشریح اور مشکلات کے حل میں ہمیشہ نشانہ پر بیٹھتا تھا، دماغ اتنا سُلجھا تھا کہ کتنا ہی پیچیدہ مسئلہ ہو وہ اس کی اصل تہہ تک پہنچ جاتے تھے اور اگر وہ مناظرہ پر اُتر آتے تو کیسی ہی غلط بات ہو وہ اس کی ایسی عمدہ عمدہ دلیلیں پیش کرتے تھے کہ حریف ساکت

ہوجاتا تھا اور سمجھ لیتا تھا کہ یہ مولانا کی اصلی رائے ہے، مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ مسکرا کر فرماتے کہ یہ تو غلط تھا، اصلیت یہ ہے۔

فارسی کے بعد مولانا نے عربی کی تعلیم شروع کی اور بھائی (مولانا شبلی) سے عربی پڑھنے لگے، چنانچہ متوسطات تک مولانا شبلی ہی سے تعلیم پائی، مولانا شبلی جب یہاں سے باہر نکلے تو یہ بھی گئے، لکھنؤ جاکر مولانا حمیدالدین صاحب نے فرنگی محل میں مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی سے کچھ پڑھا، اس زمانہ میں لکھنؤ میں خواجہ عزیزالدین صاحب عزیز لکھنوی (پروفیسر فارسی کینگ کالج لکھنؤ و مصنف قیصر نامہ) لکھنؤ میں فارسی کے نہایت مستند استاد و شاعر تھے، ان کی صحبتوں میں شرکت کا اتفاق ہوتا رہا اور ان دونوں بھائیوں سے خواجہ صاحب کے اسی فارسی کے رشتہ سے تعلقات محبت عزیزانہ حیثیت تک پہنچ گئے تھے۔ لکھنؤ کے بعد مولانا نے لاہور جاکر مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری سے عربی ادب کی کتابیں پڑھیں، اس زمانہ میں یہاں نیا نیا اورنٹیل کالج کھلا تھا، مولانا فیض الحسن صاحب اپنے عہد کے مشہور ادیب اس میں مدرس تھے، ان کا نام سن کر طلبہ دور دور سے پڑھنے آتے تھے، لیکن مولانا حمیدالدین صاحب نے مولانا فیض الحسن صاحب سے خارج میں پڑھا اور یہیں ان کی ملاقات مولوی وحیدالدین صاحب پانی پتی سے ہوئی اور وہ دوستی تک پہنچی جو آخر تک قائم رہی، اور اسی دوستی کی کشش تھی کہ مولوی وحیدالدین صاحب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد تک پہنچے۔

مولانا بیس برس کی عمر میں سنہ ۱۳۰۰ھ، سنہ ۱۸۸۳ء میں عربی تعلیم سے فارغ ہوگئے، اور عربی ادب میں بھی وہ کمال حاصل کیا کہ سچ یہ ہے کہ وہ اس میں اپنے استادوں سے بھی گوئے سبقت لے گئے، اُن کا عربی دیوان اس بیان کا شاہد ہے۔

انگریزی تعلیم: اس زمانہ میں انگریزی پڑھنا کفر سمجھا جاتا تھا، مگر یہ کفر مولانا نے توڑا، بیچ کے طور پر انگریزی کچھ پڑھ لینے کے بعد کرنل گنج اسکول الہ آباد میں داخل ہوگئے، انٹرنس کا امتحان پرائیوٹ طور پر دے کر ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ یہ علی گڑھ کالج

کے اوجِ شباب کا زمانہ تھا اور مولانا شبلی اس کے مدرس، مولانا حالی وہاں کے مقیم و ساکن تھے، ہر وقت علمی مسائل و تحقیقات کے چرچے رہتے تھے اور اُن بزرگوں کی صحبتیں حاصل تھیں جن میں ہر ہونہار طالب علم کے فطری جوہر کے چمکنے کا موقع حاصل تھا۔ مسٹر آرنلڈ فلسفہ پڑھاتے تھے۔ مولانا کو فلسفۂ جدید کا ذوق انہیں کی تعلیم سے ہوا تھا۔

اس زمانہ میں کالج کے ہر طالب العلم کو عربی، فارسی بھی لازماً پڑھنی پڑتی تھی، مگر سرسید نے ان کے متعلق مسٹر بک کو لکھ کر بھیجا کہ حمید الدین عربی، فارسی کے ایسے ہی فاضل ہیں جیسے آپ کے کالج کے استاد اور پروفیسر ہیں، اس لئے ان کو مشرقی علوم کے گھنٹوں سے مستثنیٰ کر دیا جائے، چنانچہ وہ مستثنیٰ کئے گئے۔

مولانا حمید الدین صاحب کی تالیف و تصنیف کا عہد طالب العلمی ہی سے شروع ہو گیا تھا، اور خود بزرگوں نے فرمائش کرکے شروع کرایا، اسی زمانہ میں علی گڑھ کالج کے دینیات کے لئے سرسید نے مولانا شبلی مرحوم سے عربی میں سیرۃ نبوی پر ایک مختصر رسالہ لکھوایا تھا۔ جس کا نام "تاریخ بدء الاسلام" ہے پھر مولانا حمید الدین صاحب سے اس کا ترجمہ فارسی میں کرایا، استاد و شاگرد کے یہ دونوں عربی و فارسی رسالے اسی وقت چھپ گئے تھے۔

سرسید کو طبقات ابن سعد کا ایک ٹکڑا وفود نبوی کے متعلق کہیں سے ہاتھ آیا، اس وقت یہ چھپی نہیں تھی، سرسید نے مولانا حمید الدین صاحب سے اس کا فارسی ترجمہ کرا کے چھپوایا، اس کی زبان ایسی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ عہد سامانی کا کوئی نثر نویس فارسی لکھ رہا ہے۔

غالباً ۱۸۹۲ء میں یا اس کے پس وپیش الہ آباد یونیورسٹی سے بی، اے کی سند حاصل کی۔

۱۸۹۵ء میں عربی میں ایم، اے کا امتحان دینا چاہا تھا، مگر نہیں دے سکے[۱]، ۱۸۹۶ء میں مدرسۃ الاسلام کراچی میں مدرسی کی کوشش کی، سرسید نے سرٹیفکیٹ دیا[۲]، اسی زمانہ میں مسٹر آرنلڈ

---

[۱] مکاتیب شبلی جلد دوم بنام مولانا حمید الدین صاحب خط نمبر ا۔ [۲] مکاتیب شبلی جلد ۲ بنام مولانا حمید الدین صاحب خط نمبر ۲۔

انگریزی میں عربی گرامر کی ایک مختصر کتاب ترجمہ کرانا چاہتے تھے، اس کے لئے مولانا ہی کا نام اُن کے ذہن میں تھا[1]۔

ملازمت، بہرحال مولانا کا تعلیمی عہد ختم ہوگیا، ۱۸۹۷ء میں وہ مدرسۃ الاسلام کراچی میں مدرس مقرر ہوگئے، یہ مسلمانوں کا انگریزی کا ایک بہت پُرانا اسکول ہے، اس کی عمارت بہت شاندار اور اسٹاف اعلیٰ ہے اور سندھ میں اس کو کافی شہرت حاصل ہے، مولانا اس میں ۱۹۰۶ء تک رہے، ۱۹۰۰ء میں امیر عبدالرحمان خان والی کابل ایک ترجمہ کا محکمہ قائم کرنا چاہتے تھے، اس میں ابن خلدون کا ترجمہ بھی پیش نظر تھا، اس کے لئے مولانا شبلی نے ان کا انتخاب کیا، مگر کسی وجہ سے یہ تجویز عمل میں نہ آسکی اور وہ کراچی میں بدستور رہے اور درس وتدریس کے علاوہ تصنیف وتالیف کا شغل جاری رکھا، یہیں کے قیام کے زمانہ میں ۱۹۰۳ء میں ان کا فارسی دیوان شائع ہوا، اور مولانا شبلی مرحوم کے باربار تقاضے سے جیسا کہ مکاتبِ شبلی جلد دوم میں اُن کے خطوط سے ظاہر ہے علمی مباحث پر نقد ونظر کی طرف توجہ فرمائی اور خصوصیت کے ساتھ قرآن پاک کے نظم وبلاغت میں انہماک پیدا ہوا اور جمہرۃ البلاغت نام کا رسالہ لکھا، جس کا خلاصہ مولانا شبلی مرحوم نے خود اپنے قلم سے الندوہ کے دسمبر ۱۹۰۵ء میں شائع کیا۔

اسی زمانہ میں (غالباً ۱۹۰۲ء) میں جب اس وقت کے وائسرائے لارڈ کرزن نے سواحلِ عرب اور خلیج فارس کا سیاسی بحری سفر کیا تھا اور سواحل عرب کے شیوخ اور امراء کو اپنی ملاقات کے لئے جمع کیا تھا، تو مولانا ہی کا انتخاب ترجمان کی حیثیت سے ہوا تھا، وہ اس سفر میں لارڈ کرزن کے ساتھ تھے اور عرب سرداروں کے سامنے لارڈ کرزن کی طرف سے جو عربی تقریر پڑھی گئی تھی وہ انہیں کی لکھی ہوئی تھی۔

۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ نے علی گڑھ کالج کو ایک معتدبہ عطیہ عربی تعلیم کے لئے دیا

---

[1] ایضاً خط نمبر ۲۔

تھا، جس کے لئے شرط یہ تھی کہ اس کا پروفیسر کوئی یورپین ہو، چنانچہ جرمن فاضل یوسف ہارویز کا اس کے لئے انتخاب ہوا، ساتھ ہی مولانا کا انتخاب مددگار پروفیسر کی حیثیت سے ہوا اور وہ علی گڑھ چلے آئے۔ علی گڑھ میں بھی وہ زیادہ دن نہیں رہے، بہرحال جتنے دن بھی رہے اپنے علمی کاروبار میں مصروف رہے، ہارویز صاحب مولانا سے اپنی عربی کی تکمیل کرتے تھے اور مولانا ان سے عبرانی سیکھتے تھے اور ساتھ ہی قرآن پاک کی تفسیر اور تفسیر کے مقدمہ کے اجزار کی تالیف کا کام جاری تھا

مولانا شبلی مرحوم کے تعلق کے سبب سے پھر خود مولانا حمیدالدین صاحب کے ذاتی فضل وکمال کے باعث علی گڑھ کے حلقہ سے ان کے روابط قائم ہو گئے تھے، خصوصاً نواب صدریار جنگ، مولانا حبیب الرحمان خان شروانی رئیس حبیب گنج کی ذوق آشنا اور قدر شناس نگاہوں سے وہ کہاں بچ سکتے تھے، چنانچہ اکثر آمدورفت رہتی تھی۔ نواب صاحب ممدوح نے مولانا کی وفات کے بعد جو والانامہ مجھے لکھا ہے اسمیں رقم فرماتے ہیں:

"مجھے مولانا سے دیرینہ نیاز حاصل تھا، ابتدائی ملاقات کا ذریعہ علامہ (شبلی) مرحوم تھے، علی گڑھ کی پروفیسری کے زمانہ میں ملا، پھر حیدرآباد میں۔ علی گڑھ کے دور میں بھی تدبر قرآنی کا شرف جاری تھا، روزانہ تین بجے شب سے صبح کے ۹ بجے تک اس میں وقت صرف کرتے تھے، ملاقات کے وقت نتائج تحقیق بیان فرماتے، اس زمانہ میں دیگر کتب سماوی کا اور اس کی مدد سے مطالب قرآنیہ کا حل خاص کر پیش نظر تھا، اس حالت میں علی گڑھ چھوڑا۔"

اجزار جو لکھتے جاتے تھے، وہ مولانا شبلی مرحوم کی خدمت میں بھیجتے رہتے تھے، شروع شروع میں استاد کو اپنے شاگرد کے اس نظریہ سے اختلاف تھا کہ قرآن پاک کے مطالب و معانی مرتب ومنظم ہیں اور وہ مولانا حمیدالدین صاحب کی اس کوشش کو رائگاں سمجھتے تھے لیکن جب انہوں نے ان کی تفسیر کے متعدد اجزا دیکھے تو قائل ہوتے چلے گئے اور آخر داد

لگے اور حوصلہ افزائی کرنے لگے اور آخر آخر میں تو وہ مولانا حمید الدین کی نکتہ دانی کے اس درجہ قائل ہو گئے تھے کہ قرآنی مشکلات کے حل میں وہ ان سے مشورہ لینے لگے تھے، ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"تفسیر ابی لہب اور جمہرۃ البلاغہ کے اجزا بغور دیکھے، تفسیر پر تم کو مبارکباد دیتا ہوں، تمام مسلمانوں کو تمہارا ممنون ہونا چاہیئے، بلاغت کے بعض اجزاء معمولی اور سرسری ہیں، ارسطو کا رد البتہ قابل قدر ہے۔" جون ۱۹۰۵ء

علی گڑھ کے قیام ہی کے زمانہ میں انہوں نے اقسام القرآن لکھی یعنی اس مشکل کا حل فرمایا کہ خدا نے قرآن مجید میں قسمیں کیوں کھائی ہیں، اس سوال کے جواب میں سب سے پہلے امام رازی نے تفسیر کبیر میں جستہ جستہ فقرے لکھے تھے پھر ابن القیم نے البیان فی اقسام القرآن لکھی، مگر مولانا حمید الدین صاحب کی تحقیقات نے اپنی الگ شاہراہ نکالی اور حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں انہوں نے ایسی داد تحقیق دی کہ تیرہ سو برس میں اسلام میں کسی نے نہیں دی، مولانا شبلی مرحوم نے ان کے اس رسالہ کا خلاصہ نہایت مسرت اور خوشی کیساتھ الندوہ اپریل ۱۹۰۶ء میں شائع کیا اور عربی رسالہ اقسام القرآن کے نام سے الگ شائع ہوا اس کے بعد اس رسالہ کو مزید تحقیقات سے مؤید کر کے امعان فی اقسام القرآن کے نام سے علی گڑھ میں چھپوایا[1]، اس وقت سے لے کر آج تک مختلف مدعیان تحقیق نے اقسام القرآن پر جو کچھ کہا ہے وہ تمام تر مولانا کے خوانِ علم کی زلہ ربائی ہے۔

اس کے بعد اگست ۱۹۰۶ء میں اقسام القرآن کے علاوہ سورۂ ابی لہب اور سورۂ قیامت کی تفسیریں چھپیں اور اہل علم نے ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا، علامہ سید رشید رضا صاحب المنار مصر جو خود تفسیر لکھ رہے تھے، انہوں نے ان پر مداحانہ اور معترفانہ تقریظ

---

[1] ابھی حال میں دار المصنفین نے مولانا کے اس رسالہ کو خوبصورت ٹائپ میں چھپوایا ہے، ایک مہینہ میں امید ہے کہ ہندوستان پہنچ جائے، شاید ۸/ قیمت ہو۔

لکھی اور تحسین کی۔

سنہ ۱۹۰۴ء کے بعد جب مولانا حمید الدین صاحب کراچی یا علی گڑھ سے وطن آتے جاتے تو لکھنؤ میں بھائی کے پاس کچھ دن ٹھہر کر آتے جاتے اور سنہ ۱۹۰۵ء سے مولانا خاص طور سے تقاضا کر کے بلواتے اور اپنے پاس ٹھہراتے، مقصود یہ تھا کہ ندوہ کے طلباء ان سے فائدہ اٹھائیں، چنانچہ انہیں کے اصرار سے کئی دفعہ وہ ندوہ میں آکر رہے اور طلبہ کو کبھی فلسفۂ جدیدہ اور کبھی قرآن کے سبق پڑھائے، میں بھی اس زمانہ میں ندوہ کا طالب العلم تھا، مولانا کے ان درسوں سے مستفید ہوا۔

اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام صاحب مولانا شبلی مرحوم کے پاس ندوہ میں مقیم تھے اور الندوہ کے مددگار اڈیٹر تھے، وہ مولانا حمید الدین صاحب کی ان صحبتوں سے مستفید ہوتے رہے اور قرآن پاک کے درس ونظر کے نئے راستوں کے نشان پانے لگے اور بالآخر الہلال کے صفحات میں اس جادۂ بیانی کے مختلف مناظر سب کی نظروں کے سامنے آئے، اسی زمانہ میں ندوۃ العلماء نے ان کو اپنی مجلسِ انتظامی کا رکن بنایا اور آخر زمانہ تک وہ برابر رکن رہے۔

مولانا حمید الدین صاحب علی گڑھ میں دو سال کے قریب رہے، اس کے بعد سنہ ۱۹۰۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، کالج کے درس کے علاوہ بقیہ اوقات وہ تالیف وتصنیف میں صرف کرتے تھے، یہیں سے انہوں نے سورۂ تحریم کی تفسیر شائع کی اور خالص فارسی میں یعنی عربی الفاظ کی آمیزش کے بغیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے مواعظ کا عبرانی سے فارسی نظم (مثنوی) میں ترجمہ شروع کیا تھا، مولانا کا الہ آباد ہی میں قیام تھا کہ ان کے اہل برادری میں ایک نئے عربی مدرسہ کے قیام کی تحریک پیدا ہوئی، مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے اس تحریک کی عنان اپنے ہاتھ میں لی اور سنہ ۱۹۱۰ء میں اعظم گڑھ میں مولانا حمید الدین صاحب کے قریہ پھریہا سے ایک اسٹیشن بعد سرائے میر نام کے

مقام پر آبادی سے باہر ایک باغ میں اس مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی، مولانا شبلی نے اس کی نظامت کا بار مولانا حمید الدین صاحب کے کندھے پر رکھنا چاہا، ۱۹ اپریل ۱۹۱۰ء کے ایک مکتوب میں وہ لکھتے ہیں۔

"کیا تم چند روز سرائے میر مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو، میں شاید آؤں اور اسکا نظم و نسق درست کر دیا جائے، اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہئے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو"

اس مدرسہ نے رفتہ رفتہ ان دونوں بزرگوں کے زیر ہدایت ترقی شروع کی اور یہ لوگ کبھی کبھی اس کو دیکھتے رہے۔

مولانا ۱۹۱۳ء تک الہ آباد میں رہے۔

حیدر آباد دکن میں دار العلوم کے نام سے ایک قدیم عربی مدرسہ تھا جس نے حیدر آباد کی علمی و تعلیمی ترقی میں کارنمایاں انجام دیا تھا، اس کا الحاق مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقیات سے تھا، غالباً ۱۹۰۸ء میں مدراس یونیورسٹی نے اس کو توڑ دیا، اب ریاست کے تعلیمی محکمہ کے ذمہ دار افسروں کو اس قدیم مدرسہ کے جدید انتظامات و تغیرات کی فکر لاحق ہوئی اور اس کے لئے نواب عماد الملک مرحوم سابق ناظم تعلیمات حیدر آباد دکن اور مسٹر الطیفی آئی، سی، ایس جو اس وقت ناظم تعلیمات تھے اور مسٹر حیدری وغیرہ نے اہل فن کی مجلس بنائی، جس کے ایک ممبر مولانا شبلی مرحوم تھے، مولانا نے اس کے لئے ایک اسکیم مرتب کی اور ایک مشرقی یونیورسٹی کی بنیاد رکھنے کی تجویز پیش کی، یہ تجویز اسی وقت الندوہ میں مولانا نے شائع بھی کر دی تھی، مولانا شبلی مرحوم کا اس وقت کا تخیل یہ تھا کہ عربی زبان کی یہ ایک یونیورسٹی ہوگی، جس میں جدید علوم کی بقدر ضرورت آمیزش ہوگی، یہ اسکیم مدت تک زیر بحث رہی، اس اسکیم کے مطابق دار العلوم کو چلانے کے لئے مولانا حمید الدین صاحب کا انتخاب ہوا اور وہ اس کے صدر (پرنسپل) بنائے گئے اور ۱۹۱۴ء کے اوائل میں الہ آباد سے حیدر آباد

حیدرآباد جاکر اس نئی مشرقی یونیورسٹی کے خاکہ بنانے میں مصروف ہوئے، درس و تدریس کے علاوہ مدرسہ کی انتظامی نگرانی بھی ان کو کرنی پڑتی تھی، انہوں نے رفتہ رفتہ مدرسہ کی ظاہری و باطنی ترقیوں کی کوششیں شروع کیں، مسٹر الما لطیفی کی جگہ راس مسعود صاحب نے لی اور انہوں نے ان کے ساتھ مل کر کام شروع کیا۔

مولانا شبلی مرحوم کی فرمائش سے نواب عماد الملک مرحوم نے قرآن پاک کے انگریزی ترجمہ کا جو کام شروع کیا تھا وہ نصف کے قریب انجام پاچکا تھا، مگر اس میں جا بجا نقائص تھے، نواب صاحب نے مولانا حمید الدین صاحب کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا اور مدت تک یہ شغل جاری رہا کہ مولانا روزانہ صبح کو نواب صاحب کے یہاں جاتے اور نواب صاحب باایں ہمہ ضعف و پیری، انگریزی ترجمہ پر مل کر غور کرتے اور مناسب مشورہ ملنے پر اصلاح ترمیم کرتے، اس طرح اُن کے ترجمہ کے کئی پاروں پر نظر ثانی ہوئی، پھر یہ کام رک گیا لیکن یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ نواب صاحب مرحوم کی وفات کے بعد یہ اصلاح شدہ اجزا اس طرح کاغذات میں مل گئے کہ پھر ان کا پتہ نہ چلا، میں نے نواب صاحب مرحوم کے خلف الرشید نواب مہدی یار جنگ بہادر کو تحریری و زبانی کئی دفعہ ان کی تلاش کی طرف توجہ دلائی، مگر انہوں نے ان کے ملنے سے مایوسی ہی ظاہر کی۔

مولانا شبلی مرحوم اس وقت سیرۃ النبی کی پہلی جلد لکھ رہے تھے، یہود و نصاریٰ اور اہل کتاب کے مناظرانہ مسائل اور قرآن پاک کے استدلالات میں وہ برابر اپنے بھائی سے مشورہ لیتے تھے، جو مکاتب (۷-۵-۳۰) سے ظاہر ہیں، سیرت جلد اول کے مقدمہ میں حضرت اسمٰعیلؑ کی سکونت اور قربانی کے متعلق جو باب ہے اس کا مواد مولانا حمید الدین ہی نے بہم پہنچایا تھا، جس کو آئندہ چل کر مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے بڑھا کر اور پھر اور زیادہ استقصار کر کے الرائ الصحیح فی من ھو الذبیح کے نام سے الگ شائع کر دیا۔

مولانا حمید الدین صاحب فطرۃً نہایت تنہائی پسند، گوشہ نشین اور بڑے لوگوں سے

ملنے جلنے سے وہ عمداً بہت بچتے تھے، اس لئے حیدرآباد دکن جاکر بھی جو ایک عالم کا مرکز اور خوش قسمتیوں کا عجائب خانہ ہے، ان کی حالت میں کوئی تغیر نہیں ہوا، سوائے اپنے حلقہ کے خاص لوگوں کے جن سے اُن کو اتحاد ذوق تھا، اور کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔

اب یہ وہ زمانہ ہے جب مولانا شبلی مرحوم اور ندوۃ العلماء کے دوسرے ارکان کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی تھی، جس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ یہ کنسرویٹو اور لبرل کی پرانی جنگ تھی۔

اور آخر ۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی نے دارالعلوم ندوہ کی معتمدی سے استعفا دیا تو اپنی پرانی تجویز یعنی ایک دارالمصنفین اور دارالتکلیل کی بنا ڈالنے کا خیال آیا، مگر یہ خیال ہنوز دل میں تھا یا کاغذ کے صفحہ پر تھا، اس کے لئے کبھی لکھنو کبھی کسی اور مقام کی فکر تھی، اسی اثنا میں اگست ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی کے عزیز بھائی مولوی اسحاق صاحب وکیل ہائیکورٹ الہ آباد کے انتقال نے ان کو بالکل سرد کر دیا اور لوٹ کر اعظم گڑھ کو اپنا ٹھکانا بنایا اور اس کیلئے زمین و بنگلہ وقف کیا اور چاہا کہ مدرسہ سرائے میر اور اپنے نیشنل ہائی اسکول (جس کو ۱۸۸۳ء میں یہیں قائم کیا تھا) اور دارالمصنفین کو ملا کر ایک علمی و تعلیمی ادارہ بنالیں، اس عزم و یاس کے عالم کشمکش میں مولانا حمیدالدین صاحب کو لکھا:-

"بھائی اچھا ہو گیا، ولن یصلح العطار ما افسد الدھر دو دن اچھا رہا تو چار دن بیمار رہتا ہوں، لیکن بات چیت کرتا ہوں، لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی شکایت نہیں، نظام جسم برہم ہو چکا، ابھی ابھی سردی لگی، حالانکہ دوپہر کا وقت ہے"۔
افسوس یہ ہے کہ سیرت پوری نہ ہو سکی اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کر سکے، اور اگر دارالمصنفین ہوا تو تمہارے سوائے کون چلائے گا"

یہ اکتوبر ۱۹۱۴ء کا خط ہے، ۲۸ر اکتوبر کو لکھا:-

"برادرم، وقت تو یہ تھا کہ ہم چند لوگ یک جا ہوتے اور کچھ کام کرتے،

لیکن میری دنیا طلبی کا یہ حال ہے کہ خود بے نیاز ہو گیا ہوں، لیکن عزیزوں کی بے تعلقی شاق ہوتی ہے، سید سلیمان بھی تعلق موجودہ[1] پر راضی نہیں، ذرا اشارہ ہو تو میرے پاس آجائیں، میں خود روک رہا ہوں"

مرا اگر تو بگذاری اے نفس طامع
بسے بادشاہی کنم در گدائی

اس کے تین ہفتہ کے بعد مولانا شبلی نے ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو انتقال کیا، مولانا حمید الدین صاحب وفات سے ایک دن اور میں دو دن پہلے پہنچا تھا، مجھے حکم دیا کہ "سب چھوڑ کر سیرت" مولانا حمید الدین صاحب جب پہنچے تو مصنفِ سیرت کی مقدس زبان خاموش ہو چکی تھی، آنکھیں کھول کر بھائی کی طرف دیکھا اور چپ ہو گئے، اس خاموش نگاہ حسرت میں وصیتوں اور فرمائشوں کے ہزاروں معنی پوشیدہ تھے، جن کو اہل نظر ہی سمجھ سکتے ہیں۔

اس موقعہ پر ہم جاں نثاروں میں صاحب ہوش وہی تھے، ماتم کے آنسو ابھی خشک نہیں ہوتے تھے کہ انہوں نے تیسرے دن اس وقت مولانا شبلی مرحوم کے جو چند تلامذہ جمع ہو گئے تھے، ان کی ایک مختصر سی جماعت نعمانیہ بنائی، جس نے اپنا یہ مقصد قرار دیا کہ وہ مولانا شبلی صاحب کے ادھورے کاموں کی تکمیل کرے گی، مدرسہ سرائے میر کی صدارت مدرسین مولانا شبلی صاحب متکلم ندوی کے سپرد ہوئی، اس کی نظامت مولانا مسعود علی صاحب ندوی نے اپنے سر لی، دار المصنفین کی تشکیل و تاسیس کے لئے اسی جماعت کے ارکان نے ماہوار چندے لکھوائے اور اس کا اہتمام بھی مولانا مسعود علی صاحب ندوی نے اپنے ذمہ لیا اور سب سے زیادہ یہ کہ شبلی منزل میں ان کاموں کی انجام دہی کے خاطر تنہا قیام گوارا کیا۔

اس کے بعد میں اور وہ دونوں مل کر سرکار عالیہ نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ والیہ عالیہ بھوپال گئے، سرکار عالیہ نے تسلی دی اور سیرۃ کی تصنیف کی رقم کو بدستور ہم دونوں کے نام

---

[1] دکن کالج پونہ کی اسسٹنٹ پروفیسری۔

جاری فرمادیا اور یہی دارالمصنفین کے وجود و نشو و نما کے لئے ابر کرم کی پہلی بارش تھی۔

حیدر آباد جاکر مولانا نے کوشش فرمائی اور نواب عمادالملک کی تائید سے وہ کوشش کامیاب ہوئی اور مولانا کا تین سو ماہوار کا وظیفہ دارالمصنفین کے نام منتقل ہوا، یہ دارالمصنفین کی بقا کی بہترین ضمانت تھی، اس کے بعد گو باقاعدہ مجلس انتخاب نہیں ہوا تھا، تاہم ان کی حیثیت صدر مجلس کی اور میری ناظم کی تھی، بعد کو باقاعدہ تاسیس اور وضع دستورالعمل کے بعد بھی قانونی شکل بن گئی اور یہی آخر تک دارالمصنفین کی مجلس عامہ کے صدر نشین رہے۔

مولانا شبلی مرحوم نے اپنے دو مذکورۂ بالا آخری خطوط میں جو کچھ لکھا تھا وہ مولانا حمیدالدین صاحب مرحوم کی آئندہ زندگی کا نصب العین بن گیا، گو دارالعلوم حیدر آباد کے تغیر اور جامعہ عثمانیہ کے مفید و مبارک تخیل کی سود مندی کی خاطر انہوں نے چندے حیدر آباد کا قیام گوارہ کیا، مگر ان کا دل اور کاموں میں لگا تھا۔

مولانا حمیدالدین صاحب کے تصور نے مجوزہ دارالعلوم کی شکل ہی بدل دی، مسلم یونیورسٹی اور ہندو یونیورسٹی کے "کنسرویٹو آیڈیا" میں بھی انقلاب پیدا کر دیا، مولانا حمیدالدین صاحب ہی تھے جنہوں نے عصری علوم و فنون کی اردو زبان میں تعلیم کی تجویز پیش کی اور اس کا خاکہ تیار کیا، اُن کا تخیل یہ تھا کہ دینیات کی تعلیم عربی میں ہو اور باقی تمام علوم یہاں تک کہ اصول و فقہ بھی اُردو میں پڑھایا جائے، لیکن راس مسعود صاحب اور نواب سر حیدر نواز جنگ حیدری صاحب نے ان کے اس تخیل کو کہ علوم کی تعلیم کی زبان اُردو ہو قبول کیا، مگر یہ کہ تمام لڑکوں کو دراصل دینیات کی عربی تعلیم دی جائے قبول نہیں کیا اور یہی درحقیقت حیدر آباد سے ان کی دل برداشتگی کا سبب ہوا، ۱۹۱۷ء سے جامعہ عثمانیہ کی تیاری اور کتابوں کے ترجمہ کا اور اصطلاحات کے وضع کرنے کا کام شروع ہوا، وہ اس مجلس کے رکن تھے اور وضع اصطلاحات میں مفید مشورے دیتے تھے اور جامعہ کے نقشِ تخیل کی رنگ آمیزی میں مصروف تھے تا آں کہ اگست ۱۹۱۹ء میں باقاعدہ اس کے افتتاح کی نوبت آئی۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی جو اس زمانہ میں صدر الصدور ہو کر حیدر آباد پہنچ چکے تھے اور وہ جامعہ عثمانیہ کے سب سے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے تھے، وہ اپنے والا نامہ مذکور میں فرماتے ہیں:

"جامعہ عثمانیہ کی بنیاد رکھنے والوں میں مولانا کے ہاتھ بھی تھے"

مگر بعض وجوہ کے باعث یہ ہاتھ فوراً اپنی جگہ سے ہٹ گیا، گو ظاہری سبب یہ بھی تھا کہ حیدر آباد کی آب وہوا مرحوم کو راس نہیں آئی، ان کے درد سر کی عارضی بیماری نے دائمی صورت اختیار کر لی، اس درد کے دورہ سے وہ بے چین ہو جاتے تھے اور پھر کسی کام کے قابل نہیں رہتے تھے، بایں ہمہ یہاں کے قیام کے دوران میں خرد نامہ یعنی مواعظ سلیمانی کی تکمیل کی اور چھپوائی، پھر اسباق النحو کے نام سے عربی صرف ونحو کے آسان صورت میں نئے اصول پر اردو میں دو رسالے مرتب کئے اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے وہ چھپے، اپنے استاذِ ادب مولانا فیض الحسن صاحب مرحوم کا عربی دیوان تصحیح کر کے چھپوایا، الرائی الصحیح تصنیف کی اور تفسیر کے بعض مقدمات لکھے، اسی کے ساتھ درسِ قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا، مغرب کے بعد یہ مجلس جمع ہوتی تھی، مولانا تقریر فرماتے تھے، لوگ شکوک پیش کرتے تھے، وہ جواب دیتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد مجلس ختم ہو جاتی تھی، ہمارے فاضل دوست مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی جو اس وقت جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر ہیں، وہ اس مجلس کے خاص لوگوں میں تھے، ایک دو دفعہ مجھے بھی شرکت کا اتفاق ہوا، کبھی کبھی مولوی وحید الدین صاحب سلیم مرحوم بھی اس میں بیٹھتے تھے۔

مولانا حیدر آباد میں ۱۹۱۹ء تک رہے اور عین اس وقت جب جامعہ عثمانیہ کا ہیولیٰ صورت قبول کر رہا تھا، انہوں نے استعفا دیدیا، ذمہ دار ارکانِ حکومت چاہتے تھے کہ مولانا قیام کریں، مگر وہ اپنی طبعی بے نیازی اور استغنا کو راہ دے کر متوکلاً علی اللہ ایک ہزار ماہوار کی جگہ چھوڑ کر وطن چلے آئے، حیدر آباد میں جب تک وہ رہے، بے ہمہ اور با ہمہ رہے، علم کی قدر

منزلت اور بے نیازی کو انہوں نے پوری طرح نباہا اور جو لوگ اُن سے ذاتی طور پر واقف تھے اور ان کا حلقہ بہت محدود تھا، اُن پر مولانا کی جدائی بڑی شاق گزری، باایں ہمہ وہ ان کے رنگ طبع کو دیکھ کر ان کو مجبور نہ کر سکے، مولانا کو حیدر آباد سے نہ کوئی پنشن مل سکی اور نہ کوئی وظیفہ ہوا، نہ کسی اور قسم کی مالی امداد کے پانے کی انہوں نے کوشش کی، چونکہ وہ الہ آباد یونیورسٹی سے حیدر آباد بھیجے گئے تھے، اس لئے الہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے کل تیس بتیس روپے کی ان کو پنشن ملی۔

اعظم گڑھ واپس آکر مولانا نے اپنے وطن پھریہا میں قیام فرمایا، خاندانی موروثی زمینداری کا کام کبھی کبھی کچھ دیکھ لیتے تھے، ایک دو لڑکوں کو کچھ پڑھا دیتے تھے، ورنہ زیادہ تر وقت یادِ الٰہی نماز، تلاوت اور قرآن پاک کی غور و فکر میں بسر ہوتا تھا۔ اب وقت آیا کہ مولانا مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی طرف توجہ فرمائیں

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر: دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب تک کسی چیز کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا جاتا، لوگ اس کو حقیقت باور نہیں کرتے، تھوڑے کو بہت کر کے دکھانا اس عالم فریب کا خاصہ ہے، مگر مولانا کی طبیعت کا رنگ الگ تھا، وہ اعلان و تعلی سے بہت بھاگتے تھے اور بہت کو تھوڑا کہہ کر بھی وہ دکھانا نہیں چاہتے تھے۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی بنیاد میں گو بہتوں کا ہاتھ شریک ہوا، لیکن اس کے تخیل کی تعیین اور اس تخیل کے مطابق مدرسہ کو چلانا اس کا نصابِ درس بنانا مدرسوں کو اپنے انوکھے خیال سے متفق کرنا، خاص طلبہ کو اپنے مذاق کی تعلیم دینا اور پورے مدرسہ کو اپنے نہج کے مطابق لے چلنا خاص انہیں کا کام تھا۔

مدرسۃ الاصلاح کیا ہے؟ آج جب کہ ہر بڑے شہر کی گلی گلی میں، بلکہ قصبوں اور دیہاتوں تک میں عربی کے مدرسے قائم ہیں اور ہر سال ان کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ مولانا کا ایک نئے مدرسہ کے قیام پر اپنی زندگی وقف کر دینا اور اپنی عمر کے آخری پورے

بارہ برس اس پر تصدق کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کے جواب میں بجائے اس کے کہ ہم خود کچھ کہیں مدرسہ کی مطبوعہ روداد سے ایک اقتباس نقل کر دیتے ہیں اور یہ وہ تحریر ہے جو خود مولانا نے لکھی تھی، یا ان کی فرمائش سے لکھی گئی اور ان کی نظر سے گزر کر اصلاح پا چکی تھی:

"مسلمانوں کی موجودہ پستی جو اُن کی زندگی کے ہر شعبہ پر طاری ہے۔ زیادہ تر نتیجہ خیز ہے اس خرابی کا جو اُن کی مذہبی تعلیم میں صدیوں سے پیدا ہو گئی ہے، جب تک مسلمانوں کی مذہبی تعلیم اپنے صحیح نہج پر قائم رہی۔ وہ برابر دین و دنیا کے تمام شعبوں میں ترقی کرتے رہے، لیکن جب سے یہ شاہراہ کج ہوئی، دینی مدارس اور مذہبی پیشواؤں کی کثرت کے باوجود مسلمانوں کا زوال شروع ہوا، اور برابر بڑھتا گیا......

ان حالات میں خدا نے ایک جماعت کو اپنی توفیق بخشی اسے سرفراز کیا اور اس نے طے کر لیا کہ جس اسلوب پر علوم دینیہ کی تعلیم ہو رہی ہے وہ قطعی ناقص اور غیر منتج ہے، جب اسلام ہماری دینی و دنیاوی فلاح کا جامع ہے تو اسلامی تعلیم کے یہی معنی ہوں گے کہ وہ نہ صرف ہماری عبادات کا دستور العمل ہو بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں وہ ہمارے لیے مشعل ہدایت ہو، اب ہمارے دور کا اگر کوئی علاج ہے تو وہ محض رسمی تعلیم اور نصاب مروج کو ختم کرنا نہیں بلکہ مذہبی تعلیم کو اس کے صحیح معنوں میں جاری کرنا ہے، یعنی وہ وسعت و جامعیت جو اسلام کا مفہوم ہے اور "تفقہ فی الدین" اسی سے عبارت ہے، اس جماعت نے اس بلند معیار تعلیم کو پیش نظر رکھ کر ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی، جس کا نام "مدرسۃ الاصلاح" ہے۔

مدرسۃ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ اس نے مذہبی تعلیم کی صراط مستقیم کو پالیا ہے، اس نے اسے اپنا مقصد اساسی قرار دیا ہے.... وہ مقصد اساسی اور

وہ صراط مستقیم کیا ہے؟ وہ وہی ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو چھوڑا تھا اور جس کی آخری خطبہ میں وصیت فرمائی تھی کہ "میں تمہارے لئے کتاب اللہ چھوڑے جاتا ہوں، جب تک اسے مضبوط پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے"

مدرستہ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط و تنزل کا اصلی سبب یہی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تعلیم کو آہستہ آہستہ کم کرتے گئے اور وہ علوم جو قرآن مجید کے لئے آلہ اور وسیلہ ہو سکتے تھے، ان کی تحصیل میں اس قدر مصروف ہو گئے کہ وہ خود مقصود بالذات بن گئے، یہاں تک کہ ہوتے ہوتے قرآن مجید کے درس و تدریس کے لئے انہوں نے بالکل جگہ نہ چھوڑی اور اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ محض تلاوت و حفظ الفاظ پر اکتفا کر لیا گیا اور ہم پر رسولِ خدا کی یہ شکایت منطبق ہونے لگی یا ربّ انّ قومی اتخذ واھذا القرآن مھجوراً (اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو ایک چھوڑی ہوئی چیز سمجھ لیا ہے) لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مدرستہ الاصلاح نے یہ راز پالیا اور قرآن مجید کو سرچشمۂ ہدایت و ترقی تسلیم کر کے جملہ علوم کی تعلیم اس کی تعلیم کے ماتحت کر دی، وہ ادب فقہ، حدیث، تاریخ سیر، منطق و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، لیکن اس طور پر کہ جس علم کی طرف قدم بڑھائے قرآن کی روشنی میں اور جو دروازہ کھلے قرآن ہی کے اندر سے کھلے"

اس تشریح کے بعد آپ نے سمجھا ہو گا کہ مدرستہ الاصلاح کیا ہے؟ اور مولانا نے اس مدرسہ کو ترقی دے کر ملت کی کیا اصلاح کی؟ اور انہوں نے گراں بہا معاوضہ، اعلیٰ اعزاز، دنیاوی منصب اور شہروں کی لذت بخش زندگی کو چھوڑ کر سادگی قناعت اور گمنامی کے ساتھ اپنی عمر کا ایک حصہ کیوں ایک دیہات میں بیٹھ کر عربی کے ایک مدرسہ کی خدمت گزاری میں بسر کر دیا۔

یہ مدرسہ مولانا کے گھر سے ایک اسٹیشن کے فاصلہ پر ہے، مولانا ہر ہفتہ میں تین دن شب و روز مدرسہ میں بسر فرماتے تھے اور سن کر تعجب ہو گا کہ اس اہتمام کے ساتھ آتے تھے کہ اپنے قیام

تک کے لئے کھانا پکوا کر ساتھ لاتے تھے یا بعد کو پک کر آجاتا تھا، اسی مدرسہ میں مولانا کی ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی، جس میں وہ قیام فرماتے تھے۔

اس مدرسہ کی بنیاد محض توکل پر ہے اور مولانا کو اپنے خدا پر یہ اعتماد تھا کہ کبھی مدرسہ کے متعلق ایک دفعہ بھی یہ تصور اپنے دل میں نہیں لائے کہ کل کیا ہوگا وہ کہتے تھے کہ "خدا دیگا" اور یہ ہم سب کا مشاہدہ ہے کہ ان کا خدا اُن کو دیتا تھا۔ انہوں نے کبھی اپنے مدرسہ کے لئے کسی سے چندہ نہیں مانگا اور کبھی علم و قوم کے لئے بھی غیر کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا، ایک دفعہ مدرسہ ہی کے خاطر کلکتہ کی راہ سے رنگون گئے اور مقصد مدرسہ کا سرمایہ ہی تھا، مگر اپنی زبان سے کسی تاجر و سوداگر سے مدرسے کے لئے تحریک نہیں کی، مگر بہرحال کامیاب ہوئے۔

انہوں نے سب سے پہلے اپنے مدرسہ کے لئے ایک اچھی خاصی وسیع مسجد بنوائی، اس کے بعد درسگاہ کے لئے ایک چھوٹا سا بنگلہ بنایا، پھر ایک دارالاقامہ بنوایا جس کی تین سمتیں بن چکی ہیں، ایک باقی ہے، کتب خانہ کے لئے مکان بنوایا، مسجد کے علاوہ تمام عمارتوں کی چھتیں کچی یعنی کھپروں کی ہیں، کتب خانہ میں کچھ کتابیں اوروں کی دی ہوئی ہیں، مگر زیادہ خود اپنا ذاتی کتب خانہ مدرسہ کو عنایت فرما دیا تھا اور جو اُن کی وفات کے بعد مدرسہ کے اندر آ بھی گیا ہے۔

مدرسہ کا ماہانہ خرچ تعمیرات کے علاوہ پانچ چھ سو ہے، بعض مخلصین نے کچھ جائداد یں اعظم گڑھ، رنگون اور کلکتہ میں مدرسہ کے نام وقف کی ہیں، کچھ مدرسہ نے رنگون میں خود خریدا ہے، مگر ہنوز آمد و خرچ برابر نہیں، ضلع کے مسلمان سالانہ عشر اور قربانی کی کھالوں اور نقد چندوں سے امداد بھی فرماتے ہیں، تاہم یہ تمام سرمایہ مدرسہ کی روزافزوں ضرورتوں کے لئے کافی نہیں۔

یہ مدرسہ اسٹیشن سرائے میر کے پاس ایک میدان میں واقع ہے، اِدھر اُدھر دور تک آبادی سے خالی ہے، چاروں طرف دور ہٹ کر مسلمانوں کے دیہات ہیں، یہیں کے باشندے اس کے ممبر خادم اور کارکن ہیں جو موقع پر جمع ہو کر کام کو انجام دیتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، انتہائی

سادگی اور صفائی اس مدرسہ کا جزو اعظم ہے، مدرسین میں بعض پرانے مدرسوں کے تعلیمیافتہ ہیں، چند دار العلوم ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل ہیں اور بعض خود مدرسہ کے پڑھے ہوئے ہیں، مدرسہ کے سب سے پرانے خادم ایک سادہ وضع بزرگ مولانا محمد شفیع صاحب ہیں جو نہایت اخلاص کے ساتھ شروع سے آج تک مدرسہ کی نگرانی اور مالی انتظام کر رہے ہیں۔

مدرسہ کے یہ مدرسین جس سادگی اخلاص اور ایثار کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کی مثال ہم کو کسی اسلامی درسگاہ میں نہیں ملتی۔ سب سے بڑی تنخواہ اعلیٰ مدرس مولانا شبلی صاحب ندوی کی ہے، پینتیس روپے، درانحالیکہ ان کے پڑھائے شاگرد اور ان کے ساتھی اس سے دوگنی چوگنی زیادہ تنخواہ پا رہے ہیں۔

مولانا علماء کی گداگرانہ خصلت سے سخت نفرت رکھتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ مولویوں کے مدرسہ سے بھی گداگری کی لعنت دور ہو جائے، چنانچہ مدرسہ کے لئے بھی انہوں نے جائداد خریدی جس کا سال بسال منافع آتا ہے اور صرف اپنی کوشش سے بھی تمام عربی مدارس کے خلاف اس مدرسہ میں تجارتی وصنعتی آمدنیوں کے ذرائع پیدا کئے، خود اپنی طرف اور مدرسہ کے بعض مخلص ہمدردوں کی طرف سے کچھ سرمایہ لگا کر مدرسہ میں آٹا پیسنے کی مشین مع انجن کے لگائی اور اس سے مدرسہ کو روزانہ کی آمدنی ہو جاتی ہے، مدرسہ کے اندر جوتا بنانے کا ایک شعبہ قائم کیا جہاں اچھے جوتے پمپ اور شو وغیرہ بنتے ہیں، وہ حیدر آباد میں ایک اچھے منصب پر تھے، وہاں کے عمائد سے اچھی راہ و رسم تھی، مگر اپنے مدرسہ کے لئے کبھی ریاست سے امداد کی تحریک نہیں کی، فرماتے تھے کہ بے اطمینانی ہی میں توکل کی دولت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق خاطر کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔

مدرسہ کی تعلیمی کیفیت یہ ہے کہ تمام مدرسین مولانا کے زہد و تقویٰ اور فضل و کمال سے اُن کے گرویدہ تھے، سب سے پہلے مدرسین کو اپنا ہم خیال بنایا اُن سے قرآن مجید کے مباحث اور علوم عالیہ کے مسائل میں اپنی تحقیقات بیان فرماتے رہتے تھے، ان کو اپنا طریقۂ تعلیم سمجھاتے

اور بتاتے تھے، عربی میں صرف ونحو کی تعلیم میں سب سے زیادہ وقت برباد ہوتا تھا، خود مولانا نے صرف ونحو کے دو رسالے لکھے، جن کا مدار تمام تر مشق پر ہے، وہ دونوں رسالے وہاں پڑھائے جاتے ہیں اور وہ کافی ہوتے ہیں، نصاب تعلیم سے تمام غیر ضروری علوم نکال دیئے ہیں۔ قدیم منطق وفلسفہ کی ایک ایک دو دو کتابیں رہنے دی ہیں، ادب عربی پر خاص زور دیا، فقہ کی تعلیم فقہ اسلامی کی حیثیت سے دی جاتی ہے، حدیث کسی عصبیت کے بغیر پڑھائی جاتی ہے، اور تعلیم کا اصلی مرکز ومحور قرآن مجید کو رکھا گیا ہے۔

مولانا جب تک زندہ رہے، خود مدرسین اور اعلیٰ طلبہ کا ایک حلقہ بنا کر اس کو پورے قرآن مجید کا درس کئی دفعہ مختلف نقطہ ہائے نظر سے دیا، ساتھ ساتھ جدید فلسفہ کی بعض شاخیں بھی ان طلبہ کو پڑھائیں، چنانچہ بعض مستعد طلبہ نے مولانا کے اس درس سے پورا فائدہ اٹھایا جن میں قابل ذکر مولوی امین احسن صاحب اصلاحی ہیں، ہماری آئندہ توقعات ان سے بہت کچھ وابستہ ہیں۔

مولانا اخیر عمر میں تصنیف وتالیف کے بجائے اپنا تمام تر وقت انہیں طلبہ کی غور و پرداخت اور تعلیم وتربیت پر صرف فرماتے تھے اور انہیں کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے تھے۔

رمضان ۱۳۴۹ھ

فروری ۱۹۳۱ء

محمّد علی

ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لئے ہے (جوہرؔ)

مولانا محمد علی نے ۱۴ شعبان ۱۳۴۹ھ مطابق ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو ترپن ۵۳ برس کی عمر میں لندن میں وفات پائی، اس مسافر نے غالبؔ کے اس مصرع کو اپنے شعر میں دُہرا کر اپنی مسافرانہ موت کی آپ پیش گوئی کی تھی۔

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور

افسوس وہ پُر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صُور بن کر بلند ہوتی رہی ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی، وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بیتاب ہو ہو جاتا تھا اور دوں کو بیتاب کرتا تھا، دریغا کہ قیامت تک کے لئے ساکن ہوگیا، وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں، حسرتا کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی، وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوشنوا بلبل بن کر چہکتے تھے، ان کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے، وہ آتشیں زبان جو ہر رزم میں تیغِ برّاں بن کر چمکتی تھی، اس کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی، وہ پُر جوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہائے جاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ کے لئے تھم گیا، وہ بُر زور دست و بازو جو شب و روز کی خدمت گزاری اور نبرد آزمائی میں معروف تھے وہ اب ایسے تھکے کہ پھر نہ اٹھیں گے اور افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعداء کے نرغہ میں تنہا لڑ رہا تھا، آخر زخمی

سے مجبور ہو کر ایسا گر اکہ پھر کھڑا نہ ہو گا، الوداع! محمد علی! الوداع! والسلامُ الی یوم القیام۔

تو ملّت کا عزادار تھا، حق ہے کہ ساری ملت تیری عزادار ہو تو امت محمدیہ کا سوگوار تھا، فرض ہے کہ پوری امت محمدی تیرا سوگ کرے، تو نے دنیائے اسلام کا ماتم کیا تھا، سزاوار ہے کہ دنیائے اسلام تیرا ماتم کرے، ہندوستان کا ماتم دار طرابلس کا سوگوار، عراق کے لئے غم زدہ بلقان کے لئے اشک بار، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں، حجاز کا سوختہ غم اور بیت المقدس کیلئے وقفِ الم، اے ہند کے آوارہ گرد مسافر! تیرا حق سرزمین اسلام کے چپہ چپہ پر تھا، مناسب یہی تھا کہ تیرے لئے اوّلین قبلۂ اسلام کا سینہ پھٹ جائے اور تو اس میں سما جائے۔

وہ مشرق کی زمین میں پیدا ہوا، لیکن مغرب کی آب و ہوا میں نشو ونما پائی، مشرق کی مٹی سے جنم لیا، لیکن مغرب کے ہتھیاروں سے اس نے اپنا جسم سجایا، اس کا دماغ مغربی، مگر دل مشرقی تھا، وہ مشرق کی حمایت میں بارہا مغرب سے مغرب کے ہتھیاروں سے لڑا اور اس نے اس کا لوہا مانا، وہ مشرق کا آفتاب تھا، یہ آفتاب بھی اگر مشرق میں طلوع ہو کر مغرب میں ڈوبا تو دنیا کا کوئی نیا واقعہ نہ ہوا اور اسی لئے حق تھا کہ مشرق و مغرب کا متحدہ مرکز (بیت المقدس) اس کا مدفن بنے، اے مشرق و مغرب کے مالک! تو اپنی رضا مندیوں کے پھول سے اس کا دامن بھر دے۔

محمد علی کے کارناموں میں اس کی غزل خوانی کوئی بڑا درجہ نہیں رکھتی، لیکن جس طرح اس کی آخری پیش گوئی کی صداقت کو دنیا نے دیکھا اور تسلیم کیا کہ وہ آزاد غلام ہندوستان کو واپس نہیں آیا، اس کے مرنے پر معلوم ہوا کہ اس نے زنداں خانہ میں بیٹھ کر اپنے جن واردات کو نظم کیا تھا، وہ سرتاسر صداقت تھے اور پیش گوئیوں کی عجیب و غریب مثالیں، اس نے کہا تھا۔

اللہ ہی کے رستہ میں جو موت آئے تو اچھا
اکسیر یہی ایک دعا میرے لئے ہے

محمد علی! مبارک کہ یہ تیری پُرتاثیر دُعا، اکسیر بنی اور تیرے حق میں قبول ہوئی۔

مولانا محمد علی کا ماتم جس طرح دنیا میں ہوا، مشرق و مغرب میں ہوا، یورپ اور ہندوستان میں ہوا، وہ شاید ہی کسی کے لئے ہوا ہو، صاحب دل شاعر کی اس پیش گوئی کی صداقت سے آج کس کو انکار ہے۔

"ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لئے ہے"

مرحوم کو میں نے سب سے پہلے ۱۹۱۳ء میں کلکتہ میں الہلال کے دفتر میں دیکھا، یہ وہ وقت تھا جب کامریڈ اور کامریڈ کے ایڈیٹر کے شباب کی بہار تھی، کامریڈ کلکتہ سے دہلی جا چکا تھا، اس زمانہ میں طرابلس الغرب کے بعد بلقان کی جنگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔ مرحوم نے ترکوں کے ایک پمفلٹ "مقدونیہ آؤ اور میری مدد کرو" کو کامریڈ میں چھاپا تھا۔ اس پر دلی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس کو قابل ضبطی قرار دیا، اہل قانون کا مشورہ ہوا کہ کلکتہ ہائیکورٹ میں جو نسبتہً آزاد ہے، اس حکم کے خلاف مقدمہ چلایا جائے، اس سلسلہ میں مرحوم کلکتہ آئے تھے اور دفتر الہلال میں بھی آئے، اس وقت میں الہلال کے اسٹاف میں تھا، دیکھا، بالکل پورے صاحب، کوٹ، پینٹ، بوٹ، نکٹائی، داڑھی صاف، بڑی بڑی اٹھی ہوئی مونچھیں، سر پر ترکی ٹوپی، لمبا قد، گداز بدن، بھرا ہوا جسم، خندہ جبیں۔

مئی ۱۹۱۴ء میں دارالعلوم ندوہ کے طلبہ کی مشہور اسٹرائک کے سلسلہ میں دہلی میں محمد علی مرحوم سے بار بار ملنا پڑا، اس وقت معلوم ہوا کہ ایک سال پہلے جس سے ملنے میں مجھے تامل ہو رہا تھا وہ کیسا زندہ دل، یار باش اور بے تکلف انسان تھا۔ ۱۹۱۶ء میں وہ نظر بند ہو گئے، ۱۹۱۷ء سے جب وہ چھنڈواڑہ میں نظر بند تھے اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا اور معارف میں اُن کی غزلیں چھپنے لگیں۔ اخیر مارچ ۱۹۱۸ء میں ندوۃ العلماء کا اجلاس ناگپور میں تھا، میں شریک تھا، وہیں سر راہ ایک گم نام لیکن ہمہ تن راز سفیر نے علیحدہ لے جا کر نظر بندوں کا پیام سُنایا، یہ وقت بڑا ہی سخت تھا، جس کو آج قیاس نہیں

کیا جاسکتا۔ بہرحال میں اور برادرم مولوی مسعود علی صاحب ندوی نے بڑی احتیاط سے چھنڈواڑہ کا رُخ کیا، صبح کو اس مسجد میں پہنچ کر جس میں یہ نظر بند نماز پڑھتے تھے جا کر ان کو ڈھونڈھا تو نشان نہ پایا، مسجد کے مکتب میں کچھ لڑکے تھے، ان سے پوچھا انہوں نے پتہ دیا تو ان کو لے کر ان کے بنگلہ تک پہنچے، دیکھ کر دونوں بھائی نہال ہو گئے۔ گلے سے لگایا، ہاتھ چُومے، منہ چُوما، بلائیں لیں، غرض ہر انداز کا پیار کیا، دونوں صاحبوں کی زبان پر اس وقت یا قرآن شریف کی آیتیں تھیں، یا اقبال کی مثنوی کے شعر اور چق مق، چقماق، چق چق یعنی گویا ترکی زبان بول رہے تھے اور ترکوں کے اعلانِ جنگ کے بعد افغانی سرحد سے اُن کے ہندوستان میں داخلہ کی پیشوائی کے یہ الفاظ تھے، شوکت صاحب نے مولوی مسعود علی صاحب سے کہا کہ میرے لئے ایک سپید گھوڑا تیار رکھنا، کیسا زمانہ تھا، رات کو مسجد میں میری ایک مختصر تقریر ہوئی، اس متن کی شرح میں محمد علی مرحوم نے ایک لمبی تقریر کی۔

اُس زمانہ میں اُن کو کسی مہمان کو اپنے ہاں شب باش ہونے کی اجازت نہ تھی، اس لئے دن تو ان کے پاس گزارا، رات کہیں اور بسر ہوئی، تعلقات اب اور زیادہ گہرے ہوتے گئے، یہاں تک دسمبر ۱۹۱۹ء میں وہ چھوٹے اور مجلسِ خلافت منعقدہ امرتسر کی طرف سے یورپ کے وفد خلافت کی تجویز ہوئی، جس کا ایک ممبر مجھے بنایا گیا، امرتسر سے لوٹ کر وہ رامپور آئے تو میں ان کے بلاوے پر وہیں گیا، چنانچہ رامپور سے بریلی تک نواب صاحب کی جوڑی پر ہم لوگ آئے اور وہاں سے دہلی، دہلی کے اس عظیم الشان جلوس میں جس کی مثال شاید ہی کسی قومی استقبال میں دیکھی گئی ہو میں ان کے ساتھ تھا، اس کے بعد فروری ۱۹۲۰ء میں جب خلافت کا وفد یورپ کی جانب روانہ ہوا، تو خاکسار کو مسلسل آٹھ نو مہینوں تک ان کے ساتھ یکجا رہنے کا اتفاق ہوا اور جانبین میں یہ تعلق خاطر مؤتمر اسلامی تک جو ۱۹۲۶ء میں ہوا قائم رہا، لیکن حجاز اور مؤتمر کے مسائل

میں میرا اُن کا اتفاق نبھ نہ سکا اور خاکسار کو واپسی کے بعد سیاسیات سے قطع نظر کرنا پڑا، پھر انہوں نے کئی دفعہ یاد کیا، مگر سیاسیات سے علیحدگی کے بعد علمی مشاغل نے پھر قریب نہ ہونے دیا، تاہم ان کی محبّت اور ان کی قدر اور انکی خوبیاں دل میں بدستور پیوست ہیں۔

شعبان ۱۳۴۹ھ

جنوری ۱۹۳۱ء

مسٹر صلاح الدین خدا بخش

بعض اتفاقات بھی عجیب ہوتے ہیں، پچھلے رسالہ میں مسٹر صلاح الدین خدا بخش (جن کو اب مرحوم کہنا پڑتا ہے) کی بعض تحریروں کا گلہ کیا گیا تھا۔ ابھی وہ رسالہ چھپ کر تیار ہی ہوا تھا کہ کلکتہ سے اُن کی اچانک وفات کی خبر آئی، اللہ تعالیٰ اُن پر رحم فرمائے اور اپنی مغفرت سے سرفراز کرے، ان کے قلم سے گو ایسی باتیں مستشرقین یورپ کی ترجمانی میں اکثر نکلتی رہیں، تاہم انکی ایسی پُرجوش مخالفت قوم میں پہلے کبھی نہیں ہوئی جیسی اس دفعہ ہوئی اور اس کے اثر کے سامنے ان کو مجبوراً مسلم آوٹ لک لاہور میں اپنا معذرت نامہ شائع کرنا پڑا، جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی گہری عقیدت اور مستشرقانہ الزامات کی بے حقیقی کا اعتراف اور ان کے جوابات کے لئے اپنی بعض تصنیفات کا حوالہ درج تھا۔ کس کو خبر تھی کہ ان کا یہ معذرت نامہ حقیقت میں ان کی پوری عمر کا آخری توبہ نامہ ثابت ہوگا، لیکن حسن خاتمہ کی توفیق دینے والے کی حکمتوں اور مصلحتوں کو کون سمجھ سکتا ہے؟

بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

مرحوم خدا بخش خان سابق چیف جسٹس عدالت عالیہ حیدرآباد دکن اور بانی کتب خانۂ مشرقی بانکی پور کے فرزند ارجمند تھے، علم کی محبت باپ سے ورثہ میں پائی تھی، بیرسٹر تھے، کلکتہ میں پریکٹس کرتے تھے، جرمن زبان سے جرمن مستشرقین کی کتابوں اور مضمونوں کے ترجمے انگریزی میں کرتے رہتے تھے، اب ان کی کتابوں میں اسلام کے متعلق جو کچھ بھلی بُری باتیں ہوتی تھیں وہ ان کو اسی طرح رہنے دیتے تھے، اس لئے کبھی کبھی ان میں نہایت زہریلا مواد ملا ہوتا تھا، شعروشاعری سے بھی دلچسپی تھی۔

ربیع الثانی ۱۳۵۰ھ، ستمبر ۱۹۳۱ء

مولانا عبدالماجد بدایونی

افسوس ہے کہ اس سال کا خاتمہ بھی ماتم پر ہوتا ہے، خطیب الامت مولانا عبدالماجد بدایونی رحمۃ اللہ علیہ کا ناگہانی سانحۂ ارتحال ہمارے لئے ذاتی اور قومی دونوں حیثیتوں سے وہ غم ہے جو بھلائے نہیں بھولتا۔

۱۴ر دسمبر ۱۹۳۱ء کی نصف شب کو یہ واقعہ لکھنؤ صدر میں پیش آیا تو میں وہاں اس صبح کو موجود تھا، ۸ بجے صبح کو خبر ہوئی جب ۹ بجے کے بعد وہاں پہنچا تو مرحوم کی زندہ رُوح خدا کے پاس اور مردہ لاش بدایوں کو منتقل ہو چکی تھی۔

مولانا عبدالماجد بدایونی کون تھے؟ لکھنے والے ان کے محامد و اوصاف مضمون میں لکھیں گے اور بیان کرنے والے گھنٹوں بیان کریں گے، لیکن اس سارے دفتر کو صرف ایک لفظ میں اگر ادا کرنا چاہیں تو سمجھ سکتے کہ وہ ہستی جو سرتاپا محبت تھی، خدا سے محبت، رسول سے محبت، آل رسول سے محبت، اکابر سے محبت، دوستوں سے محبت، کارکنوں سے محبت، عزیزوں سے محبت۔

حضرت علماء کے طبقہ میں ان کی ذات ہر حیثیت سے قابل فخر تھی، ان تمام لوگوں پر جنہوں نے طرابلس کے زمانہ سے اسلامی جدوجہد میں شرکت کی، ان بیس برسوں میں مختلف دَور گزرے، یعنی کچھ آرام و سکون، پھر کچھ سعی و محنت، کچھ عزلت گزینی اور پھر ہنگامہ آرائی، کچھ توقف، پھر تیز رفتاری، اس طرح ان کی زندگی کے ایام وقتاً فوقتاً گزرتے رہے، مگر جماعت علماء میں یہی ایک ہستی تھی جس کی زندگی کے ایک لمحہ کو بھی اس وقت سے چین نصیب

نہ ہوا، ہر وقت وہر نفس ان کو کام کی ایک دُھن لگی ہوئی تھی، جس کے پیچھے ان کا آرام چین خانگی سکون، اہل وعیال اور جان ومال ہر چیز قربان تھی، یہ بھی سماں گزرا ہے کہ ان کے گھر میں کفن دفن کا سامان ہو رہا ہے اور وہ مردہ قوم کی مسیحائی کے لئے کانپور ولکھنؤ کے تگ ودَو میں مصروف ہیں، خدام کعبہ، طرابلس، بلقان، کانپور، خلافت، کانگریس، تبلیغ، تنظیم، مسلم کانفرنس، یہ تمام وہ مجالس ہیں جو اُن کی خدمات سے گراں بار ہیں، ان مشغولیتوں میں اپنے مدرسہ "شمس العلوم" کو جس کی خود انہوں نے بنیاد ڈالی تھی، ناتمام چھوڑا، اس کے لئے کتب خانہ کی عمارت بنوائی، کتابیں جمع کیں، وہ بھی نامکمل رہا، یہاں تک کہ ان کی منزلیں دفعتہً پوری ہو گئیں۔

مرحوم کی قوتِ خطابت غیر معمولی تھی، ان کی تقریر جذبات اسلامی کی ترجمان ہوتی تھی، ان کی شاعری وسخنوری گو محنتی تھی، مگر شاندار تھی، ان کی عالمانہ شان اور معقول ومنقول سے پرانی دل آویزی اس عالم میں بھی نمایاں تھی، اُن کا دراز قد، بڑی داڑھی، سیاہ عمامہ، بڑا کرتہ، اس پر جبہ گلے میں بڑا کالا رومال یا چادر، مست چال جھوم جھوم کر متانت سے چلنا، اب تک نگاہوں کے سامنے ان کی تصویر بنا کر کھڑی کر دیتا ہے۔

مرحوم نے عراق کا سفر اپنے بزرگوں کے ساتھ کیا تھا اور حجاز ومصر کا سفر میرے ساتھ ۱۹۲۴ء میں کیا، بے گوشش تو وہ تھے ہی، مگر ان جیسا بے زبان رفیقِ سفر ملنا بھی ممکن نہیں۔

وہ بہت کچھ تھے، مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے ہر دوست، ہر ہمعصر ہر رفیق کے محبوب وحبیب تھے، اُن کا ہر ملنے والا یہی سمجھتا تھا کہ وہ اسی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں، ان کی ہستی محبت کا آئینہ خانہ تھی، ہر آئینۂ دل میں وہی ہر طرف چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔

سال کا آغاز تھا کہ میں نے اپنے رفیق یورپ (محمد علی مرحوم) کا ماتم کیا تھا، آج

سال کا اختتام ہے کہ اپنے رفیق حجاز و مصر کا ماتم کرتا ہوں، رفیقو! رخصت، اب تم وہاں ہو جہاں تمہارے رفیق ملائکۃ اللہ اور عباد الرحمٰن ہیں اور سب سے بڑھ کر وہ رفیق اعلیٰ ہے جس کی رفاقت سب رفاقتوں سے بڑھ کر ہے، عربی کے یہ چند شعر بے اختیار نظم ہو گئے۔

رحمۃ اللہ علیک　　　خیر اخلاف الکرام

نم قریر العین فی قبرک الی یوم القیام

کنت فی الدنیا سلاماً　　　صرت فی دار السلام

اسکت الموت خطیب القوم حسان الکلام

بزرگوں کے بہترین خلف　　　تم پر اللہ کی رحمت ہو،

قیامت تک اپنی قبر میں　　　میٹھی نیند سوتے رہو،

تم دنیا میں باعث سلامتی تھے اب تم دار السلام میں پہنچ گئے،

افسوس، موت نے قوم کے خطیب اور حسان زمانہ کو خاموش کر دیا،

شعبان ۱۳۵۰ھ

جنوری ۱۹۳۲ء

سر علی امام

افسوس ہے کہ گزشتہ ماہ اکتوبر کے خاتمہ پر نئی تعلیم کے ایک بہترین نمونہ کا خاتمہ ہوگیا۔

سر سید علی امام صوبہ بہار کے مشہور خاندان کے سپوت نے اس عالم فانی کو الوداع کہا، مرحوم نے ارادہ کیا تھا کہ وہ امسال سفر حج اختیار کریں گے، مگر افسوس کہ اس سفر سے پہلے ان کو سفر آخرت پیش آگیا، مرحوم ایک کامیاب بیرسٹر کے علاوہ ہماری زبان کے مشہور مقرر اور اپنے زمانۂ عمل میں اسلامی سیاسیات کے بساط کے نامور مہرہ تھے، وہ یکسر نئی تعلیم، نئے تمدن اور نئے خیالات کے باوجود اپنے مشرقی علوم و تمدن سے، اپنے خاندانی اثر سے بہت کچھ واقف تھے، غالباً ۱۹۰۸ء میں مسلم لیگ منعقدہ امرتسر کی ایک ہی کامیاب صدارتی تقریر تھی، جس نے ان کو مسلمانوں کا سیاسی رہنما بنادیا، ہنگامہ کانپور کے وقت میں وائسرائے کی مجلس وزارت کے رکن رکین تھے، اس ہنگامہ کو فرو کرنے اور مسلم یونیورسٹی کی قانونی ترتیب میں غالباً ان کا بڑا حصہ تھا، حیدرآباد کی صدارت عظمیٰ کے زمانہ میں اس اسلامی ریاست کی خدمت کا بڑا خیال رکھتے تھے، خدا مغفرت فرمائے[1]۔

رجب ۱۳۵۱ھ، نومبر ۱۹۳۲ء

---

[1] ان کی وفات کے کچھ دن بعد صوبہ بہار و اڑیسہ کے سرکاری عربی مدارس کی ترتیب نصاب کے سلسلہ میں رانچی کے سفر کا اتفاق ہوا، شہر سے باہر سر علی امام کا وہ ناتمام قصر واقع ہے جس کے سربفلک ستونوں، مناروں اور سقف کی زبانِ حال، انسانی آرزوؤں کی ناتمامی کی داستان سنا رہی ہے، اس عظیم الشان قصر کا دامن قسم قسم کے نادر درختوں سے بھرا ہے اور ہائے افسوس کہ اس عظیم الشان قصر و باغ کے ایک دور افتادہ گوشہ میں پھوس کے ایک چھپر کے نیچے اس کا اولوالعزم بانی دو گز مٹی کے فرش پر تنہا پڑا سو رہا ہے، زبان نے اس فرش خاک پر سونے والے کے لئے دعائے مغفرت مانگی اور آنکھوں نے آنسوؤں کے چند پھول تربت پر چڑھائے اور زبانِ حال نے پڑھا۔ ؏ آئے تھے دنیا میں اس دن کے لئے۔

جنید نعمانی

یہ خبر نہایت حسرت و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے چھوٹے بھائی مولوی جنید صاحب نعمانی سب جج کانپور نے دو سال کی صحت و علالت کی کشمکش کے بعد ۱۲ اپریل ۱۹۳۳ء کو دہلی میں وفات پائی، مولانا مرحوم کے صرف یہی ایک بھائی تھے جو اُن کی وفات کے بعد زندہ تھے، آخر انہوں نے بھی اس دنیا کو الوداع کہا، یہی وہ بھائی تھے جن کی نسبت مولانا نے اپنے بھائی مولوی محمد اسحاق صاحب مرحوم الہ آباد ہائی کورٹ کے پُر درد نوحہ میں ۱۹۱۴ء میں یہ فرمایا تھا۔

اے خدا شبلی دلِ خستہ بایں موئے سپید — لے کے آیا ترے درگہِ عالی میں امید
مرنے والے کو نجاتِ ابدی کی ہو نوید — خوش و خرم رہے چھوٹا مرا بھائی یہ جنید

افسوس کہ یہ بھائی بھی اپنے بڑے بھائی کے بعد اٹھارہ برس سے زیادہ خوش و خرم نہ رہ سکا، دعا ہے کہ مرحوم کو اب آخرت کی ابدی خوشی و خرمی حاصل ہو۔

محرم ۱۳۵۲ھ
مئی ۱۹۳۳ء

مولانا طباطبائی لکھنوی

نظام دکن کی مجلس میں فرماں روایان اودھ کی بزم دوشیں کا ایک ٹمٹماتا چراغ مدت سے جل رہا تھا، افسوس کہ وہ ۳؍مئی ۱۹۳۳ء کی شب کو چمنستانِ روزگار کی بیاسی بہاریں دیکھ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا، مولانا حیدر علی نظم طباطبائی لکھنوی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ بہادر نے بیاسی سال کی عمر میں وفات پائی، لکھنؤ وطن تھا، اخیر شاہ اودھ کے دربار کی خزاں دیکھی تھی، مٹیا برج کلکتہ کی شاعرانہ مجلسوں کی یادگار تھے، علوم عربیہ کے علاوہ شعر وسخن کے فنون پر کامل عبور رکھتے تھے، اس عمر کے باوجود اخیر تک علمی کاموں میں مصروف ومنہمک رہتے، شرح غالب اور بعض رسائل ومقالات یادگار ہیں، اللہ تعالیٰ کرم فرمائے۔
حیدرآباد دکن کے سفر میں اخیر وقت میں اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔

ربیع الاول ۱۳۵۲ھ

جولائی ۱۹۳۳ء

مولوی محبوب عالم

اس ماہ کے شذرات کا صفحہ وفات نامہ ہوا چاہتا ہے، مگر احسان فراموشی ہوگی اگر ملک کے سب سے بوڑھے صحیفہ نگار مولوی محبوب عالم اڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کا ماتم نہ کیا جائے، ۲۸ رمئی کو انہوں نے اس دارِ فانی کو الوداع کہا، وہ اردو کے سب سے پہلے روزنامہ اخبار (پیسہ) کے اڈیٹر تھے، انہوں نے صرف اپنی محنت وکوشش سے سرمایہ حاصل کیا اور ملک میں تاریخ اور سیاحت ناموں کے پڑھنے کا ذوق پیدا کیا اور خود بھی یورپ اور ممالک اسلامیہ کے دو سفر کئے اور سیاحت نامے لکھے، مگر افسوس کہ اب ان کو وہ سفر پیش آیا جس کا سفر نامہ انسانوں کے ہاتھ نہیں، فرشتوں کے ہاتھ لکھتے ہیں، اس ان دیکھی منزل کے بوڑھے مسافر پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔

مرحوم نے ۷۴ برس کی عمر پائی۔

ربیع الاول ۱۳۵۲ھ

جولائی ۱۹۳۳ء

مولانا سیّد انور شاہؒ

دین و دانش کی دنیا کا مہر انور ۳؍ صفر ۱۳۵۲ھ (۲۹ مئی ۱۹۳۳ء) کی صبح کو دیوبند کی خاک میں ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا، یعنی مولانا سید انور شاہ صاحب جانشین شیخ الہند صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند نے دو برس کی علالت لواسیر اور ضعف و نقاہت کے بعد ۵۹ برس کی عمر میں وفات پائی، مرحوم کا وطن گو کشمیر تھا، مگر تعلیم سے فراغت کے بعد ایک مدت تک مدینۂ منورہ میں اقامت کی، پھر واپس آکر استاد کی خواہش اور اصرار سے دارالعلوم کی صدارت کی ذمہ داری قبول فرمائی، اور جس کو حضرت شیخ کے زمانۂ جنگ میں ہجرت کے بعد سے ۱۹۲۹ء تک اس طرح انجام دیا کہ چین سے لے کر روم تک اُن کے فیضان کا سیلاب موجیں لیتا رہا اور ہند اور بیرونِ ہند کے سینکڑوں تشنگان علم نے اس سے اپنی پیاس بجھائی۔

مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے، ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے، وہ وسعت نظر، قوتِ حافظہ اور کثرتِ حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے، علومِ حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے، اللہ تعالیٰ اپنی نوازشوں کی جنت میں ان کا مقام اعلیٰ کرے کہ مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قال اللہ و قال الرسول کا نعرہ بلند رکھا۔

ہم کو سب سے پہلے ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء میں دیوبند میں دیکھا، جب وہ اور مولانا حسین احمد صاحب مدنی سرزمینِ عرب سے تازہ وارد ہند تھے، مدرسۂ دیوبند میں میری حاضری

کی تقریب سے طلبا اور مدرسین کا ایک جلسہ ترتیب پایا تھا جس میں انہوں نے میری عربی تقریر کے جواب میں تقریر فرمائی تھی، پھر جب جب حاضری ہوتی رہی یا خلافت اور جمعیۃ کے جلسوں میں بار بار ملاقاتیں ہوتی رہیں، ۱۹۲۹ء میں جب وہ پشاور کے اجلاس جمعیۃ العلماء کے صدر تھے، میں بھی حاضر تھا، حضرت مرحوم سے ملاقاتوں میں علمی استفادہ کے موقعے ملتے رہے، ہر سوال کے وقت ان کی خندہ پیشانی سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ سوال سے خوش ہوئے، اہل کمال کی یہ بڑی پہچان ہے، کیونکہ وہ مشکلات سے عبور کر چکتا ہے، اب جب اس سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ شبہ کے اصل منشاء کو سمجھ جاتا ہے اور جواب دے کر خوش ہوتا ہے۔

مرحوم معلومات کے دریا، حافظہ کے بادشاہ اور وسعت علمی کی نادر مثال تھے ان کو زندہ کتب خانہ کہنا بجا ہے، شاید ہی کوئی کتاب مطبوعہ ہو یا قلمی، ان کے مطالعہ سے بچی ہو، میری تصنیفات میں سے ارض القرآن اُن تک پہنچی تھی اور اس پر اپنی رضا ظاہر فرمائی، مرحوم آخری ملاقاتوں میں زیادہ تر قدیم عربی نصاب کی اصلاح پر مجھ سے گفتگو فرمایا کرتے تھے۔

ربیع الاول ۱۳۵۲ھ

جولائی ۱۹۳۳ء

میر ناصر علی مُدیر "صلائے عام" دہلی

اُردو کے ایک اور کہنہ صاحب قلم استاد کی وفات پر دو آنسو بہانا ہے، ایک زمانہ تھا کہ اس کی انشار پردازی اور نکتہ نوازی پر ملک کے اچھے اچھے اہلِ قلم رشک کرتے تھے مگر افسوس کہ نوجوانوں نے اس کو بھلا دیا، یہ خان بہادر میر ناصر علی، مدیر صلائے عام دہلی تھے، مرحوم نے عمر کی چھیاسی بہاریں دیکھ کر ۱۲ر جون ۱۹۳۳ء کو دہلی میں وفات پائی، ان کے قلم میں جو نزاکت اور ان کی انشار میں جو لطافت تھی وہ اب بھی ہماری زبان کا سرمایہ ہے مگر افسوس ہے کہ آخر میں وہ یہ ساری جگر کاوی اُن ناقدر شناس انگریز افسروں کے لئے کرتے تھے جو ہندوستانی زبان کو امتحان کے لئے سیکھتے تھے اور اسی لئے ان کی یہ ادبی کوششیں عام نگاہوں سے چھپ کر رہ گئی تھیں، خدا اپنے دربار میں ہمارے بوڑھے صاحب قلم کی آبرو رکھے۔

ربیع الاول ۱۳۵۲ھ

جولائی ۱۹۳۳ء

سر فخر الدین

۱۹ جون ۱۹۳۳ء کی صبح کو مشرقی ہند کے مرکزی شہر پٹنہ کے جسم سے روح نے مفارقت کی، سر فخر الدین وزیر تعلیمات جو وہاں کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز مسلمان تھے، ۶۵ برس کی عمر میں وفات پائی، ان چند مہینوں کے اندر اس شہر کے وہ پُرانے نئے تعلیمیافتہ اصحاب جو وہاں کی مجلس کی شمع بزم افروز تھے، ایک ایک کر کے رخصت ہوگئے، سر علی امام کی وفات پر سیاسی تدبر و قابلیت کا ماتم ہوا، حسن امام کے مرنے پر قانون دانی کا نوحہ پڑھا گیا، لیکن سر فخر الدین کی رحلت پر انسانیت اور اس کی شرافت کا ماتم ہے۔

مرحوم نیک دل، متواضع، فیاض، مشرقیت پسند اور دیندار تھے، اسی لئے انکی وفات پر پورے صوبہ نے ماتم کیا، شہر کے سب سے بڑے میدان میں پورے شہر نے نماز جنازہ پڑھی اور صوبہ کے سب سے مقدس مقام پھلواری شریف میں اپنے مرشد کے مقبرہ میں جگہ پائی، اللہ تعالیٰ مرحوم کی رُوح پر اپنی مغفرت کے پھول برسائے۔

ربیع الاول ۱۳۵۲ھ

جولائی ۱۹۳۳ء

خواجہ کمال الدین

عیسوی سال کے خاتمہ پر ۲۸ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو عیسوی مذہب کے سب سے بڑے نقاد اور عیسوی ممالک میں اسلام کے مشہور مبلغ خواجہ کمال الدین نے افسوس ہے کہ وفات پائی، وہ کئی برس سے سل کے مرض میں مبتلا تھے اور اس حالت میں بھی وہ تصنیف وتالیف میں ہمیشہ مصروف رہے، احمدی جماعت میں ہمارے نزدیک وہ عام مسلمانوں سے سب سے زیادہ قریب تھے، اسی لئے اُن کے مشن کا بار اٹھانے میں عام مسلمان اور امراء نے بھی شرکت کی تھی اور شاید یہ راز نہ ہو کہ مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم اور مولانا شبلی مرحوم نے ان کی امدادی تحریکوں میں سب سے زیادہ دلچسپی لی، مولانا مرحوم نے ایک دفعہ علماء کے بالمقابل نوجوان تعلیمیافتوں میں سے خواجہ صاحب کے عزم تبلیغ کو سامنے رکھ کر یہ شعر خود انہیں کے خط میں لکھا تھا۔

کامل اس فرقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

گو ہم کو خواجہ صاحب کے بہت سے خیالات اور تاویلات سے اتفاق نہیں تاہم یہ کہنا اظہار واقعہ ہے کہ انہوں نے ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک اپنی پوری بیس برس کی زندگی اسلام کی تبلیغ اور اس کے محاسن کی اشاعت اور یورپ میں اسلامی لٹریچر کی اشاعت ہی میں صرف کی اور نیز یہ کہ اُن کی تصنیفات کے بڑے حصہ کا موضوع "احمدیت" نہیں "محمدیت" ہے، افسوس کہ ان کی موت سے دنیا کی مذہبی بزم میں ایک اہم جگہ خالی ہوگئی...

اللہ تعالیٰ اُن کے ان اعمالِ صالحہ کے صدقہ میں ان کو اپنی مغفرت سے نوازے اور ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔

میں نے ان کو سب سے پہلے ندوہ کے اس اجلاس لکھنؤ ۱۹۱۲ء میں دیکھا جس میں مصر کے عالم سید رشید رضا صدر تھے اور سب سے پہلی ملاقات اسی ۱۹۱۲ء میں بنگلور کی ایک تعلیمی کانفرنس میں ہوئی، جس میں ایک مکان میں کئی روز ایک جگہ قیام رہا، پھر مولانا شبلی کے تعلق سے یورپ کے تبلیغی اور مذہبی تحریکات کے سلسلہ میں خط و کتابت ہوتی رہی انہیں کی دعوت پر ان کے مسلم ریویو میں کئی مضمون لکھے،

رمضان ۱۳۵۱ھ

جنوری ۱۹۳۳ء

حافظ احمد علیخاں صاحب شوق

یہ خبر افسوس کے ساتھ سُنی جائے گی کہ رامپور کے مشہور علم دوست فاضل اور وہاں کے مشہور شاہی کتب خانہ کے سابق ناظم اور متعدد کتابوں کے مترجم اور مصنف حافظ احمد علیخاں صاحب شوق نے اوائل رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ میں تقریباً پینسٹھ اور ستر کی عمر کے درمیان میں انتقال فرمایا، مرحوم نہایت بااخلاق، بامروّت، علم دوست اور صاحب کمال تھے، قلمی اور نادر کتابوں کے خاص ماہر تھے، معارف کے ناظرین کبھی کبھی ان کی تحقیقات سے مستفید ہوا کرتے تھے، ان کی سب سے بہتر کتاب تذکرۂ کاملین رامپور ہے۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے۔

رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ

جنوری ۱۹۳۴ء

مولوی غلام محمد شملوی

یہ خبر نہایت رنج و افسوس کے ساتھ درج کی جاتی ہے کہ ندوۃ العلماء کے مشہور سفیر و وکیل مولانا غلام محمد صاحب شملوی نے ۲۹ مارچ ۱۹۳۴ء کو وفات پائی، ندوۃ العلماء کے مقاصد کی اشاعت اور اس کے لئے مالی امدادوں اور چندوں کے حصول میں ان کی کوششیں بہت کامیاب تھیں، وہ جوانی میں تارک الدنیا فقیر ہوگئے تھے اور جنگلوں میں رہتے تھے، ندوۃ العلماء کے ابتدائی اجلاسوں کے رُوحانی اثرات نے ان کو دوبارہ دنیا میں داخل کردیا اور ندوۃ العلماء کی خدمت کا ایسا ولولہ ان میں پیدا کیا جو مرتے دم تک سرد نہیں ہوا۔

وہ بڑے پُرجوش مقرر، روشن خیال عالم اور صاحب عزم محنتی تھے، ندوہ کی خدمت میں انہوں نے ہندوستان کی گلی گلی کی خاک چھانی اور ہر چھوٹے بڑے سے ملے، مدت سے اُن کی صحت خراب تھی، وفات کے وقت ان کی عمر ستّر کے قریب ہوگی، تاہم ان میں ایسی ہمت تھی جو جوانوں کو شرماتی تھی، خدا مغفرت فرمائے۔

ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ

اپریل ۱۹۳۴ء

حاجی سر رحیم بخش مرحوم

مولوی حاجی سر رحیم بخش مرحوم نے اس مہینہ ۳ مئی ۱۹۳۵ء کو اسّی برس کے قریب عمر پا کر اپنے وطن ٹھسکہ میرانجی ضلع کرنال میں وفات پائی، انہوں نے اسکول کے ایک معمولی مدرس عربی و فارسی کی حیثیت سے ملازمت شروع کی اور ترقی کرکے چیفس کالج لاہور کے بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے، یہیں موجودہ ہز ہائنس نواب صاحب بھاولپور کے والد مرحوم زیر تعلیم تھے اور ان کی نگرانی میں تھے، ممدوح الشان جب مسند نشین ہوئے تو اپنے لائق اتالیق کی دیانت و محنت و جفاکشی کو دیکھ کر اپنی سرکار میں ایک اعلیٰ عہدہ پر رکھ لیا، یہاں بھی انہوں نے خوبی سے کام انجام دیا، جس کی وجہ سے سرکار برطانیہ اور سرکار بھاولپور دونوں کو ان پر برابر کا اعتبار ہوگیا، اس لئے نواب ممدوح کی وفات اور نواب حال کی نابالغی میں وہ مجلس نیابت کے صدر مقرر ہوئے اور بڑی عزت و ہردلعزیزی حاصل کی، اس کے بعد ریاست سے پنشن پائی اور قومی و ملکی کاموں میں مصروف رہنے لگے۔

غربت سے امارت اور معمولی درجہ سے اعلیٰ رتبہ تک ترقی کی مثالیں دنیا میں کم نہیں، لیکن ایسی مثالیں کہ ادنیٰ سے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچنے کے بعد بھی اس کو اپنی پہلی حالت فراموش نہ ہو اور اس نعمت کے شکرانے میں دینی و قومی خدمات میں انہماکِ زندگی کا فرض قرار پاجائے، بہت کم ہیں، مرحوم کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی، ندوۃ العلماء کو بھاولپور میں جو کامیابی ہوئی، وہ تمامتر مرحوم ہی کے اخلاص کا نتیجہ تھی، ندوۃ العلماء کے ارکان نے ان کی ان خدمات

کی قدر پہچان کر اُن کو سرپرست وحامی ندوۃ العلمار کا منصب دیا تھا، اخیر زمانہ میں انہوں نے تبلیغی کاموں میں دلچسپی لی اور اپنی دولت کا اچھا خاصہ حصّہ نیک کاموں میں خرچ کیا' ان کی زندگی سادہ تھی اور ہمیشہ سادہ رہی، مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے، اس لئے وہ علمار دیوبندؔ کا بھی ادب کرتے تھے، مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر بھی تھے، اس لئے وہاں بھی ان کو خدمت کا موقع ملا، دعار ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال حسنہ کو قبول فرما کر ان کو اپنی مغفرت کی عزت سے نوازے۔

صفر ۱۳۵۴ھ

جون ۱۹۳۵ء

شاہ سلیمان صاحب پھلواروی

ہندوستان کے مشہور پرانے عالم وواعظ وخطیب مولانا شاہ سلیمان صاحب قادری چشتی پھلواروی نے جن کے نغموں نے ہمارے ملک کے پورے طول وعرض کو کم ازکم نصف صدی تک پرشور رکھا تھا، وفات پائی، ۲۷ صفر ۱۳۵۴ھ کی تاریخ جمعہ کا دن اور صبح ۷ بجے کا وقت تھا کہ یہ طوطیِ خوشنوا ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا، پھلواری صوبہ بہار میں عظیم آباد پٹنہ سے ملحق ایک مردم خیز مشہور قصبہ ہے جہاں ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں بہت سے باکمال، اہل علم، علماء، صلحاء، مشائخ اور شعراء پیدا ہوئے، مرحوم بھی یہیں کے رہنے والے اور یہاں کے بزرگوں کے مستند ومعتبر خانوادہ کے چشم وچراغ تھے، ستہتر، اٹھتر برس کی عمر پائی، غالباً ۱۲۷۶ھ میں پیدا ہوئے۔

مرحوم کی جوانی کے عہد میں تین باکمالوں کے درس کی مسندیں ہندوستان میں بچھی تھیں، فرنگی محل لکھنؤ میں مولانا عبدالحیٔ صاحب، سہارنپور میں مولانا احمد علی صاحب اور دلی میں مولانا سید نذیر حسین صاحب کی، شاہ صاحب مرحوم نے فیض کے ان تینوں سرچشموں سے فائدہ اٹھایا پہلے فرنگی محل آئے اور یہاں سے فارغ ہوکر سہارنپور اور دہلی گئے، دلی کے قیام کا زمانہ جس کو ان کی تعلیم کا آخری عہد کہنا چاہیے، ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۸۰ء ہے۔
لکھنؤ کے قیام میں درسیات کے ختم کرنے کے بعد انہوں نے طب پڑھی اور اسی طبیب کی حیثیت سے انہوں نے دنیا میں اپنی زندگی کا آغاز کیا، چنانچہ شروع میں حکیم محمد سلیمان کہلائے اور اسی کا اثر تھا کہ شاعری میں جس کا چسکا ان کو بچپن سے تھا اور

لکھنؤ کی صحبت میں جس کا چٹخارہ اور بڑھ گیا تھا، اپنا تخلص حاذق رکھا تھا، وہ زیادہ تر اُردو اور عربی میں اور کمتر فارسی میں شعر کہتے تھے، غزلیں بھی کہتے تھے اور لکھنؤ کے مشاعروں میں پڑھتے بھی تھے، صوبہ بہار کے مشہور عالم شاعر شوق نیموی ان کے ہم درس وہم صحبت و ہم استاد تھے، شاہ صاحب مرحوم کی زبان سے ان کے اس عہد کے ایک دو شعر سُنے تھے۔

اس عہد کے نوجوان علماء نے جو زمانہ کے انقلاب سے متاثر اور قوم وملت کی تباہ حالی کے درد سے بے تاب ہوکر روشِ زمانہ کے مطابق کچھ کام کرنا چاہتے تھے، ندوۃ العلماء کے نام سے پہلے کانپور میں اور پھر لکھنؤ میں ایک انجمن کی بنیاد ڈالی، مولانا سید محمد علی صاحب، مولانا شبلی صاحب، مولانا عبدالحق صاحب حقانی، مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتح پوری، مولانا ابراہیم صاحب آروی، مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی وغیرہ اس جماعت کے ممتاز ارکان تھے، اسی انجمن کا پلیٹ فارم تھا جس میں شاہ صاحب مرحوم کی خطیبانہ قوتِ بیان وتسخیر قلوب کا شہرہ عام ہوا، ندوۃ العلماء کا کانپور سے لکھنؤ آنا اور وہاں دارالعلوم کی بنیاد پڑنا بھی شاہ صاحب ہی کی تحریک وتجویز کا نتیجہ ہے، ورنہ وہ کھینچ کر کب کا دہلی پہنچا ہوتا۔

ندوہ کی مجلسوں سے مرحوم کی خوش بیانیوں کی داستان اُڑ کر ملک کی انجمنوں اور مجلسوں اور کانفرنسوں میں عام ہوئی، سرسید مرحوم نے شاہ صاحب مرحوم کی وہ تقریر جو انہوں نے ندوہ کے ایک سالانہ جلسہ میں کی تھی، اپنے اخبار میں شاہ سلیمان کا "نیچریانہ وعظ" کی سُرخی سے چھاپی، سرسید کے بعد نواب محسن الملک مرحوم نے ان کو اپنی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں جو ان دنوں تعلیم یافتہ مسلمانوں کا واحد مجلسی مرکز تھا کھینچا، مرحوم کی خوش بیانی نے ان "نیچری مسلمانوں" کو بھی مسحور کیا، رنگون وغیرہ نواب صاحب کے ساتھ شاہ صاحب بھی کانفرنس کے کاموں میں شریک تھے اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے زمانہ تک شریک رہے۔

مرحوم وسیع النظر عالم، بذلہ سنج ادیب، خوش بیان خطیب، پُراثر واعظ، موقع شناس

مقرر اور بڑے بڑے بزرگوں کے حلقہ سے فیضیاب صوفی تھے، ان کو تاریخ کا شوق اور عربی نظم ونثر کا اچھا ذوق تھا، اچھے کتب خانوں اور کتابوں کی تلاش رہتی تھی اور اس حیثیت سے وہ اپنے ہمعصروں میں پورا امتیاز رکھتے تھے۔

وہ مذہب کے لحاظ سے وسیع المشرب تھے، وہ سب کچھ تھے اور سب کے ساتھ تھے،

باما شراب خوردو بہ زاہد نماز کرد

تاہم دو باتوں میں وہ نہایت سخت تھے، ایک تو اعتزال کے خیالوں سے بہت برہم ہوتے تھے اور دوسرے حضرت علی مرتضیٰ اور اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کی محبت و تعظیم میں بے حد غلو فرماتے تھے اور اس راہ میں جب جوش میں آتے تھے، تو بڑوں بڑوں پر ہاتھ صاف کر دیتے تھے۔ اس قسم کے اُن کے دوستانہ مناظروں کے کئی منظر میں نے اپنی طالب علمی میں دیکھے ہیں۔

ان کا خاندان صوفیہ کا مجمع تھا، تصوف کی گودوں میں پیدا ہوئے، پرورش پائی اور پروان چڑھے اور عمر بھر اسی رنگ میں رہے اور یہی رنگ اُن پر غالب تھا، قادری بھی تھے اور چشتی بھی تھے، جہاں اپنے گھر سے فیض پایا تھا، حاجی شاہ امداد اللہ صاحبؒ سے بھی نسبت رکھتے تھے، پنجاب، مدراس، شمالی بہار اور صوبہ متحدہ میں ان کے مریدوں کی بڑی تعداد تھی۔

ان کے وعظوں میں عجب اثر تھا، کبھی رُلاتے اور کبھی ہنساتے تھے ان کے سنجیدہ چٹکلے اور ظریفانہ نکتے لوگوں کو بے حد محظوظ کرتے تھے، ان کی آواز بہت بلند، سُریلی اور مؤثر تھی، ان کا لحن نہایت دل پذیر تھا، مثنوی خاص انداز سے پڑھتے تھے کہ سننے والے جھوم جھوم جاتے تھے، ان کے وعظوں سے ہر خیال اور ہر قماش کے لوگ یکساں دلچسپی رکھتے تھے، جاہل، عالم، مولوی مشائخ ڈاڑھی منڈے اور بزرگ ریش، نئے پرانے تعلیم یافتہ اور اہل علم سب لذت اندوز ہوتے تھے۔

میرے ساتھ مرحوم کے گوناگوں تعلقات تھے، مجھے اپنے عزیز سے کم نہیں سمجھتے تھے میرے والد مرحوم ان کے ہم پیر اور ان کے خسر کے مسترشد تھے، میرے بھائی مرحوم طب میں ان کے شاگرد تھے، میں نے بچپن میں پھلواری کے قیام کے زمانہ میں ان سے ابتدائی منطق کے دو چار سبق پڑھے تھے، وہ جب ۱۹۰۳ء میں ندوہ کے معتمد تعلیمات منتخب ہوئے تھے اور مستقل قیام ندوہ میں اختیار فرمایا تھا تو ان کی بزرگانہ عنایات اور حوصلہ افزائیوں نے میری علمی ترقیوں میں مدد دی، یاد ہے کہ اسی زمانہ میں نواب محسن الملک مرحوم دارالعلوم ندوہ کے معائنہ کے لئے تشریف لائے تھے، شاہ صاحب نے مجھے اور میرے ہم درس مولانا ظہور احمد صاحب وحشی شاہ جہاں پوری کو امتحاناً پیش فرمایا تھا، میں نے نواب صاحب کے خیر مقدم میں عربی میں ایک قصیدہ لکھا تھا، شاہ صاحب نے یہ کہہ کر مجھے پیش کیا کہ یہ میرے عزیز ہیں اور آپ کو قصیدہ سنائیں گے نواب صاحب نے مزاحاً فرمایا کہ یہ جب آپ کے عزیز ہیں تو میں ان کا امتحان نہیں لونگا کہ امتحان سے پہلے ہی ان پر ایمان لا چکا، شاہ صاحب نے فرمایا یہ میرے ہم نام بھی ہیں، نواب صاحب نے فرمایا تو اور بھی یہ امتحان سے بالاتر ہیں۔

میں نے اپنا قصیدہ پڑھا، جو افسوس ہے کہ اب موجود نہیں تو نواب صاحب نے فرمایا کہ میں تو اس پرانی ادب دانی کا قائل نہیں، عربی کا کوئی اخبار منگوائے اس کو یہ پڑھیں، تو البتہ، اس زمانہ میں اللواء اور المؤید عربی کے مشہور اخبار تھے، وہ منگوائے گئے اور میں نے ان کو پڑھا اور صحیح ترجمہ کیا، تو بے حد خوش ہوئے، شاہ صاحب بھی بے حد محظوظ ہوئے اور اس زمانہ کے اخبارات وکیل، وطن اور کرزن گزٹ میں نواب صاحب کے اس معائنہ کی جو کیفیت چھپوائی، اس میں میرا ذکر خاص طور سے فرمایا، یہ اخبارات میں میرا پہلا ذکر تھا ان کی اس تحریر میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "ملک وملت کی خدمت کے لئے انشاء اللہ صوبہ بہار ہر دور میں ایک سلیمان پیش کرتا رہے گا" رحمہ اللہ،

بات میں بات یاد آتی ہے، ندوہ کے ایک جلسہ میں جو لکھنؤ میں غالباً ۱۹۱۵ء میں تھا

چار سلیمان جمع ہو گئے تھے۔ قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری مصنف رحمۃ للعالمین، مولانا سلیمان اشرف صاحب بہاری (استاد دینیات مسلم یونیورسٹی) مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی اور خاکسار سلیمان، شاہ صاحب نے فرمایا کہ آج کل کئی کئی سلیمان پیدا ہو گئے ہیں، لیکن ان میں سلیمان بن داؤد میں ہوں، ع

بریاں نئی نئی ہیں سلیماں نئے نئے

(شاہ صاحب کے والد ماجد مرحوم کا نام داؤد تھا اور اسی لئے ان کی مُہر میں وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَا کندہ تھا)۔ مجمع بے اختیار ہنس پڑا۔

پھر فرمایا" پہلے سلیمان فرد تھا اور اب رباعی ہے، چار چار سلیمان یکجا ہیں" افسوس کہ یہ رباعی قاضی سلیمان کی وفات سے چند سال گزرے کہ مثلث بن چکی تھی اور اب ے صفر کو قطعہ ہو گئی، اب اس رباعی کے صرف دو مصرعے باقی ہیں، خدا جانے یہ بھی کب اس صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جائیں، وَاللّٰهُ هُوَ الْبَاقِي۔

شاہ صاحب کے چٹکلے اور تقریری دل آویز نکتے اس قدر ہیں کہ ان کو جمع کریں تو رسالہ بن جائے، رنگون میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ تھا، مولوی نے کانفرنس والوں پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا، شاہ صاحب بھی نواب محسن الملک مرحوم کے ساتھ اس جلسہ میں گئے تھے۔ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو فرمایا یہاں کے مولویوں نے اہل کانفرنس پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے۔ جن میں شاید میں بھی داخل ہوں، مگر غور تو کیجئے کہ نواب محسن الملک تو مہدی ہیں (نام مہدی علی تھا) ان کو کون مسلمان دجال کہے گا اور مجھ پر تو کفر کا فتویٰ لگ ہی نہیں سکتا کہ خود اللہ تعالیٰ کی شہادت ہے کہ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا (سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا، بلکہ شیطانوں نے کفر کیا)۔ مجمع ان نکتوں سے بے حد محظوظ ہوا اور مولویوں کی فتویٰ گری کا بادل شاہ صاحب کے ان دو چٹکلوں سے ہوا ہو گیا،

پورے پچاس برس تک ہندوستان کا گوشہ گوشہ ان کے پُر کیف و پُر اثر خطبوں سے معمور

رہا ہے، جس جلسہ میں وہ ہوتے تھے، ان کے سوا ہر آواز ماند پڑ جاتی تھی، جلسہ کے اہم موقعوں پر ان کی طوطی گفتاری بڑی بڑی پیچیدگیوں کو حل کر دیتی تھی، شاید ۱۹۱۰ء میں ندوہ کا عظیم الشان اجلاس پٹنہ میں تھا، شرکا میں ملک کے مشہور و ممتاز ارباب عمائم ایک طرف اور اس عہد کے مشہور تعلیمیافتگان جدید آنریبل جسٹس شرف الدین، سید علی امام، سید حسن امام، نصیر حسین بیرسٹر، شیخ سر عبدالقادر وغیرہ دوسری طرف شریک جلسہ تھے، یہ پہلا موقع تھا جس میں دستار بند اور ہیٹ پوش ایک جگہ مل کر بیٹھے تھے اور ملک و ملت کے درد کا درماں سوچ رہے تھے، حسن امام صاحب کی تقریر کے ایک بے محل فقرہ پر علماء میں برہمی پیدا ہوئی، شاہ صاحب فوراً کھڑے ہو گئے اور ایسی تقریر کی کہ سب ڈھل گیا، فرمایا، آج پہلا موقع ہے کہ نئے اور پرانے مل رہے ہیں، ایک دوسرے سے شکوے ہو رہے ہیں، بدگمانیاں دور ہو رہی ہیں.. پھر ایک دو فقروں کے بعد حافظ کا یہ شعر اس مزہ سے پڑھا کہ فریقین مسکرا کر رہ گئے۔

للہ الحمد میانِ من و او صلح فتاد

حوریاں رقص کناں نعرۂ مستانہ زدند

ندوہ کے اسی اجلاس میں نصیر حسین صاحب بیرسٹر پٹنہ نے جواب صوفی صافی ہو چکے ہیں ایک نہایت پُر جوش و پر اثر تقریر کی تھی، اثر یہ تھا کہ صدر سے لے کر پائیں تک جو تھا رو رہا تھا، بڑے بڑے عمامہ والوں اور ہیٹ پوشوں کو میں نے خود دیکھا (میری عمر اس وقت ۱۵، ۱۶ برس کی ہوگی) کہ وہ ڈھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، شاہ صاحب کی موقع شناسی ملاحظہ ہو، اسی عالم میں کہ لوہا گرم تھا کہ چندہ کی تحریک شروع کر دی، نصیر حسین صاحب نے اپنا کوٹ اور ویسٹ کوٹ اور جو کچھ ان کی جیبوں میں تھا مع گھڑی کے ندوہ کی نذر کر دیا، اسی حالت میں شاہ صاحب نے برمحل ایک شعر اپنی مخصوص لے میں ایسا پڑھا کہ سارے مجمع پر جادو کر گیا، مجھے صرف ایک مصرع یاد ہے۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم

یہ عالم ہوگیا کہ ہر طرف سے روپے، کپڑے، گھڑیاں اور زیورات برسنے لگے، علماء نے جُبّے اور دستاریں آتار آتار کر نذر کر دیں، یاد آیا ایک بزرگ اس میں حضرت شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے خلیفہ تھے، ان کے سر پر پیر کی دستار تھی، جوش میں آکر وہ بھی انہوں نے آتار ڈالی، وہ دستار جلسہ میں نیلام ہوئی اور جناب مولانا حبیب الرحمان شروانی جیسے قدر شناس کی قسمت میں آئی۔

بات کہاں سے کہاں جا نکلی۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

معلوم نہیں عہد ماضی کی یہ کہانیاں حال کے ناظرین کو بھی لذیذ معلوم ہوں یا نہ ہوں، اس لئے اپنے مزہ کے لئے ان کو بے مزہ کرنا مناسب نہیں۔

شاہ صاحب کی ذات ایک عجیب جامع ہستی تھی، ایسے لوگ اب پیدا نہ ہوں گے، زمانہ بدل رہا ہے، ہوا کا رُخ اور طرف ہے، وہ قدیم وجدید کے درمیان حلقۂ اتصال تھے، اب قدیم بھی جدید ہو رہا ہے اور جدید جدید ترین بن رہا ہے۔ دعا ہے کہ اُن کے اخلاف برادرم شاہ حسین میاں صاحب اور ان کے بھائی اپنے بزرگ باپ کے سچے جانشین ثابت ہوں۔

ربیع الاول ۱۳۵۴ھ

جولائی ۱۹۳۵ء

سیّد رشید رضا مصری

افسوس ہے کہ ۲۲ر اگست ۱۹۳۵ء (جمادی الاولیٰ ۱۳۵۴ھ) کو مصر بلکہ دنیائے اسلام کے سب سے بڑے عالم علاّمہ سید رشید صاحب المنار نے داعی اجل کو لبیک کہا، یہ مفتی عبدہٗ مرحوم کے سب سے ممتاز شاگرد اور سید جمال الدین افغانی کے فیوض و برکات سے بیک واسطہ مستفید تھے، شام وطن تھا، لیکن سلطان عبدالمجید خان کی دار و گیر سے گھبرا کر چلے آئے تھے اور آخر یہیں کے ہو کر رہ گئے، عمر اس وقت ستّر سے کم نہ ہوگی، پھر بھی ان کی جسمانی قوت اور کام کی طاقت بہت اچھی تھی، اسلام کے اصلاحی مسائل ان کی تصانیف کا خاص موضوع تھا، المنار جس کی اشاعت دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں تھی، ان کی اڈیٹری میں نکلتا تھا، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ پورا رسالہ انہیں کے قلم کا مرہون ہوتا تھا، ان کی سب سے اہم تصنیف تفسیر المنار تھی، جو افسوس کہ ان کی وفات سے ناتمام رہ گئی، یہ تفسیر زمانۂ حال کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر لکھ رہے تھے۔ وہ عقیدہ میں سلف کے پیرو اور فقہ میں غیر مقلد تھے، ان کی انشاء پردازی قدیم و جدید دونوں خوبیوں کو لئے ہوئی تھی، فقہ، تفسیر اور حدیث میں ید طولیٰ رکھتے تھے، ان کی آخری تصنیف "الوحی المحمدی" ہے، جس کا ہندوستانی ترجمہ کلکتہ سے شائع ہو چکا ہے، قدیم و جدید خیالات کی تطبیق ان کی ہر تحریر میں ہوتی تھی اور وہ اسی کو اس زمانہ میں اسلام کے لئے مفید خدمت سمجھتے تھے۔

اس زمانہ میں جب ایسے روشن خیال و روشن ضمیر علماء جو ایک طرف متقی و پرہیزگار اور دوسری طرف زمانۂ حال کی ضرورتوں سے باخبر ہوں، انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، سید رشید رضا

کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا آج اسلام کا سب سے بڑا حادثہ ہے، وہ دنیائے اسلام کے کاشانہ میں ہدایت کے چراغ تھے، افسوس کہ یہ چراغ اب ہمیشہ کے لئے بجھ گیا، اور اس سے زیادہ افسوس یہ کہ اس چراغ کے گل ہونے سے المنار کی وہ روشنی بھی بجھ جائے گی جس کی کرنیں ہر راہ تمام دنیا میں پھیلتی تھیں، ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً۔

میری ان کی پہلی ملاقات ہندوستان میں ۱۹۱۲ء میں ہوئی، جب وہ اس سال مولانا شبلی مرحوم کی تحریک سے ندوۃ العلماء کے اجلاس لکھنؤ میں صدر ہو کر آئے، پھر ۱۹۲۴ء میں مصر جا کر ان سے ملا اور مجلسِ خلافتِ مصر اور شیوخ ازہر سے میری ملاقات کا ذریعہ بنے، آخر میں ۱۹۲۶ء کی موتمر اسلامی میں مکہ معظمہ میں ملاقاتیں ہوتی رہیں، مکاتبات کا سلسلہ بھی تھا۔

رجب ۱۳۵۴ھ

اکتوبر ۱۹۳۵ء

پروفیسر باور

پچھلے مارچ میں جرمنی کے ہالے یونیورسٹی کے علوم مشرقیہ کے پروفیسر باور کا انتقال ہوگیا، وہ لسانیات کے ماہر تھے، وہ یورپ کی تقریباً جملہ زبانوں کے جاننے کے علاوہ ساری سامی زبانوں سے واقف تھے اور تورانی زبانوں خصوصاً چینی زبان میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ اس حیرت انگیز وسیع لسانیاتی واقفیت کے سبب سے وہ راس شمرہ کی کھدائیوں میں بعض نئے خطوں کے کتبوں کے برآمد ہونے پر ان کو حل کرسکے، ماسوف علیہ کو امام غزالی کی احیاء العلوم سے خاص دلچسپی تھی، اس کے متفرق ابواب کے ترجمے اکثر شائع کرایا کرتے تھے، اسلامی علم مرایا ومناظر پر بھی بعض اچھے مضمون لکھے تھے، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے شریک ناشر بھی تھے اور فلک، حاء، حفص الفرد وغیرہ عنوانوں پر اس میں مقالے لکھے تھے، "حرف تہجی کی ابتداء" پر اُن کی ایک جرمن تالیف اس وقت مطبع میں ہے۔

ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ

جولائی ۱۹۳۷ء

ڈاکٹر انصاری مرحوم

۹ مئی ۱۹۳۶ء کی شام کو سات بجے کے قریب میں ڈیرہ دون کی ایک سڑک سے گزر رہا تھا کہ پیچھے سے ایک موٹر تیزی سے آئی اور نکل گئی، میں نے دیکھا کہ اس پر ڈاکٹر انصاری بیٹھے ہیں، سر کھلا تھا اور چہرہ سے بے حد تکان معلوم ہوتا تھا، رات گزر گئی اور صبح کو ان کی قیام گاہ کی تلاش کی، معلوم ہوا کہ وہ رات ہی دلی چلے گئے، لیکن جب شام ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ رات دلی نہیں گئے، راستہ سے سیدھے جنت کو سدھارے، دل دھڑکا آنکھیں پُرنم ہوئیں اور سینہ سے آہ کا ایک شعلہ اٹھا، جس نے صبر وتمکین کی متاع کو جلا کر خاکستر بنا دیا۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری گو نسب ووطن کے لحاظ سے ضلع غازی پور کے ایک ممتاز قصبہ یوسف پور کے ایک نہایت شریف خاندان سے تھے، مگر درحقیقت ان کا تعلق پورے ہندوستان سے تھا، اس یوسف کا کنعان، وہ محدود مقام نہ تھا، جس کو یوسف پور کہتے ہیں، بلکہ پورا ہندوستان تھا، اسی لئے آج پورے ہندوستان نے ان کی موت کا ماتم کیا، کیا مسلمان کیا ہندو، کیا سکھ کیا عیسائی سب نے یہی جانا کہ آج ان کا حقیقی بھائی اس دنیا سے چل بسا۔

میں نے ڈاکٹر انصاری کو سب سے پہلے ۱۹۱۲ء میں اس وقت دیکھا جب وہ بلقان کی جنگ میں طبی وفد لے کر ترکی جا رہے تھے اور اس تقریب سے لکھنؤ اسٹیشن سے گزر رہے تھے، مولانا شبلی اور بہت سے لوگ لکھنؤ اسٹیشن پر ڈاکٹر صاحب کو الوداع کہنے گئے تھے،

اس وقت ڈاکٹر صاحب کی عمر ۳۰، ۳۲ برس کی تھی، کھلتا ہوا رنگ، دُبلا پتلا چھریرا بدن کشیدہ قامت، ہنستا چہرہ، الوری یا قیصری مونچھیں، جسم پر چست خاکی وردی، ڈاکٹر صاحب کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھولے کھڑے تھے، گاڑی نے جیسے ہی سیٹی دی، لوگوں کی آنکھیں بھر آئیں اور مولانا شبلی مرحوم نے اُسی جوش میں جھک کر ڈاکٹر صاحب کے بوٹ کو بوسہ دیا اور رخصت کیا، وہ بھی عجیب منظر تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا سب سے پہلا شجاعانہ اسلامی کارنامہ ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ دھلی کے صدر کی حیثیت سے وہ یادگار خطبہ ہے جس میں سب سے پہلے خلافت اور مقامات مقدسہ کی نسبت مسلمانوں کے جذبات کا بے خوفی سے اظہار کیا گیا اور مذہبی کتابوں کے حوالہ سے مسلمانوں کے دعووں کے دلائل پیش کئے گئے تھے، اس کے بعد تو ان کا یہ جنون بڑھتا ہی رہا اور خلافت کانگریس اور ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں میں انہوں نے وہ کچھ کیا جو ہندوستان کے کسی مسلمان نے نہیں کیا۔

وہ ہندو مسلم اتحاد کے منادی، عالم اسلامی کے سفیر اور آزادی وطن کے مبلغ تھے، وہ جلسوں میں بہت کم بولتے تھے، مگر جب بولتے تھے تو وہ کہتے تھے جس کی صداقت دلوں میں گھر کر جاتی تھی، صداقت اور شرافت ان کا خمیر تھا، صداقت کی خاطر ان کو کبھی کبھی اپنے عزیز ترین دوستوں کا ساتھ چھوڑنا پڑتا تھا اور شرافت کے سبب سے ان دوستوں کے غیظ و غضب اور جفا کوشی کو پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ برداشت کرتے تھے، اس قسم کے کتنے مناظر خود میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں۔

اُن کا گھر مہمانوں کے لئے، ان کی جان دوستوں کے لئے اور اُن کا مال ضرورتمندوں کے لئے وقف تھا، ناواقف اُن کو دولتمند سمجھتے تھے، مگر جاننے والوں کو معلوم ہے کہ کبھی اُن پر ایسے دن بھی گزرے کہ قرض لے کر مہمانداری کا فرض انجام دیا جاتا تھا اور اس حالت میں بھی قومی جلسوں کا پورا بار اپنے کندھوں پر اٹھائے اور سینکڑوں اپنے جاننے والوں

اور نہ جلنے والوں کو اپنا مہمان بنائے ہوئے تھے۔

وہ فیاضی کا مجسمہ، لطف و محبت کا پیکر اور حسنِ اخلاق کا فرشتہ تھے، متانت اور سنجیدگی ان کی طینت اور غور و فکر اُن کی عادت تھی، وہ وطن کے خدمت گار، انسانیت کے غمخوار اور اسلام کے پرستار تھے، وہ دنیا میں اتحادِ اسلامی کے پیغامبر اور ملک میں ہندو مسلم اتحاد کے مبلغ تھے، اُن کی پالٹیکس کے سولہ برسوں میں طوفانِ سیاست کے سینکڑوں جھونکے اٹھے اور سیاسی انقلاب خیال کے بیسیوں حادثے پیش آئے، مگر صداقت اور راست بازی کا یہ پہاڑ جوں کا توں اپنی جگہ پر جما رہا۔

نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں وہ وقت آیا جب اپنوں نے ان کو غیر بنایا آشناؤں نے ان کو بیگانہ سمجھا اور دوستوں نے دشمن قرار دیا، بلکہ کلکتہ خلافت اور آل پارٹیز کانفرنس میں وہ وقت بھی آیا جب اُن کے اپنے دست و بازو نے اُن کو دھکے دیئے اور مسلمانوں نے ان پر حملہ کی نیت کی، تاہم یہ شرافت و متانت کا مجسمہ خاموش رہا اور اپنوں کی بدسلوکی کے ذکر اور دوستوں کی جائز شکایت سے کبھی اپنے لب کو آلودہ نہیں کیا۔

اب زمین کا یہ فرشتہ ہمارے شور و شر کی سرزمین سے بہت دور امن و راحت کے آسمان پر چلا گیا، اس کا جسم خاکی دلّی کے ایک کھنڈر میں ہزاروں من مٹی کے نیچے دبا ہے، اب زمانہ کے حوادث اس کو رنجیدہ، عالم اسلامی کی زبوں حالی اس کو آلودہ اور وطن کی غلامی اس کو افسردہ نہیں بنائے گی، اس کا تن خاکی اب ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح زمین کے بچھونے پر ابدی نیند سو رہا ہے اور اس کی روح ہماری مدح و ستائش سے بے پروا اور ہمارے نوحہ و ماتم سے بے خبر اپنے نیک اعمال کا محضر لئے خدا کے سامنے ہے، امید ہے کہ مغفرت کا نورانی خلعت اس کے جسم پر اور نوازش کا تاج اس کے سر پر ہوگا۔

آہ! کیسا دل دوز منظر ہے، وہ حاذق جس سے دردِ دل کے ہزاروں مریضوں کو شفا ہوئی، جس نے اپنے تیس برس کے معالجہ میں ہزاروں کو موت کے خطرہ سے بچایا ہو، وہ ایک

ریلوے سفر میں گاڑی کے ایک ڈبہ میں ڈبہ کے ایک تختہ پر موت کے پنجہ کو آہستہ آہستہ اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھتا ہے اور اس بے کسی اور بے بسی کے عالم میں اپنے کو مجبور پاتا ہے اور چالیس منٹ کے اندر ستاون ۵۷ برس کی عمر میں اس کی ہستی کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔

دہلی کے اسٹیشن نے بیسوں دفعہ اس کے جلوس و استقبال کے رنگین منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوں گے، ۱۰ رمئی ۱۹۳۶ء کی صبح کو اسی اسٹیشن نے اُسکی بے روح لاش کو گاڑی سے اترتے دیکھا، استقبال کرنے والوں کا ہجوم اب بھی تھا، مگر چہروں پر مسکراہٹ کے بجائے رنج وغم، آنکھوں میں نور کی جگہ آنسوؤں کے قطرے دل میں خوشی و مسرت کے بدلہ غم و الم کا اضطراب۔

طرابلس اور بلقان کے ہنگاموں نے ہمارے چند جدید تعلیمیافتہ نوجوانوں کو سوتے سے بیدار کر دیا تھا، محمد علی مرحوم اس قافلہ کے رہبر اور ڈاکٹر انصاری اس قافلہ کے سب سے پرجوش رہرو تھے۔ افسوس کہ ان دونوں دردمندوں نے دل ہی کی آزار میں وفات پائی۔ دل کا درد مجاز بن کر نمودار ہوا اور ان کی قومی زندگی کا باعث ہوا اور وہی حقیقت بن کر ان کی موت کا سبب ہوا، محمد علی مرحوم نے پہلے داغِ مفارقت دیا اور اب

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

ربیع الاول ۱۳۵۵ھ

جون ۱۹۳۶ء

سر فضل حسین

سر فضل حسین کا ماتم ملک کے گوشہ گوشہ میں برپا ہے، مرحوم کے سیاسی مسلک سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو، مگر ان کی قابلیت، تدبر، بے خوفی، دلیری، ہر دلعزیزی اور قومی ہمدردی سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو، وہ ان حکومت پسندوں میں نہ تھے جو اپنی شخصی ترقی کو صرف اپنی خاندانی ترقی کا زینہ بناتے ہیں، بلکہ ان میں جو حکومت کا ساتھ دے کر اپنی سمجھ کے مطابق قوم و ملک کی بھلائی کرتے ہیں، مرحوم کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ جس محفل میں ہوتے تھے اس پر چھا جاتے تھے، وہ فطری لیڈر تھے اور دوسرے اُن کے ساتھ چلنے پر مجبور تھے، وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہو کر گویا یہ کہنا چاہیئے وہ صرف ممبر نہیں رہے تھے، بلکہ اپنی دانائی، عزم، حسنِ تدبیر اور دلائل کی قوت کی بنا پر پوری کونسل کی عنانِ سیاست کے تنہا مالک تھے۔

مرحوم مرضِ دق کے بیمار تھے، پھر بھی مجلسِ حکومت کی رکنیت سے علیحدہ ہو کر انہوں نے آرام نہیں کیا، بلکہ سیاسیاتِ پنجاب کی اُلجھی ہوئی گتھی کو اپنی شبانہ روز کی محنت سے سلجھانے میں مصروف ہو گئے اور یہ اُن کا کمال سمجھنا چاہیئے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک متحدہ سیاسی پارٹی بنانے میں کامیاب ہو گئے اور خود اعتمادی یہ تھی کہ ہر مخالف کوشش کو بے حقیقت سمجھ کر اپنے کام میں بے خوف لگے رہے، گو ہم کو یہ معلوم ہے کہ اس متحدہ پارٹی کی پراگندہ اوراقِ کتاب کا شیرازہ کس نے باندھا، تاہم مرحوم کی مہارتِ فن کی داد دینی پڑتی ہے کہ خود شیرازہ بند کو بھی یہی محسوس ہوتا تھا کہ ان منتشر اوراق کا شیرازہ خود ان کی ذات ہے، پروردگارِ عالم اُن پر رحمت فرمائے اور اپنے فضل و کرم سے آخرت کی عزت سے بھی اُن کو نوازے۔

جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ

اگست ۱۹۳۶ء

مارماڈیوک پکھتال

اِس سال مرحوم مارماڈیوک پکھتال کے علاوہ جن کو ہم سب جانتے تھے، کئی نامور مستشرقین نے وفات پائی، اٹلی کے پرنس کائتانی اور پروفیسر گویڈی اور لائڈن کے پروفیسر اسنوک ہرخرونئے نے امسال ہماری دنیا کو الوداع کہا، پرنس کائتانی تاریخ اسلام کے عالم اور گویدی عربوں کی ریاضیات اور جغرافیہ کے ماہر اور اسنوہرخرونئے "محمد زم" نامی کتاب کے مصنف ہیں، جس کو انہوں نے خطبہ کی صورت میں امریکہ کی "مجلسِ تاریخ مذاہب" میں پیش کیا تھا اور بھی دوسری کتابیں اور مضامین اُن کے قلم سے نکلے تھے۔

مارماڈیوک پکھتال انگریزی کے بلندپایہ انشاپرداز انگریز تھے، مدت تک مصر اور ترکی میں رہے تھے اور وہیں اسلام کے تاثرات نے اُن کے دل میں گھر کیا تھا اور اسلام کے سچے پیرو ہوگئے تھے، سنہ ۱۹۲۰ء میں لندن میں اُن سے جمعہ کی نمازمیں اسلامی جماعت خانہ میں ملاقات ہوا کرتی تھی، وہ بالکل مسلمانوں کی طرح نماز پڑھا کرتے تھے، جماعت خانہ میں ان کی ترکی ٹوپی نماز کے لئے رکھی رہتی تھی، جس کو وہ نماز کے وقت پہن لیتے تھے، لارڈ کرومر کے زمانہ میں وہ مصر میں تھے۔

ترکی اور رواں عربی زبان بولتے تھے اور جانتے تھے، ترکوں کی ہمدردی میں طرابلس کے زمانہ میں کچھ رسائل لکھے تھے، لندن میں اُن سے گھنٹوں باتیں ہوا کرتی تھیں، اس کے بعد ہی وہ بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹر ہوکر آگئے، چنانچہ وہاں بھی اُن سے ملاقات ہوئی، پھر وہ حیدرآباد دکن چادر گھاٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور وہاں کی سول سروس ہاؤس کے اتالیق ہوگئے تھے

اسی زمانہ میں جب حیدر آباد جانا ہوا، محبت سے مجھے اپنے یہاں بلاتے رہے، اسی زمانہ میں قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ شروع کیا، غالباً ۱۹۲۷ء میں مدراس میں جب اُن سے ملاقات ہوئی تو اپنے انگریزی ترجمہ کا ذکر کیا، اور سورہ مریم کا ترجمہ دیکھنے کو دیا، وہ کہتے تھے کہ مولوی محمد علی لاہوری کے غلط سلط ترجمہ کو انگریزوں کے ہاتھوں میں دیکھ کر شرماتا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ اس کا ایک آتشیں ترجمہ کروں جو دلوں کو گرما دے، چنانچہ حیدر آباد کی مالی امداد سے مصر جا کر اس ترجمہ کو پورا کیا اور چھپا اور یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے، یہ وہ نومسلم انگریز تھے جو ایمان کے ساتھ عملاً نماز و روزہ کے پابند تھے، اللہ تعالیٰ اُن پر رحم و کرم فرمائے۔

رجب ۱۳۵۵ھ

اکتوبر ۱۹۳۶ء

مولوی نورالحسن صاحب نیّر

افسوس کہ اس مہینہ مولوی نورالحسن صاحب نیّر، بی، اے، ایل، ایل، بی خلف حضرت محسن کاکوروی نے ایک مدت کی علالت کے بعد وفات پائی، وہ انگریزی کے ساتھ عربی کے بھی عالم تھے، ندوۃ العلماء کے ممتاز رکن اور دارالعلوم کے سابق معتمد تھے، وہ سخنور، سخن سنج، سخن شناس، سخن داں سب کچھ تھے، اُن کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ اُردو لغت نوراللغات کی تالیف ہے، خدا ہمارے اس ادیب شاعر کو اپنی رحمت کے انعام و اکرام سے سرفراز فرمائے۔

رجب ۱۳۵۵ھ

اکتوبر ۱۹۳۶ء

منشی پریم چند

افسوس ہے کہ اس جلسہ میں ہندی اور ہندوستانی کا وہ ادیب موجود نہ تھا، جس کا قلم ان دونوں دریاؤں کا سنگم تھا، یعنی منشی پریم چند، ماسوف علیہ نے اسی مہینہ اپنے دوستوں کو آخری الوداع کہا اور اس دنیا سے رخصت ہو گئے، اُن کے قلم نے کم ازکم پچیس برس تک اپنے دیہاتی بھائیوں کی کہانی اپنے شہری بھائیوں کو سنائی، وہ زبان کے پُرجوش فصیح و بلیغ نہ تھے، ان کی عبارت تکلف وبناوٹ سے پاک اور حد درجہ سادی تھی، اُن کی کہانیوں کا اثر ان کی زبان میں نہ تھا، بلکہ ان کے بیان میں تھا، انہوں نے ہمارے دیہاتی تمدن، ہندوستانی وضع وآداب اور ہندی اخلاقی آن بان کی جو تصویریں کھینچی ہیں وہ ہمارے ادبی مرقع کی زندۂ جاوید یادگاریں ہیں۔

شعبان ۱۳۵۵ھ

نومبر ۱۹۳۶ء

نواب علی حسن خاں مرحوم

ایک نواب عالم کی وفات

ہندوستان کے اُن پرانے مسلمان خاندانوں میں سے جو شرافتِ نسب کے ساتھ علم اور دولت دونوں کے جامع ہیں، اب خال خال گھرانے رہ گئے ہیں، انہیں میں سے ایک والاجاہ نواب سید صدیق حسن خان مرحوم کا خاندان تھا، جن کے چھوٹے صاحبزادہ صفی الدولہ حسام الملک شمس العلماء نواب سید محمد علی حسن خاں مرحوم نے ۱۹ نومبر ۱۹۳۶ء مطابق ۳ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ کی صبح کو اپنی کوٹھی بھوپال ہاؤس لال باغ لکھنؤ میں بہتر برس کی عمر میں وفات پائی، افسوس ہے کہ ایک پُرانے خاندان کے فضل و کمال اور جاہ و جلال کی یادگار آج مٹ گئی۔

مرحوم ان لوگوں میں تھے جن کی آنکھوں نے مسلمانوں کے علمی و تعلیمی، سیاسی و تمدنی انقلاب کے مناظر دیکھے، وہ پیدا تو ایک "کنسرویٹو" گھرانے میں ہوئے اور اسی ماحول میں تعلیم و تربیت پائی، لیکن فطرت کی طرف سے وہ ایک اثر پذیر اور حساس دل لائے تھے، باوجود اس کے کہ وہ بھوپال میں پیدا ہوئے جہاں حد درجہ قدامت کی حکومت اور سطوت تھی اور ممکن نہ تھا کہ نور محل میں نئی روشنی کی ایک کرن بھی پہنچ سکے، مگر استعداد طبع دیکھئے کہ خود بخود ادھر طبیعت کا میلان ہوا، سرسید کی جدید تعلیمی تحریک میں اور پھر ندوۃ العلماء کی مذہبی تحریک میں شریک ہوئے اور ہر قسم کی جانی و مالی خدمتیں انجام دیں، مدت تک ندوہ کے اعزازی ناظم رہے، دارالمصنفین کے اساسی ارکان میں تھے اور لکھنو کی ہر سنجیدہ تحریک میں ان کا نام سرفہرست رہتا تھا۔

وہ عربی زبان کے عالم، فارسی زبان کے ماہر اور اردو کے مشتاق اہل قلم تھے، فارسی شعر و سخن اور محاورات پر ان کو عبور کامل حاصل تھا، فارسی کا مشکل سے کوئی اچھا شعر ہوگا جو ان کو یاد نہ ہو، خود بھی فارسی میں اکثر اور اُردو میں کمتر شعر کہتے تھے، انہوں نے اپنے والد ماجد کے زمانۂ عروج میں دنیا بھر کے مشرقی علماء و فضلاء کی صحبتیں اٹھائی تھیں اور سوائے علمی و ادبی چرچوں کے ان کے کانوں میں کوئی بات پڑی بھی نہ تھی، ان کے لئے ان کے والد نے ہر فن کے باکمال استاد مقرر کئے تھے جن کے سایۂ تربیت میں وہ پل کر جوان ہوئے۔

وہ ہماری زبان کے مصنف بھی تھے، متعدد مذہبی اور تاریخی کتابیں اُن کے قلم سے نکلیں، شعراء کے تذکرے ان کی جوانی کی یادگار ہیں، فطرۃ اسلام اور مآثر صدیقی ان کی بہترین کتابیں ہیں، آخر میں "مردم دیدہ" کے نام سے ان باکمالوں کے حالات لکھے تھے، جن سے ان کو ملنے کا اتفاق ہوا اور ان کی تعداد کچھ کم نہیں، ان میں بڑا حصہ شعراء کا تھا۔

وہ مولانا شبلی مرحوم کے بے تکلف دوستوں میں تھے اور ایک دوسرے کے سچے قدردان تھے، یہی وراثت منتقل ہو کر ہم تک پہنچی، موصوف کو ہم لوگوں سے اس درجہ محبت اور شفقت تھی جو خاندانی محبت سے کسی طرح کم نہ تھی اور اس کو اس وضعداری سے نباہا کہ تیس برس کے عرصہ میں ایک دفعہ بھی اس میں فرق نہ آیا، وہ مجسم اخلاق، حد درجہ پاک باطن اور نیک طینت تھے، شر و فساد سے طبعی نفور اور ہنگامہ آرائیوں سے کوسوں دور تھے، تمول کے باوجود خاکسار اور علم و فضل کے باوجود ملنسار تھے۔

مذہبی خیالات میں گو وہ عقلیت کی طرف مائل تھے، لیکن اسی کے ساتھ مذہبی پابندی ان میں اتنی سخت تھی کہ ان کی ایک نماز بھی ان کے مقررہ وقت سے ٹلنے نہیں پاتی تھی، رسم و رواج، بدعات کا ان کے گھر میں نشان نہ تھا اور اس بارے میں وہ نہایت سخت تھے، ان کی محفل میں علم و فن، شعر و سخن اور قومی مسئلوں کے سوا کوئی اور مذکور نہ تھا،

عربی کتابیں ان کو پڑھے ہوئے مدت ہوچکی تھی اور پھر ان کا کوئی مشغلہ نہ رہا، تاہم جب ذکر آجاتا تو ان کو بھولے ہوئے خواب کی طرح بہت سی باتیں یاد آجاتیں۔

نور محل کے رہنے والے! تو بڑے باپ کا چشم وچراغ اور ایک پرانے خاندان کا چراغِ سحر تھا، ۵، نومبر ۱۹۳۶ء کو تیرا آخری دیدار نصیب ہوا، خیال نہ تھا کہ علم وفضل کا یہ ٹمٹماتا ہوا دیا اتنا جلد بجھ جانے والا ہے، اب تو وہاں ہوگا جہاں خدا چاہے نور کے سوا ظلمت کا گذر نہیں، صفی الدولہ! حسام الملک! اب تو وہاں ہے جہاں کسی کی دولت ہے اور نہ کسی کا ملک ہے، تیرے اعمال نیک کی دولت اور تیرے کارِ خیر کی ملکات تیرے ساتھ ہے، دعا ہے کہ وہ شہنشاہِ علی الاطلاق اپنے ملک لازوال کی دولتِ جاوید سے تجھ کو سرفراز فرمائے۔

رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ

دسمبر ۱۹۳۶ء

سرراس مسعود

افسوس ہے کہ ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء کی دوپہر کو ڈاکٹر سرراس مسعود کا بھوپال میں بعارضۂ تپ میعادی انتقال ہوگیا، باہر والوں کو ان کی بیماری کی کوئی خبر نہ تھی، یکایک پہلی اگست کے اخباروں سے ان کی وفات کی اطلاع ملی، مسلمانوں کے لئے عموماً اور ان کے دوستوں کے لئے خصوصاً یہ سانحہ بہت ہی المناک ہے، وہ ہماری قوم میں تعلیمی مسائل کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے، سرسید کے پوتے اور جسٹس سید محمود کے بیٹے تھے، تعلیم سے فارغ ہوکر وہ پہلے پٹنہ میں ہیڈ ماسٹر ہوئے، وہاں سے کٹک پروفیسر ہوکر گئے، پھر حیدرآباد میں ناظم تعلیمات اور اس کے بعد مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور آخر میں ریاست بھوپال میں وزیر تعلیم ہوئے، ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے تھے، ۴۸ برس کی عمر پائی، جاپان کا تعلیمی نظم ونسق اور انتخاب زریں (اردو اشعار کا انتخاب) وغیرہ بعض رسالہ اور مضامین ان کی علمی اور ادبی یادگار ہیں، مرحوم نے دو جوان لڑکے پہلی بیوی سے چھوڑے ہیں بڑا لڑکا تعلیم سے فارغ ہوکر اب یورپ سے واپس آگیا ہے۔

مرحوم بڑے وجیہہ، کشیدہ قامت، سرخ وسفید، ہنس مکھ اور ملنسار تھے، جس مجلس میں ہوتے سب پر چھا جاتے، باتوں کے دھنی اور زبان کے میٹھے تھے، ہر شخص سے جھک کر ملتے تھے، ایک ذاتی واقعہ ہے، مگر بیان کے قابل ہے، بارہ تیرہ برس ہوئے جب وہ حیدرآباد میں ناظم تعلیمات تھے، تو میرا حیدرآباد جانا اور ایک دوست کے ہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا، جن سے پہلے کو ان سے بہت میل ملاپ تھا، مگر یکایک بیچ میں ایسی شکر رنجی

ہوگئی تھی کہ ملنا جلنا اور بات چیت تک بند ہوگئی تھی، میں جب اُن سے جا کر ملا تو انہوں نے پوچھا کہاں ٹھہرے ہو، میں نے جگہ بتائی تو وہ چُپ سے ہو گئے، میں مطلب سمجھ گیا، دو تین دن کے بعد دیکھتا کیا ہوں کہ وہ بے تکلف وہاں چلے آرہے ہیں، میرے ان دوست کو اچنبھا سا ہو گیا اور اس دن وہ اُن کے حُسن خلق کے قائل ہو گئے، چند سال ہوئے کہ کابل کے سفر میں میں اور وہ ساتھ تھے، دن رات یک جا رہنے کا اتفاق ہوا، مرحوم کی مجلسی خوبیاں بھولنے کے قابل نہیں، ان کی وفات سے ایک بڑے خاندان کی یادگار مٹ گئی اور تعلیمی مسائل کی ایک قابل ذکر ہستی فنا ہو گئی، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس با اخلاق کو اپنے اخلاقِ ربانی سے نوازے۔

جمادی الاولیٰ ۱۳۵۶ھ

اگست ۱۹۳۷ء

شیخ مشیر حسین قدوائی

گزشتہ سال کے خاتمہ پر ۲۳؍دسمبر ۱۹۳۷ء کو شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی بیرسٹرایٹ لاد تعلقہ دارگدیہ (بارہ بنکی صوبۂ اودھ) نے اُنسٹھ ۵۹ برس کی عمر میں دل کی پرانی بیماری سے وفات پائی، مرحوم اسلام کے پرجوش سپاہی تھے، عمر بھر فرنگستان کی وادیوں میں اپنے قلم سے مصروفِ جہاد رہے، ووکنگ مشن کی قلمی کوششوں میں انکا حصہ نہایت اہم ہے، جنگ عظیم کے زمانہ میں ووکنگ ہی میں مقیم تھے، یورپ کے بڑے بڑے مشاہیر سے ملاقاتیں رکھتے تھے اور دنیائے اسلام کے اکثر اکابر سے ان کی ذاتی واقفیت اور مراسلت تھی، وہ اتحاد اسلامی کی تحریک کے بانیوں اور ملک کے سیاسی آزادی کے حامیوں میں تھے، ۱۹۲۰ء میں فیض آباد خلافت کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے جو خطبہ پڑھا تھا وہ ہندوستان میں ترکی اور یورپ کے معاملات کے متعلق پہلا ذریعہ علم تھا، مرحوم اپنی اخیر زندگی تک اسلام کی خدمت میں مصروف رہے، ان کی وفات سے شاید چند ہی روز پہلے ان کی آخری انگریزی تصنیف "اسلام اور بولشزم" چھپ کر نکلی تھی، اللہ تعالیٰ اس سپاہی کی مجاہدانہ قلمی خدمات کو حسنِ قبول ا تاثیر بخشے اور اس کو بہشت بریں کی نعمت عطا فرمائے۔

مرحوم سے واقفیت تو ہندوستان ہی میں تھی، مگر میراان کا ساتھ ۱۹۲۰ء میں انگلستان میں ہوا، جہاں وہ وفد خلافت کے ساتھ آکر مقیم ہوئے تھے، مرحوم انگلستان کے قیام میں بھی نمازوں کی پابندی کیا کرتے تھے اور وضو اور طہارت کا اہتمام رکھتے تھے، مرحوم ندوہ کے پرانے رکن تھے، ندوہ کی سرکاری امداد کے معاملہ میں ان کی کوششیں بھی شامل تھیں، غالباً ۱۹۰۸ء میں اسی سلسلہ میں جب انگریز انسپکٹر آف اسکولس ندوہ کو دیکھنے کیلئے آیا تو مرحوم اسکے ساتھ تھے، اس زمانہ میں میں نے مسئلہ ارتقاء اور قرآن مجید پر ایک مضمون لکھا تھا، انہوں نے مجھے پیش کرتے ہوئے خاص اس مضمون کا ذکر کیا۔

ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ، جنوری ۱۹۳۸ء

ماتمِ اقبال

وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ آخر موت اور حیات کی چند ہفتوں کی کشمکش کے بعد ڈاکٹر اقبال نے دنیائے فانی کو الوداع کہا، صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو عمر کی اکسٹھ بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبلِ ہزار داستان اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہو گئی، ایسا عارف فلسفی، عاشقِ رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو، اس کے دہن کا ہر ترانہ بانگِ درا، اس کی جانِ حزین کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق، اس کے شعر کا ہر پرواز بالِ جبریل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہو گئی لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا، امید ہے کہ ملت کا یہ غمخوار شاعر اب عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا، اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جارہے ہونگے، خداوندا! اس کے دلِ شکستہ کی جو ملت کے غم سے رنجور تھا، غمخواری فرما اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلبِ حزیں کو مسرور کر۔

مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کیلئے ایک نیا پیام لایا تھا۔ وہ توحیدِ خالص کا پرستار، دینِ کامل کا علمبردار اور تجدیدِ ملت کا طلبگار تھا، اسکے رونگٹے رونگٹے میں رسولِ انام علیہ السلام کا عشق پیوست تھا اور اس کی آنکھیں جسمِ اسلام کے ہر ناسور پر اشک بار رہتی تھیں، اس نے مستقبلِ اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا، اسی خواب کی تعبیر میں اس کی ساری عمر ختم ہو گئی۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب تک آسکتا نہیں

کہنے کو تو ہم میں ملت کے غمخواروں کی کمی نہیں اور نہ اُمت کے دوستداروں کی قلت، مگر واقعہ یہ ہے کہ نئی تعلیم نے اپنے ساٹھ ستر برس کے طویل عرصہ میں دو ہی سچے غمخوار پیدا کئے، ایک محمد علی مرحوم اور دوسرا اقبال مرحوم، دونوں مرحوموں پر خدا کی بڑی رحمت ہو، ان کے دلوں میں اسلام کا حقیقی سوز تھا اور رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سچا عشق، نئے زمانہ کی جھوٹی آب وتاب اور نئے تمدن کی ظاہری چمک دمک سے ان کی آنکھیں خیرہ نہ تھیں، آفتاب اسلام کی ضیاباری کے مقابلہ میں ان کے سامنے جدید تہذیب وتمدن اور زمانۂ حال کی تجدیدات کی نئی روشنی مہ نخشب کے مصنوعی نور سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی، خدا ان کی قبروں کو اپنے نور سے بھر دے۔

اقبال کی قومی شاعری بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ شروع ہوئی بیسویں صدی کے اس پیغام رساں نے اپنے اڑتیس برس کے شاعرانہ پیغاموں سے ملت کے نوجوانوں میں نئی اُمنگ بھر دی اور نئے سفر کے قطعِ منزل کے لئے ان میں نئے سرے سے ہمت پیدا کر دی، اقبال کا یہ دعویٰ حرف حرف سچا تھا۔

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اقبال کی تصنیفات زمانہ میں یادرہیں گی، وہ اسلام کا غیر فانی لٹریچر بن کر انشاءاللہ رہے گا، ان کی شرحیں لکھی جائیں گی، نظریئے اُن سے بنیں گے، اُن کا فلسفہ تیار ہوگا، اس کی دلیلیں ڈھونڈی جائیں گی، قرآن پاک کی آیتوں، احادیثِ شریفہ کے جملوں، مولانا رومی اور حکیم سنائی کے تاثرات سے ان کا مقابلہ ہوگا اور اس طرح اقبال کا پیام اب دنیا میں انشاءاللہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اقبال زندہ جاوید۔

اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں، یا یورپ کے

سے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں بلکہ وہ حکیم جو اسرار قدرت کا محرم اور رموز فطرت کا آشنا تھا، وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا یعنی بادۂ انگور کو نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا۔

وفد کابل جن تین ممبروں سے بنا تھا، افسوس ہے کہ اس میں یکے بادیگرے دو چل دیئے، سر راس مسعود اور اقبال، اب صرف ایک رہ گیا ہے اور معلوم نہیں کہ وہ کتنے دن کیلئے ہے آہ۔

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند

مولانا شبلی مرحوم نے اقبال کو اسی وقت پہچان لیا تھا، جب ہنوز ان کی شاعری کے مرغ شہرت نے پر و بال نہیں پیدا کئے تھے، چنانچہ انہوں نے پیش گوئی کی تھی کہ حالی و آزاد کی جو کرسیاں خالی ہوں گی ان میں سے ایک اقبال کی نشست سے پُر ہو جائے گی۔ افسوس کہ آج اڑتیس برس کے بعد وہ کرسی خالی ہوگئی اور اب اُس کے بھرنے کی کوئی صورت نہیں۔

اقبال ہندوستان کا فخر اقبال، اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال، فضل و کمال کا پیکر اقبال، حکمت و معرفت کا دانا اقبال، کاروانِ ملت کا رہنما اقبال! رخصت، رخصت، الوداع، الوداع سلام اللہ علیک ورحمتہٗ الیٰ یوم التلاق!

ربیع الاول ۱۳۵۷ھ

مئی ۱۹۳۸ء

نواب سر مزمل اللہ خاں

حاتم یوپی کی وفات

ہمارے صوبہ کے حاتم نواب سر مزمل اللہ خان بہادر نے ستمبر کی آخری تاریخوں میں اپنے وطن بھیکم پور ضلع علی گڑھ میں وفات پائی، مرحوم کئی سال سے لگاتار بیمار تھے، بخار اور کھانسی کی شکایت تھی، ضعف کبھی بڑھ جاتا کبھی گھٹ جاتا اور آخر اتنا بڑھا کہ پھر نہ گھٹا، چوہتّر برس کی عمر میں دنیا کے ہر اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر اور ہر سرد و گرم کو آزما کر دین و دنیا دونوں کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو کر ۲۸؍ ستمبر ۱۹۳۸ء کو اس ہری بھری دنیا کو الوداع کہا۔

مرحوم شروانی خاندان کے چشم و چراغ تھے اور جیسا کہ وہ فرمایا کرتے تھے سرسید کی گود میں کھیل کر جوان ہوئے تھے، عربی و فارسی کی تعلیم پائی تھی اور انگریزی اتنی جانتے تھے کہ اخبار پڑھ اور گفتگو سمجھ لیتے تھے، فارسی کے شاعر تھے، مرزا سنجر طہرانی سے اصلاحیں لی تھیں، فارسی کا پورا دیوان مرتب تھا، ان کی غزلیں اور نظمیں کئی دفعہ ان کی زبان سے سنیں اور شاید ایک دو دفعہ معارف میں بھی چھپیں، تقریر شگفتہ اور پر مذاق کرتے تھے۔

مولانا شبلی مرحوم کے دوستوں میں تھے، اسی کا اثر یہ تھا کہ وہ مولانا کے کاموں اور تحریکوں سے دلچسپی رکھتے تھے، ندوہ کی طرف ان کا التفات مولانا ہی کے دم قدم اور قلم کے اشاروں سے ہوا اور دار المصنفین کی طرف ان کی چشم و کرم بھی اسی نسبت کی مرہون ہے۔

دار المصنفین اپنی چوبیس برس کی عمر میں حیدر آباد اور بھوپال کی سرکاروں کے علاوہ اگر کسی محسن کے فیض سے مستفید ہوا ہے تو وہ بھیکم پور کے رئیس کی ذات تھی، مرحوم نے دار المصنفین کی مسجد پانچ ہزار کے خرچ سے بنوائی اور اس کے لئے دری کا فرش اور پردے بنوا کر بھیجے۔

علی گڑھ کالج، ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم یونیورسٹی، اسلامیہ اسکول اٹاوہ، آلہ آباد یونیورسٹی، ہندو یونیورسٹی، دارالعلوم ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند، غرض اس صوبہ کا کوئی علمی و تعلیمی ادارہ ایسا نہیں جو ان کے چشمۂ فیض سے سیراب نہیں، بلکہ سُن کر حیرت ہوگی کہ جمعیۃ العلماء اور کانگرس تک اُن کے خوانِ نعمت سے مستفید تھے، وہ ہر قوم اور ہر فرقہ کے نیک کاموں کی امداد میں حصّہ لیتے تھے، مسلمان، ہندو، عیسائی، پارسی کی کوئی تخصیص نہ تھی، غرض جو آیا وہ اپنے نصیب کا حصّہ پاگیا۔

ہر کجا چشمۂ بود شیریں　　　مردم و مور و مرغ گرد آیند

مرحوم اپنی ذاتی دولتمندی کے باوجود بے حد سادہ زندگی بسر کرتے تھے، ایک دفعہ انہوں نے اپنے ململ کے کُرتے کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ تین آنے گز کا ہے اور انہی کے گاؤں کا بنا ہوا ہے، لیکن اس ذاتی کفایت شعاری سے بچایا ہوا سرمایہ بے تکلف سال دو سال میں قوم وملک کے کسی کام کے نذر کردیتے تھے، وہ اکثر ایسے موقع پر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

نہ کس می دہاند نہ کس میدہد　　　خدا می دہاند خدا می دہد

مرحوم سے آخری ملاقات پچھلے جاڑوں میں بھیکم پور میں ہوئی، وہ خود بھی اپنی زندگی سے مایوس تھے اور ایسے ہی کلمات ان کی زبان پر تھے، وہ دیر تک حج کے واقعات اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے حالات بیان فرماتے رہے، زندگی کے اختتام اور کسی نیک عمل کے قبول کی حسرت ظاہر کی، میں نے تسلی دی کہ حاتم کی بیٹی دربار رسالت میں اپنے باپ کی فیاضی کی بدولت عزت کی مستحق ٹھہری، پھر کوئی سبب نہیں کہ آپ کی تمام عمر کی فیاضی کے کام دربار الٰہی میں قبولیت کے مستحق نہ ٹھہریں۔

افسوس کہ ہمارے صوبہ کا یہ حاتم ہم سے رخصت ہوگیا، ہر نیک تحریک کا مددگار، ہر اچھے کاموں کا معاون، ہر ضرورت پر ہر ایک کے کام آنے والا جاتا رہا، خداوند رحیم وکریم کی بارگاہِ بے نیاز میں دعا ہے کہ وہ مرحوم کے اعمالِ نیک کو قبول فرماکر اس کو اپنی مغفرت کی دولت سے مالا مال کرے اور مرحوم کے خوردسال جانشین کو عمر و اقبال اور توفیق خیر سے بہرہ مند فرمائے۔

شعبان المعظم ۱۳۵۷ھ، اکتوبر ۱۹۳۸ء

پیر احسان اللہ شاہ صاحب

علمی حلقوں میں یہ خبر غم و افسوس کے ساتھ سُنی جائے گی کہ جھنڈا گوٹھ ضلع حیدر آباد سندھ کے مشہور عالم پیر احسان اللہ شاہ صاحب جو قلمی کتابوں کے بڑے عاشق تھے، چوالیس ۴۴ برس کی عمر میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو اس دنیا سے چل بسے، مرحوم حدیث و رجال کے بڑے عالم تھے، اُن کے کتب خانہ میں حدیث و تفسیر و رجال کی نایاب قلمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ مشرق و مغرب، مصر و شام، عرب و قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں ان کے کاتب و ناسخ نئی نئی قلمی کتابوں کی نقل پر معمور رہتے تھے، مرحوم ایک خانقاہ کے سجادہ نشین اور طریق سلف کے متبع اور علم و عمل دونوں میں ممتاز تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم پر اپنے انوارِ رحمت کی بارش فرمائے۔

رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ

نومبر ۱۹۳۸ء

سیٹھ ابراہیم مہتمم مدرسہ عمرآباد

عمرآباد مدراس میں حاجی عمر (روشن کمپنی) کا خاندان ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ حاجی صاحب امرتسر کے علمائے غزنویہ کے فیض سے مستفیض اور توحید وسنت کے متبع تھے، کامیاب تاجر تھے، اپنے ہی نام سے شمالی آرکاٹ میں ایک زمین خرید کر عمرآباد نام کا ایک مقام آباد کیا تھا اور وہاں ایک بڑے عربی مدرسہ دارالسلام کی بنیاد رکھی تھی، چند سال ہوئے کہ انہوں نے وفات پائی اور تین صالح اولادیں اپنی یادگار چھوڑیں، اسماعیل، ابراہیم اور اسحاق، سب سے بڑے اسماعیل تو کاروبار کے نگراں ہیں اور ابراہیم نے جو منجھلے تھے مدرسہ کی دیکھ بھال، اس کے قیام وترقی کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا تھا، ابھی پچھلے سال جوہری طنطاوی کی تفسیر کا اُردو ترجمہ ایک ہزار روپے کے صرف سے مطبع معارف میں چھپوایا تھا، مدرسہ کے لئے کتب خانہ تنہا اپنی ذات سے کتابیں خرید کر فراہم کیا تھا، اس کے لئے ایک عمارت بھی بنوائی تھی، افسوس کہ یہ پھول کھلنے سے پہلے مرجھا گیا، یعنی ۱۳؍رجب ۱۳۵۷ھ کو اس دنیائے ناپائیدار کو الوداع کہا، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ

نومبر ۱۹۳۸ء

غمِ کمال

آخر اُس عیسیٰ نفس کو بھی موت آگئی جس نے بیمار ترکی کو شفا اور اس کو موت کے پنجہ سے چھڑا کر زندگی بخشی تھی، دنیا نے اس کا ماتم کیا اور عجیب تر یہ ہے کہ انہوں نے بھی اس کا ماتم کیا جنہوں نے اس کو تختۂ دار پر چڑھانے میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی تھی، لیکن اس کی تلوار نے ہر بیڑی کو کاٹا اور ہر زنجیر کے ٹکڑے کیے اور پرانی ترکی کو جلا کر اس کی راکھ سے ایک نئی ترکی بنا کر کھڑی کی، ۱۹۲۰ء میں کون خیال کر سکتا تھا کہ اتحادیوں کے پنجۂ ستم سے بچ کر یہ شکار صحیح و سلامت نکل آئے گا، مگر اس کی تدبیروں نے آخر ہر تدبیر کو شکست دی، ڈاکٹر اقبال نے سچ کہا۔

قاہری با دلبری پیغمبری ست

ایسا سیاسی پیغمبر اگر کوئی ہوا ہے تو وہ مصطفیٰ کمال اتاترک تھا، جو تاج و تخت، خدم و حشم، باڈی گارڈ اور محافظوں کے دستہ کے بغیر ملک پر حکمرانی کرتا تھا، اس نے اسلام کے اس سیاسی رنگ کا دھندلا سا منظر پیش کیا تھا جس کے دیکھنے کو خلافتِ راشدہ کے بعد سے مسلمانوں کی آنکھیں بے تاب تھیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی مغفرت و رحمت کے فتوحات سے سرفراز فرمائے اور ان کی اجتہادی غلطیوں سے درگزر کرے۔

شوال ۱۳۵۷ھ

دسمبر ۱۹۳۸ء

مولانا سلیمان اشرف

چار سلیمانوں کی رباعی قاضی محمد سلیمان صاحب مصنف رحمۃ للعالمین کی وفات سے مثلث ہوگئی تھی، شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کی رحلت سے وہ فرد بن گئی تھی، اب اخیر اپریل ۱۹۳۹ء میں مولانا سلیمان اشرف صاحب (استاذ دینیات مسلم یونیورسٹی) کی موت سے مصرع ہو کر رہ گئی، دیکھنا یہ ہے کہ یہ مصرع بھی دنیا کی زبان پر کب تک رہتا ہے۔

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

مولانا سید محمد سلیمان اشرف صاحب مرحوم بہار کے ایک مردم خیز دیہات کے رہنے والے اور شرفا سادات کے خاندان سے تھے، ان کے والد مرحوم حکیم عبداللہ صاحب اوران کے اعمام محترم مولانا عبدالقادر صاحب، مولوی عبدالرزاق صاحب، مولوی عبدالغنی صاحب و مولانا عبیداللہ صاحب اہل علم و فقر تھے، مولانا مرحوم نے درس کا بڑا حصہ مولانا محمد احسن صاحب استھانوی بہاری سے حاصل کیا تھا اور کچھ دن دارالعلوم ندوہ میں بسر کئے تھے اور آخر میں منطق و فلسفہ کی آخری کتابیں مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب رامپوری ثم الجونپوری سے پڑھی تھیں، جو پورب میں خیرآبادی سلسلہ کے خاتم تھے، مولانا سید محمد سلیمان اشرف صاحب مرحوم کو حقیقت یہ ہے کہ اپنے استاد کے ساتھ عقیدت ہی نہیں بلکہ عشق تھا، اُن کے حالات وہ جب کبھی سناتے تھے تو ان کے طرزِ بیان اور گفتار کی ہر ادا سے ان کی والہانہ عقیدت تراوش کرتی تھی، مرحوم خوش اندام، خوش لباس، خوش طبع، نظافت پسند، سادہ مزاج اور بے تکلف تھے، اُن کی سب سے بڑی خوبی، اُن کی خودداری اور اپنی عزتِ نفس کا احساس تھا، ان کی

—ساری عمر علی گڑھ میں گزری، جہاں امراء اور ارباب جاہ کا تانتا لگا رہتا تھا، مگر انہوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی اور نہ ان میں سے کسی سے دب کر یا جھک کر ملے، جس سے ملے برابری سے ملے اور اپنے عالمانہ وقار کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر علی گڑھ کے سیاسی انقلابات کی آندھیاں بھی اُن کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکیں، علی گڑھ کے عشرت خانہ میں اُن کی قیام گاہ ایک درویش کی خانقاہ تھی، یہاں جو آتا، جھک کر آتا، اگر مجلس ساز گار ہوئی تو دعائیں لے کر گیا، ورنہ اُلٹے پاؤں ایسا واپس آیا کہ پھر اُدھر کا رُخ نہ کیا۔

وہ نہایت فیاض، کشادہ دست اور سیر چشم تھے، دو تین سال کے علاوہ ان کی ساری عمر تجرد کی حالت میں گزری، کوئی اولاد نہ تھی، خاندان کے عزیزوں سے طبیعت کو چنداں مناسبت نہ تھی، جو کچھ تھا احباب کے نذر تھا، استادزادوں اور دوستوں اور دوستوں کی اولادوں کیساتھ وہ کچھ کیا جس کو اس زمانہ میں مشکل سے کوئی دوسرا کر سکتا ہے، انتہا یہ ہے کہ مرتے دم تک جو کچھ چھوڑا وہ بھی نذرِ احباب۔

ان کی مجلس سدا بہار تھی، وہ خود سدا بہار تھے، فکر وغم کا ان کے ہاں گزر نہ تھا، اپنی ضعیف والدہ کی اطاعت اور اپنے ایک دیوانہ بھائی کی رفاقت اور خدمت میں عمر اس طرح گزاری کہ اسکی نظیر مشکل ہے، ان کی مجلس میں پچھلے علماء کے حالات اور ان کی خوبیوں کے تذکرے، اکثر رہا کرتے، کبھی کبھی کسی علمی مسئلہ پر اظہار خیال ہوتا، ان کی تقریر ومواعظ میں بڑی دلچسپی وگرویدگی تھی، ادھر بیس برس سے تقریر چھوڑ دی تھی، ایک دو جگہیں مخصوص تھیں، جہاں وہ سال میں ایک دفعہ میلاد پڑھا کرتے تھے، اُن کے مذہبی خیالات علمائے بریلی کے مطابق تھے اور ان کے بڑے مدّاح تھے، پھر بھی ان کی ملاقات اور میل جول ہر خیال کے لوگوں سے تھا، وہ کسی سے مناظرہ نہیں کرتے تھے اور جب کرتے تھے تو کھنچ جاتے تھے طبیعت میں ظرافت اور لطافت تھی، غصہ بھی جلد آجاتا تھا اپنے مزاج کے خلاف ایک حرف سُن نہیں سکتے تھے۔

تحریر وتالیف کا بھی ذوق تھا، خسرو کی ایک مثنوی پر مقدمہ لکھا ہے، حج کے مسائل اور عربی کے فضائل پر دو رسالے لکھے ہیں، ایک کتاب مبین نام عربی فیلالوجی پر لکھی تھی، جس پر ہندوستانی اکیڈمی نے پانچ سو کا انعام دیا تھا اور بھی متفرق مضامین لکھے تھے، یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ کے درس کے علاوہ عصر کے بعد قرآن پاک کی تفسیر پڑھایا کرتے تھے، خاص خاص شوقین طالب علم اس میں شریک ہوتے۔

ان کی وفات سے دو تین ہفتہ پہلے ان سے علی گڑھ میں ملاقات ہوئی تھی، کمزور ونحیف تھے، مسلسل بخار نے ان کو نیم جان کر دیا تھا، پھر بھی حسب دستور بعد عصر اپنی قیام گاہ کے برآمدہ میں مونڈھے پر بیٹھے تھے، احباب آس پاس حلقہ باندھے تھے اور وہ معروف خوش کلامی تھے، میں نے عمر پوچھی تو ٹال گئے، میں نے اپنی عمر کے اندازہ سے اُن کا اندازہ لگا کر عرض کیا کہ عجب نہیں کہ آپ کی پیدائش ۱۸۷۸ء کی ہو، ہنس کر بولے مجھے تو اپنی عمر آپ معلوم نہیں اور آپ کو معلوم ہے، یہاں تک کہ سنہ بھی بتادیا، اس انکار پر بھی میرا قیاس یہی ہے کہ ان کی پیدائش کا سال قریب قریب یہی ہوگا اور اس وقت ان کی عمر ساٹھ پینسٹھ کے بیچ میں ہوگی، دیکھنے میں تنومند اور صحیح معلوم ہوتے تھے، مگر اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے، اخیر ملاقاتوں میں اپنے وطن کے بعض دوستوں کی بے وقت موت اور عزیزوں کی محبت کی محرومی سے بے حد متاثر تھے، رحمۃ اللہ علیہ،

ربیع الاول ۱۳۵۸ھ

جون ۱۹۳۹ء

مولانا محمد عرفان خاں

ایک مجاہد کا ماتم

مولانا محمد عرفان خاں صاحب معتمد خلافت بمبئی کی ناگہانی وفات کی خبر اخباروں کے ذریعہ آپ تک پہنچی ہوگی، مرحوم ہزارہ سرحد کے رہنے والے تھے اور سلسلہ خیر آباد کے عالم معقولات اور مدرس تھے، ۱۹۲۰ء کی قومی تحریکات نے درس وتدریس کی مسند سے اٹھا کر قوم وملت کے اعلیٰ کاموں سے ان کو وابستہ کر دیا، ان کی سب سے مخلصانہ خدمت ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں ملکانوں کے فتنۂ ارتداد کے موقع پر ان کی جاں بازی، ایثار ومحنت ہے، ان کے علاقوں میں بیسیوں میل پیادہ اور بھوکے پیاسے سفر کرنا اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں مارے مارے پھرنا، ان کی زندگی کا اہم کارنامہ ہے، اس کے بعد انہوں نے جمعیۃ العلماء دہلی سے وابستہ ہو کر جمعیۃ کے کاموں کو کچھ زمانہ تک انجام دیا اور شریف حجاز اور ابن سعود کی لڑائی کے زمانہ میں حجاز جاکر معاملات کی تحقیقات کے لئے نامزد ہوئے، پھر ۱۹۲۶ء میں موتمر اسلام کی شرکت کے لئے گئے اور وہاں سے واپسی پر وہ بمبئی کی مجلس خلافت کے کاموں میں مصروف ہوگئے اور اسی مصروفیت میں ان کی زندگی کے آخری سال بسر ہوئے، ان کی عمر اس وقت پچاس سے زیادہ نہ ہوگی، بلند وبالا، مضبوط وقوی تھے، ایک دفعہ وہ قومی تحریکوں کے سلسلہ میں قید بھی ہوئے تھے اور اسی قید میں انہوں نے یہ سعادت پائی کہ حافظ قرآن ہوئے۔

مرحوم نہایت دوست پرور، ہنس مکھ، ظریف اور فیاض تھے، صوبہ سرحد سے

وہ مدتوں جلاوطن رہے، جلاوطنی کا دَور ختم ہوا، تب بھی وطن جاکر اپنی خدمات کی وسعت کو انہوں محدود کرنا پسند نہیں کیا، تمام عمر مجرّد رہے اور اسی طرح پوری عمر گزار دی، ایک طرف وہ فقیر بے نوا تھے، دوسری طرف حد درجہ غیور و شریف، غالب کا مصرع آج ہی صادق آیا ہے

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ربیع الاول ۱۳۵۸ھ

مئی ۱۹۳۹ء

مولانا شوکت علی

ہندوستان کی اسلامی دنیا گزشتہ مہینہ ایک اور صدمۂ عظیم سے دوچار ہوئی، یہ مولانا شوکت علی صاحب کی ناگہانی موت کا سانحہ ہے، یہ وہ شخصیت ہے جس نے تیس برس تک مسلمانوں کی خدمت کی، وہ نہ عالم تھے، نہ مقرر تھے، وہ جیسا کہ خود کہا کرتے تھے سپاہی تھے، ان تھک کام کرنے والے، نڈر، پُردل اور پُرامید، وہ کبھی کسی حال میں نااُمید نہیں ہوتے تھے، اُن کی تقریر چند فقروں کی ہوتی تھی، مگر وہ فقرے لوگوں میں رُوح پھونک دیتے تھے، وہ اپنے ساتھیوں کو بھی کبھی مایوس نہیں ہونے دیتے تھے، یہ انہیں کا کام تھا کہ ۱۹۲۰ء سے مرتے دم تک سارے ہندوستان کو چھان مارا تھا، تیس برس کی جانکاہ محنت کے بعد موت نے سپاہی کی کمر کھول دی اور وہ ابدی آرام کے لئے دائمی نیند سو گیا، جامع مسجد دلّی کی سیڑھیاں ان کی خواب گاہ بنیں بچشم اعتبار اس کے لوحِ مزار پر یہ شعر کندہ پائے گی۔

زباں دانِ محبت بودہ ام دیگر نمیدانم
ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید اینجا
حزیں از پائے رہ پیمائے بسر گشتگی دیدم
سرِ شوریدہ بر بالینِ آسایش رسید اینجا

میری ان کی سب سے پہلی ملاقات ۱۹۱۲ء میں ہوئی، بنگلور میں اسلامی تعلیمی کانفرنس تھی، وہ لکھنؤ کی سمت سے اور مجھے مولانا شبلی مرحوم نے بمبئی سے بھیجا تھا،

ہم دونوں کا ساتھ اس گاڑی میں ہوگیا، جو دونوں سمتوں کے مسافروں کو لے کر بنگلور جاتی تھی، رات کا وقت تھا، وہ اس زمانہ میں نوکری سے الگ ہوکر آغا خان کے سکریٹری کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی کے لئے چندہ جمع کر رہے تھے، وہ پہلے بھی صاحب تھے اور اس وقت بھی پورے صاحب تھے۔

اس وقت ایک واقعہ یاد آگیا، تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد میں نے عشاء کی نماز کی تیاری کی، مرحوم نے اس وقت کہا مولانا! میرا بھی جی نماز پڑھنے کو بہت چاہتا ہے، مگر کیا کروں، وضو کے پانی سے قمیض کے کف اور کالر خراب ہوجاتے ہیں، بات آئی گئی ہوگئی چند ہی سال کے بعد خدام کعبہ اور خلافت کی تحریک میں وہ اٹھے، تو پھر دیکھا کہ نہ وہ کوٹ ہے، نہ پتلون ہے، نہ کف ہے، نہ کالر۔ موٹے کپڑے کا کُرتا اور پاجامہ ہے۔ وضو بھی ہوتا ہے، نمازیں بھی ہوتی ہیں، جسم کی ضخامت کے سبب سے سجدہ میں جھک نہیں سکتے تھے، چارزانو بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے، جھک کر سجدہ کرتے تھے، اللہ مغفرت فرمائے۔

شوال ۱۳۵۷ھ

دسمبر ۱۹۳۸ء

مولانا فضل حق صاحب رامپوری
اور
مولانا معین الدین اجمیری

افسوس ہے کہ پچھلے دو مہینوں میں ہماری قدیم تعلیم کے خزانہ کے دو انمول موتی کھو گئے، ایک مولانا فضل حق صاحب رامپوری جو مدرسہ عالیہ رامپور میں مدرس اعلیٰ تھے، موصوف نے نصف صدی تک علوم اسلامیہ کی تدریس کا فرض انجام دیا تھا، ۸۱ برس کی عمر میں دار فانی کو الوداع کہا۔

اور اب ۱۰ محرم ۱۳۵۹ھ کی دوپہر کو مولانا معین الدین اجمیری نے جن کو سلسلۂ خیرآباد کا خاتم کہنا چاہیے، وفات پائی۔ مرحوم مولانا برکات احمد صاحب ٹونکی کے ارشد تلامذہ میں تھے اور تمام عمر درس و تدریس میں گزار دی، حضرت خواجہ معین الدین صاحب چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے احاطۂ مزار میں شاہجہانی مسجد کے زیر سایہ فضل و کمال کا یہ خزانہ زیر خاک کیا گیا، رحمہا اللہ تعالیٰ۔

میر احدی اجمیری نے خوب کہا۔

ہے سنہ تیرا سو انسٹھ عشرۂ ماہِ محرم ہے — ہمیں اس ابتدائی ماہ میں بے انتہا غم ہے
امام الوقت مولانا معین الدین کی رحلت سے — بپا اجمیر میں امسال اُن دُہرا محرم ہے،

مرحوم ہندوستان کی سیاسیات میں بھی دلچسپی رکھتے تھے اور رحمۃ اللہ لعل ہند کے بسر بعض جلوس کے صدر بھی رہے تھے، آزاد خواہی کے بھی خوگر رہ چکے تھے[1]

---

[1] مولانا پر محرم ۱۳۵۹ھ مطابق مارچ ۱۹۴۰ء میں اس قدر مضمون لکھا گیا پھر اپریل ۱۹۴۰ء میں مفصل مضمون شائع ہوا وہ اگلے صفحہ سے شروع ہوتا ہے۔

۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ عین عاشورہ کے دن علم و عمل فضل و کمال، مجاہدہ و استقامت اور تقویٰ و طہارت کی ایک ایسی مسند خالی ہوئی جو غالباً عرصہ دراز تک خالی رہے گی، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

اس سے ہماری مراد حضرت مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ ارتحال ہے، یہ حادثہ محض مولانا کے اہل خاندان یا مسلمانانِ اجمیر ہی کے لئے نہیں ہے، بلکہ سارا اسلامی ہند اس سے متاثر اور اپنی کم نصیبی پر نوحہ کناں ہے۔

وَمَا کَانَ قَیْسٌ ھُلْکُہٗ ھُلْکَ وَاحِدٍ
وَلٰکِنَّہٗ بُنْیَانُ قَوْمٍ تَھَدَّمَا

مولانا ایک نومسلم گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، والد ماجد مولانا عبد الرحمٰن صاحب مرحوم بلیا کے رہنے والے نومسلم راجپوت تھے اور والدہ بھی داخلِ اسلام ہوئی تھیں اور داناپور (بہار) ان کا گھر تھا تعلق راجپوتانہ سے اسطرح پیدا ہوا کہ مولانا عبد الرحمٰن صاحب ریاست ٹونک میں سکریٹری کونسل تھے، چار یا پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ تھی، اسی علاقہ میں دیولی (راجپوتانہ) میں ۲۵ صفر ۱۲۹۹ھ کو پیدا ہوئے اور باپ کے زیر سایہ زندگی کی ابتدائی منزلیں طے ہوئیں، بچپن ہی سے سعادت و فیروزمندی کے آثار نمایاں تھے، چنانچہ دولت و ثروت کی گود میں پلنے والے اس نوجوان نے ہمیشہ طالبعلموں میں مساوات ہی کی زندگی بسر کی، امیرانہ ٹھاٹھ اور رئیسانہ شان کا کبھی مظاہرہ نہ کیا۔

قسمت کی خوبی اور نصیب کی بلندی نے خاتم المحققین حضرت مولانا سید برکات احمد صاحب (بہاری، ثم) ٹونکی سے تلمذ کا رشتہ قائم کرایا، اس تعلق سے مولانا کا سلسلۂ تلمذ یہ ہے۔

حضرت مولانا معین الدین صاحب اجمیری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا سید برکات احمد صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا عبد الحق صاحب خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] مولانا کی وفات کے سلسلہ میں احباب نے خطوط اور مضامین میں جو کچھ لکھ کر بھیجا تھا اس مضمون میں وہ تمام معلومات یکجا کر دیئے گئے ہیں، ان سب دوستوں کی اطلاعات کا شکریہ۔ (س)

حضرت مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا فضل امام صاحب خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مُلّا عبدالواجد صاحب خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مُلّا اعلم صاحب سندیلی رحمۃ اللہ علیہ

استاذ الکل حضرت مُلّا نظام الدین[لہ] صاحب سہالوی رحمۃ اللہ علیہ

جملہ معقول و منقول کی تکمیل مولانا برکات احمد صاحب ہی سے ہوئی، علم ریاضی حضرت مولانا لطف اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل فرمایا، بائیس سال کی عمر میں علوم میں ایسا رسوخ ہوگیا کہ جسکی نظیر کم دیکھی گئی ہے، اسی وقت سے درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہوگیا، ہندوستان اور ہندوستان سے باہر بلخ، بخارا، چین، افغانستان اور دوسرے ممالک سے طلبہ جوق درجوق آنا شروع ہو گئے، اسی زمانہ میں ایک خاص واقعہ نے آپ کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبدالحق صاحب، صاحبِ تفسیر حقانی کے زیر اہتمام آریوں سے ایک مناظرہ ترتیب پایا تھا، آریوں کی طرف سے پنڈت داشنا نند جی بحث کر رہے تھے، مسلمانوں کی طرف سے بھی بڑے بڑے مناظر گفتگو کر رہے تھے، تین دن سے سلسلہ جاری تھا، جب مولانا کی باری آئی تو آپ نے رُوح، مادہ پر میشر کی قدامت کے سلسلہ میں حدوث و قدم کی طویل بحث کو اس خوبی سے بیان فرمایا کہ صرف سات منٹ میں پنڈت جی لاجواب ہوگئے اور موافق و مخالف آپ کے تجرِ علمی کے قائل ہو گئے، اسی قسم کا ایک مکالمہ ہز ہائنس نواب حامد علی خان مرحوم والی رامپور کی تحریک پر مولانا عبدالوہاب صاحب منطقی بہاری مرحوم سے ایک خالص علمی مسئلہ پر ہوا تھا، جس کا نتیجہ بصورتِ کتاب شائع ہو چکا ہے۔

لہ معارف: مشہور یہی ہے کہ مُلّا اعلم سندیلی مُلّا نظام الدین سہالوی کے براہِ راست شاگرد تھے، مگر میری تحقیق میں یہ صحیح نہیں ہے مُلّا اعلم مُلّا کمال الدین سہالوی کے شاگرد تھے اور وہ مُلّا نظام الدین کے" س"

ڈھائی سال مدرسہ نعمانیہ لاہور میں صدر مدرس رہنے کے بعد ۱۳۲۶ھ میں اجمیر کو شرف سکونت بخشا اور ۱۳۲۷ھ میں مدرسہ معین الحق قائم کیا، سرکار نظام جب اجمیر شریف لائے اور حضرت مولانا کے درس میں مسلسل چھ وقت شریک ہوئے تو اس قدر متاثر ہوئے کہ خلعتِ شاہانہ سے سرفراز فرمایا، اور مولانا انوار اللہ صاحب رحمۃ اللہ کی تحریک پر مدرسہ معین الحق کو معینیہ عثمانیہ قرار دے کر ساڑھے بارہ سو روپے ماہانہ اس کے لئے جاری فرمادیا، مولانا اس مدرسہ کے صدر مدرس ہوئے اور پندرہ سال تک یہاں درس دیا، ۱۳۳۷ھ میں کارپردازان مدرسہ اور مولانا میں اختلاف ہوا، چنانچہ انہوں نے استعفار دے کر محرم ۱۳۳۸ھ میں دارالعلوم حنفیہ صوفیہ کے نام سے ایک دوسرا مدرسہ قائم فرمایا، اور ۱۲ سال تک اس مدرسہ کے طلبہ کو اپنے فیوض علمی و عملی سے سرفراز فرمایا، یہ مدرسہ اب تک قائم ہے اور شہر کے غریب مسلمان اس کو چلاتے ہیں، دارالعلوم معینیہ عثمانیہ سے علیحدگی کے باوجود اس کے اراکین، مدرسین، طلبہ اور دیگر متعلقین سے تعلقات خوش گوار رہے، ۱۳۵۱ھ میں مدرسہ کے اراکین حضرت مولانا کو پھر اپنے یہاں واپس لائے، لیکن سیاسی اختلافات کے نتیجہ کے طور پر ۱۲ مارچ ۱۹۳۸ء کو بحکم سرکار نظام دارالعلوم معینیہ عثمانیہ سے آپ الگ ہو گئے، لیکن اس علیحدگی کے بعد بھی حلقۂ درس پوری آب وتاب کے ساتھ قائم رہا۔

اس زمانہ درس وتدریس میں دوسرے علمی مشاغل بھی جاری رہے، چنانچہ مولانا نے تصانیف کا ایک معتدبہ ذخیرہ چھوڑا ہے، جس کا اکثر حصہ ابھی طبع نہیں ہو سکا ہے، مثلاً ترمذی شریف کا ایک ناتمام حاشیہ، وجود علم ومعلوم، کلی طبیعی اور مسئلہ دہر پر مکمل اور جامع تقریریں، حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی محققانہ سوانح عمری وغیرہ! یہ چیزیں انشاء اللہ جب اہل علم کے سامنے آئیں گی، اس وقت ان کو معلوم ہوگا کہ اجمیر کے اس بوریا نشین کی نگاہِ تحقیق کتنی بلند تھی۔

آخری زمانہ میں درگاہ بل کی اصلاح کے متعلق جو فتویٰ مولانا نے مرتب فرمایا تھا وہ اس قدر جامع اور موثر تھا کہ ایک طرف تو ہندوستان اور حرمین کے علماء نے اس کی تائید کی اور دوسری طرف ممبرانِ اسمبلی نے اس بل کے ان تمام نقائص کو دور کیا، جن کا شریعت اسلام سے تصادم ہوتا تھا۔

یہ تھی مولانا کی علمی زندگی! عملی زندگی کا یہ حال تھا کہ اجمیر میں صدہا بدعات کا خاتمہ کیا، اسلامی نقطۂ نظر سے ملک کی صحیح رہنمائی میں باوجود مشکلات کے کبھی مطلق کمی نہیں فرمائی۔

تحریکِ خلافت میں مذہبی فتویٰ کے جرم میں دو سال کی قید و بند کو اس پامردی اور عالی ہمتی سے برداشت کیا کہ علی برادران نے قدم چوم لیے، جس زمانۂ ابتلاء میں مولانا کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء اور مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ العلماء قید و نظر بندی کی تکلیفیں اٹھا رہے تھے، اس وقت تحریک کی رہنمائی کے لئے آپ ہر ہفتہ دہلی تشریف لیجاتے اور جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد مسائلِ حاضرہ پر تقریر فرماتے، جمعیۃ العلماء کے اجلاسِ امروہہ کی صدارت فرمائی اور مستقل نائب صدر رہے، صوبۂ راجپوتانہ کی مجلسِ خلافت کو آپ کی صدارت کا ہمیشہ فخر حاصل رہا، تحریکِ کشمیر کے زمانہ میں مجلس احرار اسلام کے ڈکٹیٹر رہے، مسلمانوں کے سوا برادرانِ وطن بھی آپکی سیاسی بصیرت کے معترف اور اس سے متاثر تھے۔

ان علمی اور سیاسی مشاغل کے ساتھ ساتھ سلوک اور تزکیۂ باطن کی طرف بھی پوری توجہ تھی، مولانا کے والد حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی سے بیعت تھے اور خود مولانا شاہ صاحب کے صاحبزادہ حضرت مولانا شاہ عبدالوہاب صاحب (والد حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم) سے بیعت تھے۔

استغناء، رجوع الی اللہ، توکل، وغیرہ آپ کی طبیعت ثانیہ بن چکے تھے آخری سال

توبڑے ہی صبر و استقامت اور متوکلانہ زندگی کے تھے، فرائض تعلیم و افتاء اور رشد و ہدایت کی ادائیگی کے بعد کبھی لوگوں میں بلاضرورت نہ ٹھہرتے، ارباب دولت، اہل دنیا، خصوصاً امراء و حکام سے ہمیشہ بے تعلق رہے، لیکن جب کوئی خدمت والا میں حاضر ہوتا تو اپنے قلب میں مولانا کے اخلاق فاضلہ کا خاص اثر لے کر واپس جاتا۔

عبادت کا یہ حال تھا کہ فرائض کے سوا نوافل و مستحبات کے بھی ہمیشہ پابند رہے، تادم واپسیں اپنے اوراد و اشغال میں فرق نہ آنے دیا، حق گوئی میں کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی نہیں ڈرے، اسلاف کی سنت کے مطابق قید و بند کی مصیبت سے بھی دوچار ہوئے لیکن اس کو بھی ہنسی خوشی برداشت کیا اور ہمیشہ وہی کیا جو ایک مجاہد اور ربانی عالم کو کرنا چاہیئے۔

ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ بخاری وغیرہ میں جب یہ حدیث آتی کہ حضورؐ کے مرض وفات کی تکلیف دیکھ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بے اختیار پکار اٹھیں، "یا ابتاہ" (اے میرے باپ) سرکار دو عالمؐ نے فرمایا لَا كَرْبَ عَلٰى أَبِيكِ بَعْدَ الْيَوْمِ (آج کے دن کے بعد تمہارے باپ پر مصیبت نہیں ہے) تو اس جملہ پر حضرت مولانا بیتاب ہو جاتے، آنسو نکل آتے، چیخ نکل جاتی، بسا اوقات غشی طاری ہو جاتی، مدرسہ میں درس دیتے وقت ہر مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا ہے۔

طلبہ اور علماء سے بہت محبت فرماتے تھے، ہونہار طالب علم مولانا کا مرکز توجہ بن جاتا تھا، ہر سال موسم بہار میں طلبہ کا ایک تفریحی جلسہ جس کو اجمیر کی اصطلاح میں "گوٹ" کہتے ہیں، منعقد ہوتا، اس جلسہ میں ہر ملک کے طلبہ کے مروجہ کھیلوں کا مظاہرہ ہوتا تھا، مولانا طلبہ کی خاطر اس تفریحی اجتماع میں بھی شرکت فرماتے، بیت بازی ہوتی، اس میں ایک فریق کی طرف مولانا بھی ہوتے، آپ ہی کا فریق اکثر غالب رہتا، اس لئے کہ مولانا کو اردو و فارسی کے ہزارہا اشعار یاد تھے۔

یہ واقعہ حیرت کے ساتھ سنا جائے گا کہ مولانا کو ڈیڑھ سو روپیہ مشاہرہ پاتے تھے،

لیکن تیس روپیہ ماہوار کے سوا باقی پوری رقم طلبہ، سامانِ تعلیم اور نادر کتب کی فراہمی پر صرف کر دیتے تھے، کتاب کتنی ہی قیمتی ہو لیکن امکان بھر اس کو ضرور خریدتے، خواہ دوگنی، سہ گنی قیمت ادا کرنی پڑتی، مگر بہتر نسخہ خریدتے، قرآن پاک بہتر سے بہتر طباعت کے مہیا فرماتے، کلکتہ کے بہترین کارخانہ میں بھیج کر اعلیٰ قسم کی جلدیں بندھواتے تھے۔

۵ر محرم الحرام ۵۹ھ کو ایسا بیمار ہوئے کہ آخر وقت تک پاؤں سے معذور رہے، دل، دماغ البتہ صحیح رہے اور اس حالت میں بھی سلسلۂ درس و تدریس جاری رہا، وفات سے دس یوم بیشتر تک حدیث کے اسباق ہوتے رہے۔

زندگی ہی میں عرصہ دراز سے گورِ غریباں کو اپنا مسکن بنالیا تھا، احباب کے اصرار سے وہیں ایک مختصر مکان بن گیا تھا، جس کی تکمیل دار العلوم کی اس رقم سے ہوئی، جو کمیٹی نے بطورِ اعتراف خدمات مولانا کو پیش کی تھی، اسی مکان میں مولانا کا انتقال ہوا، ہزارہا مسلمانوں نے جنازہ میں شرکت کی، جنازہ کی چارپائی میں لمبی لمبی بلّیاں باندھی گئی تھیں، بیک وقت پچاسوں مسلمان کندھا دیتے تھے، پھر بھی ہجوم اور لوگوں کے اشتیاق کی کوئی حد نہ تھی۔ خواجہ اجمیری کی درگاہ میں مسجد شاہجہانی کے زیر سایہ تدفین ہوئی، قبر میں اتارتے وقت در و دیوار اور درختوں پر انسانوں کا ہجوم تھا، پس ماندگان میں دو بچے (مولوی عبد الباقی صاحب اور ایک صاحبزادی) اور ایک بیوہ ہیں۔

اجمیر کے قیام کی مدت ۴۲ سال اور کل مدتِ حیات ۶۰ سال ہے۔

یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ ٹھیک عاشورۂ محرم میں جب لوگ واقعۂ کربلا سے سوگوار تھے۔ اس شہیدِ علم و عمل نے دنیا سے کوچ کیا اور اجمیر میں اہلِ دل نے دوہرے محرم کا سوگ کیا۔

صفر ۱۳۵۹ھ

اپریل ۱۹۴۰ء

پروفیسر مارگولیوتھ

انگلستان کے مشہور مستشرق پروفیسر مارگولیوتھ نے ۸۲ برس کی عمر میں وفات پائی، یہ نسلاً یہودی تھے، پھر عیسائی ہو گئے تھے، اس سے ظاہر ہے کہ ان کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے اکہری نہیں بلکہ دوہری عداوت تھی، ان کی عمر بھر کا سرمایہ اسلام پر مہذب غارت گری ہے اور یہی سبب ہے کہ خود یورپ کے سنجیدہ طبقہ میں بھی وہ احترام کی نظر سے نہیں دیکھے گئے، ان کی سب سے بڑی کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے، جس کو دیکھ کر مولانا شبلی مرحوم بے چین ہو گئے تھے اور اپنی سیرت نبوی کی بنیاد ڈالی تھی، جس نے بحمد اللہ کہ ملک میں سیرت پاک کی تالیف ونشر واشاعت کا ذوق پیدا کیا۔

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

پروفیسر صاحب جب ۱۹۱۶ء میں ہندوستان آئے تھے تو اُن سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی، پھر ۱۹۲۰ء کے سفر لندن میں اُن سے ملنے اور خط وکتابت کرنے کا اتفاق ہوا۔

صفر ۱۳۵۹ھ

اپریل ۱۹۴۰ء

مفتی محمد انوار الحق صاحب

بھوپال سے مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم۔ اے، خلف مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی سابق وزیر تعلیم وحال وزیر مالیات بھوپال کی وفات کی افسوس ناک خبر آئی ہے، موصوف صاحبِ علم، اور محب دین تھے، اُن کی قلمی خدمات اور تحریری مجاہدات بھی خاص ذکر کے قابل ہیں، تاریخ الالبشر، اثبات، واجب الوجود اور دوسری مذہبی کتابیں جدید تعلیمیافتہ طبقہ کے لئے بہت مفید ثابت ہوئیں، عمر بھر علمی و تعلیمی کاموں کی مشغولیت کے باوجود اخیر عمر میں سرکار بھوپال کے مالیات کے صیغہ کو جس خوبی سے سنبھالا، دوست دشمن، ہر ایک نے اس کی تحسین کی، اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ رحمت سے ان کو مالا مال کرے۔

جمادی الاول ۱۳۵۹ھ

جولائی ۱۹۴۰ء

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی داروغہ حیدربخش کی مسجد کے نیچے کتابوں کی ایک چھوٹی سی دُکان پر بیٹھا کرتے تھے، مگر خدا جانے کیا بات ہے، یہ چھوٹی سی معمولی حیثیت کی دکان نصف صدی تک لکھنؤ کے اہلِ علم وادب کا مرکز بنی رہی اور میں نے بھی چالیس برس اسی چھوٹی سی دُکان کو اسی طرح علم وادب کے قدرشناسوں کا مرکز دیکھا، اس وقت جب لکھنؤ کا چوک بجلی اور گیس کی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا، یہی دکان تھی جس پر پُرانا مٹی کا چراغ جلا کرتا تھا اور دنیا کو وضعداری کی روشنی دکھاتا تھا، افسوس کہ زبان وادب کا یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی بجھ گیا۔

خواجہ صاحب گو خود غیر معمولی شاعر نہ تھے، مگر لکھنؤ کے بڑے بڑے شاعروں کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے، بحر مرحوم کے شاگرد تھے، نظم سے زیادہ نثر لکھتے تھے، اور لکھنؤ کی بول چال اور محاوروں اور روزمرہ کو بخوبی برتتے تھے، نیک مزاج، وضعدار اور قناعت پسند تھے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

جمادی الاول ۱۳۵۹ھ

جولائی ۱۹۴۰ء

نواب اختر یار جنگ

حیدر آباد میں اودھ کے ایک مشہور و ممتاز میناٸی خاندان کے فرد فرید نے بھی ہماری دنیائے فانی کو الوداع کہا، منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کے خلف الرشید نواب اختر یار جنگ بہادر جنہوں نے دکن میں امیر مرحوم کی وفات کے بعد سے دکن کو شاہ دکن کی نوازشوں سے اپنا وطن بنالیا تھا اور معتمد امور مذہبی کی حیثیت سے سینکڑوں مفید خدمات انجام دیں اور ہر نیک کام کی امداد میں سبقت کی اور اب چند سال سے پنشن پاکر عزت کی زندگی بسر کر رہے تھے، اب وہ ہمیشہ کے لئے بزم حیات سے رخصت ہو گئے، اللہ تعالیٰ ان کی نیک خدمات کا نیک صلہ عنایت فرمائے، وہ شاعر بھی تھے اور اختر تخلص کرتے تھے۔

جمادی الاول ۱۳۵۹ھ

جولائی سنہ ۱۹۴۰ء

مہاراجہ سرکشن پرشاد

پچھلے مہینہ ملک میں کئی افسوسناک موتیں ہوئیں، یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشادؔ جنہوں نے پورے ۳۷ برس تک دکن کے سیاسی و انتظامی معاملات کی سربراہی کی وفات پائی ۱۹۰۲ء میں وہ دولت آصفیہ کے پیشکار و صدر اعظم مقرر ہوئے اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ برابر اپنے عہدہ پر فائز رہے، وہ راجہ ٹوڈرمل کی یادگار تھے، اصلی وطن لاہور اور پھر دہلی ہوا اور یہاں سے آصف جاہ اوّل کے ساتھ ان کا خاندان دکن منتقل ہوا اور ہمیشہ شاہانِ آصفیہ کے سیاسی و مالی مہمات میں کارپرداز بنا رہا۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد، عربی، فارسی اور انگریزی تین زبانوں سے واقف تھے اور تینوں میں باتیں کرتے تھے، علمی مذاق سُتھرا تھا، شعر و سُخن کا چسکا رکھتے تھے، تصوف میں وحدۃ الوجود کے عقیدہ کے نہایت سخت معتقد اور حامی تھے اور اسی کو ہندو مسلم اتحاد کا ذریعہ سمجھتے تھے، سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی یادگار میں کبھی کبھی عقیدت کا اظہار کرتے تھے، ان کی ایک نعت کو یہ شرف حاصل ہے کہ مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے پیچھے کتب خانہ شیخ الاسلام کی ایک دیوار پر آویزاں ہے، مرنج و مرنجاں، شریف، وضعدار اور پرانی شریفانہ خصوصیات کی اپنی مثال آپ تھے۔

جمادی الاوّل ۱۳۵۹ھ

جولائی ۱۹۴۰ء

محمد حمید سعید بے

افسوس ہے کہ مصر کی ایک بہت بڑی ہستی سے دنیا خالی ہوگئی، عبدالحمید سعید بے مصر کے اُن جواں مردوں میں تھے جو مصر چھوڑ کر یورپ میں رہ پڑے تھے اور یہ عہد کر لیا تھا کہ جب تک مصر آزاد نہ ہولے گا وہ مصر کی زمین میں قدم نہیں رکھیں گے، مصر اور انگلستان کے گزشتہ معاہدہ کے بعد وہ مصر واپس آئے تھے، میری ان کی ملاقات ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے دوسرے ارکان کے ساتھ اٹلی کے پایۂ تخت رومہ میں ہوئی تھی، وہ اپنے قد و قامت اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے شوکت علی مرحوم سے ملتے جلتے تھے اور انہی کی طرح قومی و مذہبی جوش و خروش سے بھرے ہوئے تھے ایک بہت موٹا ڈنڈا جس کے موٹھ میں اہرام مصری کی شکل بنی ہوئی تھی، اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے، انہوں نے اُس وقت تک شادی نہیں کی تھی، کہتے تھے کہ غلاموں کی تعداد بڑھانے سے فائدہ کیا۔

وہ پہلے بالکل وطن پرور یا نیشنلسٹ تھے، مگر مصر آنے کے بعد ان کے حالات میں ایک نیا تغیر ہوا، انہوں نے عالمگیر اسلامی برادری (پین اسلامزم) کی تحریک مصر کے نوجوانوں میں شروع کی، انجمن شبان المسلمین کی بنیاد ڈالی، اس کی شاخیں مصر کے اطراف میں پھیلائیں اور اس کی کوشش کی کہ دنیائے اسلام کے دوسرے حصوں میں اس کی شاخیں قائم ہوں چنانچہ بمبئی میں اس کی ایک شاخ قائم ہے، چند سال ہوئے کہ انہوں نے اپنی محبت سے مصر کی شبان المسلمین کا ممبر خاکسار کو بھی بنایا جامع ازہر کی طرف سے جو

وفد ہندوستان آیا تھا اس کے ایک رکن انجمن شبان المسلمین کے بھی نمائندہ تھے اور مقصد یہ تھا کہ مصر و ہندوستان کی اسلامی برادریوں میں تعلقات مضبوط کیے جائیں۔

ان کی اس تحریک سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ مصری نوجوان جو غلام قوم کی وطن پروری یا قومیت پرستی کے سیلاب میں بہے جارہے تھے وہ پلٹے اور اسلام کا سفینۂ نجات انکو دکھائی دیا، وہ مصری پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے۔ انہوں نے اور ان کے رفقاء نے مصر کی حکومت پر بار بار زور ڈالا کہ جب تک مصر کا سرکاری مذہب اسلام ہے احکام اسلامی کے مخالف کوئی قانون اس پارلیمنٹ سے پاس نہیں ہوسکتا، ہندوستان کی طرح یورپ کی برکت سے دوسرے محکوم اسلامی ملکوں میں بھی "بدکاری" کو قانونی جواز کی سند مل گئی ہے، مرحوم پہلے شخص تھے جنہوں نے اس کے خلاف پوری جدوجہد کی اور لوگوں نے ان کا ساتھ دیا۔

آج کل جب مسلمان عام طور سے وطن اور اسلام کے حقوق کے درمیان تطبیق کی کوئی راہ نہیں پارہے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ایک کے حقوق کی پاسداری دوسرے کے حقوق کی ادائیگی سے دست کشی ہے، مرحوم کی شخصیت خاص طور سے اہمیت رکھتی تھی، اور مصر کے نوجوانوں کے درمیان صحیح رہنمائی کی کفیل تھی، اللہ تعالیٰ اس جوش عشق کے مجسمہ کو اپنی مغفرت سے بامراد کرے۔

شعبان ۱۳۵۹ھ

ستمبر ۱۹۴۰ء

مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری

افسوس ہے کہ مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری نے دوڈھائی برس کی سخت علالت کے بعد اپنے وطن جونپور میں ۲۳ر شعبان ۱۳۵۹ھ مطابق ۲۶ ستمبر ۱۹۴۰ء کی رات کو ۳ بجے اس جہان فانی کو الوداع کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

مرحوم جونپور کے ایک مشہور علمی خاندان کے فرد تھے، ان کے دادا مولانا سخاوت علی صاحب، مولانا شاہ عبدالحئی صاحب دھلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید کے فیض یافتہ اور پورب میں توحید وسنت کے سب سے بڑے داعی اور اس دور میں اسلامی علوم فنون کے بہت بڑے مدرس تھے، جونپور میں بیٹھ کر تن تنہا سینکڑوں علمائے دین پیدا کئے اور پورب کے خطہ میں ان کو جگہ جگہ پھیلا کر اس نازک موقع پر اسلام کی مورچہ بندی، ہجرت کر کے بعد کو مدینہ منورہ چلے گئے تھے اور وہیں وفات پائی، راقم کو بھی یہ فخر حاصل ہوا کہ اس کے دادا کے حقیقی بھائی انہیں کی مجلسِ درس سے مستفیض تھے۔

مولانا کا پورا خاندان اس وقت سے اب تک علمائے دین کا خانوادہ ہے، جس کی سعی وکوشش نے پورب کی سرزمین کو بڑا فیض پہنچایا، مولانا مرحوم نے بچے کی تعلیم گھر میں پاکر مولانا عبداللہ صاحب غازیپوری سے مدرسہ احمدیہ آرہ، جاکر علوم کی تحصیل کی اور واپس آکر اپنے خاندانی مدرسہ کے اہتمام وانتظام کا اور ساتھ ہی ملک کے مختلف گوشوں میں جاکر ہدایت وارشاد کا کام انجام دینا شروع کیا۔

موصوف سے میری ملاقات ۱۹۲۰ء میں تحریکِ خلافت کے سلسلہ میں ہوئی۔ یہ ملاقات دوستی اور دوستی سے اتحاد کی اس منزل تک پہنچ گئی، جس کے بعد خیال کی دوئی

کا کوئی مرتبہ نہیں رہتا، ایک دفعہ میں نے کہا اور انہوں نے مانا تھا کہ ایک مذہب ہے جس کے دو ہی پیرو ہیں، ایک وہ اور ایک میں، مقصود تقلید و عدم تقلید کے مسائل میں اعتدال سے تھا، ابھی جب ان کے مرنے سے دو ہفتہ پہلے میں جونپور ان کی عیادت کو گیا، تو زبان سے ٹھیک طور پر بول نہ سکے، مگر غیر مفہوم آواز میں دو انگلیوں کو اٹھا کر اپنی طرف اور میری طرف اشارہ کیا، کیسا حسرتناک منظر تھا، چلتے وقت کا سلام اور فی امان اللہ اور فی حفظ اللہ کا ابدی پیام!

میں نے علماء میں ایسا شریف، ایسا نیک باطن، ایسا دور اندیش، ایسا فیاض، ایسا سادہ مزاج، اس پر ایسا مستقل مزاج، خوش اخلاق، شیریں گفتار، باغ و بہار، ایسا خشک اور ایسا تر آدمی نہیں دیکھا، ایسا متقی و پرہیزگار اور ساتھ ہی ایسا وسیع المشرب اور وسیع اخلاق، وہ مذہبی تھے اور سخت مذہبی، لیکن وہ بھی اُن کو مانتے تھے جو مذہب کو نہیں مانتے تھے، وہ بے دینوں میں بھی ایسے ہی پیارے تھے جیسے دینداروں میں اور یہ اُن کے حُسنِ اخلاق کی بڑی کرامت تھی۔

۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک پندرہ برس مسلم یونیورسٹی میں ناظم دینیات رہے، اس عرصہ میں کئی انقلاب آئے مگر وہ اپنی جگہ پر تھے، ساتھ ہی ان کے جبّہ و دستار کی شان میں وہ بلندی رہی کہ کوٹ پتلون اور ہیٹ والے اُن کے آگے جُھک جُھک جاتے تھے، مگر اس میل جول اور نرمی و نرم خوئی میں حق کے خلاف کوئی بات سُن کر چپ نہیں رہ سکتے تھے، غرض وہ اپنے علم و عمل میں پہاڑ اور اخلاق و کرم میں بہتے پانی کی طرح تھے۔

نئے تعلیم یافتوں بلکہ نئی تعلیم کے اصل مرکز میں مذہبی وقار کو سلامت رکھنا کوئی آسان کام نہیں، انہوں نے اس مشکل کام کو آسان کر دکھایا تھا، ان کا فضل و کمال کسی خاص علم و فن میں محدود نہ تھا، یہاں تک کہ حدیث و فقہ و تفسیر سے آگے بڑھ کر شعر و شاعری اور ریاضیات تک سے ان کو یکساں دلچسپی تھی، ان کی سادگی کو دیکھ کر کسی کو ان کی اس گہرائی کا

یقین نہ آتا تھا اور ان کی اس گہرائی کو دیکھ کر ان کی اس سادگی پر سب کو تعجب ہوتا تھا، اس قدر سادہ اور اس قدر رنگین!

وہ آکلہ (کینسر) کے مرض میں جس سے ایک طرف کا پورا رخسار اور جبڑا آدھے منہ تک خالی ہوگیا تھا، دو ڈھائی برس تک ہر قسم کی مصیبت اور ہر طرح کی تکلیف جھیلتے رہے اور اس طرح مدت میں ایک دفعہ بھی بے صبری کی آہ اور تکلیف کی کراہ اُن کے منہ سے نہیں نکلی، کوئی نماز ترک نہیں ہوئی اور صبر و شکر کا دامن ایک لمحہ کے لئے ہاتھ سے نہیں چھوٹا، دیکھنے والے اُن کی حالت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لاتے تھے اور وہ ہاتھ اور زبان کے اشاروں سے صبر و استقلال کی نصیحت کرتے تھے۔

آہ! کہ فضل و کمال کا یہ پیکر حُسن و اخلاق اور شرافت کا یہ پُتلا دینداری اور پرہیزگاری کا یہ مرقع، تواضع اور خاکساری کا یہ سراپا، صبر و استقلال کا یہ مجسمہ ساٹھ برس دنیا کی نیرنگی کا تماشہ دیکھ کر دنیائے رنگ و بُو سے مٹ گیا۔

مرحوم کی یادگار چند اولادیں اور چند کتابیں ہیں، مگر ان سب سے بڑھ کر اُن کی یادگار ان کے حسنِ اخلاق کی یاد ہے، مرنے والے کا مدفن تو زمین کا ایک گوشہ ہے، مگر اس کا مزار ان کے دوستوں کے دل ہیں۔

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردم عارف مزارِ ماست

جانے والے جا! رحمتِ الٰہی تیری منتظر اور مغفرتِ الٰہی تیرے لئے چشم براہ ہوگی!

رمضان المبارک ۱۳۵۹ھ

اکتوبر ۱۹۴۰ء

مولانا سجّاد کی یاد

۲۳ر نومبر ۱۹۴۰ء اور ۱۲ر شوال ۱۳۵۹ھ کی سہ پہر تھی کہ پھلواری سے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نائب امیر شریعت بہار کی وفات کی خبر آئی، دل کو یارائے ضبط نہ رہا، آنسوؤں کے چند قطرے زمین پر گرے، وہ زمین جواب مرنے والے کی خوابگاہ ہے، ابھی قلب میں یہ ہمت بھی نہیں کہ جی بھر کر ماتم کروں اور دل کے شیون کو سپرد قلم،

درین آشوب غم عذرم بنہ گر نالۂ ن گریم
جہانے را جگر خوں شد ہمیں تنہا نہ من گریم

مرنا اور جینا دنیا کے روزانہ کے کاروبار ہیں، کون نہیں مرا اور کون نہیں مرے گا، آج وہ کل ہماری باری ہے، اس پر بھی عزیزوں اور دوستوں کی موت پر رونے والے روتے ہیں، ان کی دائمی فراق پر ماتم اور فریاد کرتے ہیں، ان کی ایک ایک خوبی کو یاد کرکے اُن کا نوحہ پڑھتے ہیں۔ عام حالت یہی ہے، لیکن بعض موتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان کی خبر سن کر زبان بند ہو جاتی ہے، آنسو سوکھ جاتے ہیں، دل کی حرکت بڑھ جانے کے بجائے گھٹ جاتی ہے، اندر ہی اندر گھٹن محسوس ہوتی ہے، مگر جی نہیں چاہتا کہ کچھ بول کر دل کی بھڑاس نکالئے اور آنسو بہا کر غم ہلکا کیجئے، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم کے سانحہ کا مجھ پر بالکل یہی اثر ہوا، دن بیت گئے، ہفتے گزر گئے، مہینے ختم ہوگئے، مگر زبان نہ کھلی اور دل کی امانت قلم کے سپرد نہ ہو سکی، عزیزوں اور دوستوں کو تعجب ہے کہ میرا قلم جو احباب کے سوگ میں ہمیشہ اشک ریز رہتا ہے، اس پہلی دفعہ وہ اپنے فرض کو کیوں بھولا ہے، مگر یہ کیسے بتاؤں کہ اس ناگہانی اور غیر متوقع غم سے مجھے کیوں چپ سی لگ گئی، ہر چند زبان خاموش تھی، لیکن کئی دن تک سوتے جاگتے مرحوم کی صورت آنکھوں میں پھرتی اور خواب میں نظر آتی رہی، تدمع العین ویحزن القلب ولا نقول الا ما یرضی ربنا وانا الفراقک

لمحزونون۔

اکثر اکابر اور مشاہیر کی ملاقاتیں حالات کی بنا پر یاد رہتی ہیں اور یہ بھی یاد رہتا ہے کہ یہ ملاقاتیں کب ہوئیں، کہاں ہوئیں اور کیسے ہوئیں لیکن اگر محبت کا عہد یاد کی عمر سے زیادہ ہو تو اس کو ازلی ملاقات کہہ سکتے ہیں الارواح جنود مجندہ فما ائتلف منہا ائتلف وما اختلف منہا اختلف، اسی اصول کی بنا پر مجھے یاد نہیں کہ دنیا میں میری ان کی ملاقات کب ہوئی کہاں ہوئی اور کیونکر ہوئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرب مکانی، اتحاد زمانی اور شدت ہم ذوقی کی بنا پر ہم ایک دوسرے سے اتنے آشنا تھے کہ پہلی ملاقات میں دید شنید پر کوئی نیا اضافہ نہ کر سکی۔

اس آخری زمانہ میں وہ سال میں ایک دفعہ میرے ایام قیام وطن میں کوئی نہ کوئی کام نکال کر دیسنہ ضرور تشریف لاتے اور میری عزت بڑھاتے، ان کی تواضع میں بلندی، سادگی میں بناؤ اور خاموشی میں گویائی تھی، وہ اکیلے تھے، لیکن لشکر تھے، پیادہ تھے مگر برق رفتار تھے، وہ قال نہ تھے سراپا حال تھے، کہتے کم کرتے زیادہ تھے، ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ "راہ" اور "منزل" کے فرق کو کبھی فراموش نہیں کیا انہوں نے راہ میں ہمراہیوں کے لطفِ کلام میں پھنس کر منزل سے ہٹنا کبھی گوارہ نہیں کیا، وہ وطن کی آزادی اور احکام مذہبی کی پیروی کے درمیان التباس اور تصادم سے کبھی بے خبر نہیں رہے، جذبۂ آزادی کی پوری قوت کے باوجود انہوں نے کانگرس یا کانگریسی حکومت کے غلط قدم اٹھانے پر کبھی بزدلانہ یا صلح پسندانہ درگزر سے کام نہیں لیا، مرحوم کی زندگی کے سوانح لکھنے والے لکھیں گے، مگر عقیدت کی یہ چند سطریں اُن کے دیرینہ نیازمند کی طرف سے یادگار اوراق رہیں، تو محسن کے شکریہ کا بار اس کے کندھے سے کم ہو۔

وطن: صوبہ بہار کے قصبہ بہار اور گیا کے درمیان کا علاقہ ہندوؤں کے عہد میں بدھوں اور جینیوں کی یادگاروں سے بھرا ہوا ہے اور راستہ میں قصبہ بہار کے چند میل

آگے بڑھ کر بودھوں کی مشہور درسگاہ نالندہ کے آثار اور کھنڈر ہیں، اسی سے ملا ہوا پنہسا نام کا مسلمانوں کا ایک گاؤں ہے جہاں سادات کے کچھ گھرانے آباد ہیں، انہی میں سے ایک گھر میں مولانا سجاد کی ولادت ہوئی۔

تعلیم و تربیت: تیرہویں صدی کے شروع میں صوبہ بہار میں مولانا وحید الحق صاحب استھانوی بہاری کے دم قدم سے علم کو نئی رونق حاصل ہوئی، قصبہ بہار میں انہوں نے مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اور بہت سے عزیزوں کی تربیت کی، ان میں سے ایک مولانا سجاد بھی تھے، عربی کی ابتدائی تعلیم انہیں کے زیر سایہ ہوئی اور ان کی پہلی شادی بھی انہیں کی دختر نیک اختر سے ہوئی، آخری تعلیم الہ آباد کے مدرسہ سبحانیہ میں مولانا عبد الکافی صاحب الہ آبادی کے درس میں ہوئی اور وہیں ۱۳۱۷ھ سے ۱۳۲۲ھ تک رہ کر سندِ فراغ حاصل کی۔

ابتدائی کام: تعلیم سے فارغ ہو کر مدرسی کی خدمت انجام دی، اس عرصہ میں کبھی وہ مدرسہ اسلامیہ بہار میں رہے اور کبھی مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں، ۱۳۲۵ھ تک یعنی سات برس تک وہ اس فرض کو انجام دیتے رہے، ۱۳۲۹ھ میں گیا میں مدرسہ انوار العلوم کی بنیاد ڈالی، مولانا عبد الوہاب منطقی بہاری بھی شریک کار تھے، یہ بات مجھے یوں یاد رہی کہ شاید ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء تھا کہ مدرسہ مذکور کے ایک جلسۂ سالانہ میں مولانا عبد الوہاب صاحب حقانی دہلوی مرحوم شریک جلسہ ہوئے تھے اور تقریریں کی تھی۔

مولانا سجاد صاحب مدرسہ انوار العلوم کا یہ جلسہ سال بہ سال کیا کرتے تھے اور اسمیں علماء کو بلاتے تھے اور ان سے تقریریں کراتے تھے، میرا خیال ہے کہ اکثر علماء سے ان کی ملاقاتوں کا آغاز انہی جلسوں میں ہوا، مجھے بھی ایک دو دفعہ ان جلسوں میں حاضری کا اتفاق ہوا

سیاسیات کا ذوق: ان کو سیاسیات کا ذوق جنگ عظیم میں ترکی کی شکست اور ممالک اسلامیہ کی پراگندگی سے ہوا، وہ اس وقت الہ آباد میں تھے، اُن کے ایک انگریزی داں شاگرد اُن سے عربی پڑھنے آتے تھے، وہ اپنے ساتھ اردو اور انگریزی اخبارات لاتے تھے،

اور مولانا کو پڑھ پڑھ کر سُناتے تھے، یہ آگ روز بروز بھڑکتی چلی گئی، مولانا ابوالکلام کے الہلال کی تحریک نے بنگال کے قرب کے سبب سے بہار پر پورا اثر کیا تھا اور بہت سے علماء نے اُن کی اس تحریک پر لبیک کہا، ان میں سے مولانا سجاد کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔

رانچی کی اسیری کے زمانہ میں مولانا ابوالکلام نے ہم خیال وکارفرما علماء کی تلاش وتفتیش کا کام ایک مخلص کے سپرد کیا تھا، انہوں نے جن علماء کا نشان دیا ان میں سے ایک مولانا سجاد بھی تھے، جو اس وقت انوارالعلوم گیا کی مسند درس پر تھے،

۱۹۱۹ء سے تحریکِ خلافت کی ترقی کے ساتھ ساتھ مولانا کا ذوق سیاست بھی بڑھتا گیا، ۱۹۲۰ء میں مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محل کی تحریک اور مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم کی تائید سے جب جمعیۃ العلماء دہلی کی بنیاد پڑی، تو موصوف اس کے لبیک کہنے والوں میں سب سے اوّل تھے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اُن کے کتنے رفیقِ سفر تھک تھک کر اپنی جگہ پر بیٹھ رہے تھے، مگر انہی کی ایک ہستی تھی جو آخر تک جمعیۃ کے ساتھ لگی رہی، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ انہی کی رُوح تھی جو اس کے قالب میں جلوہ گر ہوتی رہی۔

بہار میں امارت شرعیہ کا قیام ان کی سب سے بڑی کرامت ہے، زمین شور میں سنبل پیدا کرنا اور بنجر علاقہ میں لہلہاتی کھیتی کھڑی کرلینا ہر ایک کا کام نہیں۔

۱۹۱۸ء میں معارف میں اس تحریک کو اٹھایا گیا اور اصلاحات کے سلسلہ میں اس کو پیش کیا گیا، پھر ۱۹۲۰ء میں یورپ سے واپسی کے بعد چاہا کہ اس کو تمام ہندوستان کا مسئلہ بنایا جائے، مگر اس عہد کے جدید تعلیم یافتہ علمبرداروں نے اس کو کسی طرح چلنے نہ دیا۔ مگر بہار میں مولانا سجاد صاحب کی قوتِ عمل نے اس کو وجود کا قالب بخش دیا۔

مولانا سجاد مرحوم کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ علماء سیاسیات میں بھی قوم کی رہبری کا فرض انجام دیں، مسلمانوں میں دینی تنظیم قائم ہوجائے، جس کے تحت میں اُن کے تمام تبلیغی ومذہبی وتعلیمی وتمدنی کام انجام پائیں، دارالقضا قائم ہوکر مسلمانوں کے ہر قسم کے مقدمات و

معاملات تصفیہ پائیں، مسلمانوں کا بیت المال قائم ہو جائے جہاں مسلمانوں کے صدقات و مبرات و زکوٰۃ کی ساری رقمیں اکٹھی ہو کر ضروریات میں خرچ ہوں اور مستحقین میں تقسیم ہوں، مولانا نے عمر کے آخر بیس برس انہی کاموں میں صرف کئے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے ہر قسم کی مالی بے بضاعتی، مددگاروں کی کمی، رفقار کی نامساعدت اور حالات کی مخالفت کے باوجود جو کچھ کر دکھایا وہ ان کی حیرت انگیز قوتِ عمل کا ثبوت اور اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص ہے۔

بہار کی تنہا دولت: اُن کا وجود گو سارے ملک کے لئے پیام رحمت تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ صوبہ بہار کی تنہا دولت وہی تھے، اس صوبہ میں جو کچھ تبلیغی، تنظیمی، سیاسی و مذہبی تحریکات کی چہل پہل تھی وہ کل انہی کی ذات سے تھی، وہی ایک چراغ تھا جس سے یہ سارا گھر روشن تھا، وہ وطن کی جان اور بہار کی روح تھے، وہ کیا مرے کہ بہار مر گیا۔

مرثیہ ہے ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا

علم و فضل: فلسفہ و تاریخ کے ماہر کہتے ہیں کہ علم و عمل کم یکجا ہوتے ہیں لیکن کم یاب مثالوں میں مولانا سجاد کی ذات تھی، وہ اپنے وقت کے بڑے مشاق مدرس اور حاضر العلم عالم تھے، خصوصیت کے ساتھ معقولات اور فقہ پر اُن کی نظر بہت وسیع تھی، جزئیات فقہ اور خصوصاً ان کا وہ حصہ جو معاملات سے متعلق ہے اُن کی نظر میں تھا، امارت شرعیہ کے تعلق سے اقتصادی و مالی و سیاسی مسائل پر اُن کو عبور کامل تھا، زکوٰۃ و خراج و قضا و امارت و ولایت کے مسائل کی پوری تحقیق فرمائی تھی، ہر چند کہ سالہا سال سے درس و تدریس و مطالعہ کا اتفاق نہیں ہوا تھا، مگر جب گفتگو کی گئی اُن کا علم تازہ نظر آیا۔

فہم و رائے: اُن کا علم کتابی نہ تھا، بلکہ آفاقی بھی تھا، معاملات کو خوب سمجھتے تھے، ان کو بارہا بڑے بڑے معاملات اور مقدمات میں ثالث بنتے ہوئے دیکھا ہے اور تعجب ہوا ہے کہ کیونکر فریقین کو وہ اپنے فیصلہ پر راضی کر لیتے تھے اور اسی لئے لوگ اپنے بڑے بڑے کام بے تکلف اُن کے ہاتھ میں دے دیتے تھے، کیونکہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا

سب سے بڑا عطیہ فکر رسا اور رائے صائب تھی، مسائل اور حوادث میں اُن کی نظر بہت دور دور دور پہنچ جاتی تھی، وہ ہر گتھی کو نہایت آسانی سے سلجھا دیتے تھے، حریف کی چالوں کی تہ تک پہنچ جاتے تھے، باوجود تواضع وخاکساری کے اپنی رائے پر پوری قوت کے ساتھ جمتے تھے اور محض ہٹ اور ضد سے نہیں، بلکہ دلائل کی قوت اور مصالح کی طاقت سے وہ دوسروں سے منوانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

اخلاق: وہ بیحد خاکسار اور متواضع تھے، کبھی کوئی اچھا کپڑا انہوں نے نہیں پہنا، کبھی کوئی قیمتی چیز اُن کے پاس نہیں دیکھی، کھدر کا صافہ، کھدر کا لمبا کُرتہ کھدر کی لبی صدری، پاؤں میں معمولی دیسی جوتے اور ہاتھ میں ایک لمبا عصا، یہ ان کی وضع تھی، مگر اپنی اس سادہ اور معمولی وضع کے ساتھ بڑے بڑے لیڈروں اور بڑے بڑے مجمعوں میں بے تکلف جاتے تھے اور اپنا لوہا منواتے تھے، جوہر پہچاننے والے بھی تلوار کی کاٹ دیکھتے، غلاف کی خوبصورتی نہیں۔

ہر شخص کی مصیبت میں ہر وقت کام آتے تھے اور ہر ایک کی سفارش میں ہر وقت سینہ سپر ہو جاتے، اللہ تعالیٰ نے ان کو جاہ و مرتبہ بھی عنایت فرمایا، انہوں نے خود اپنی پارٹی کی وزارت بھی بنائی اور بادشاہ گر نہیں تو وزیر گر ضرور بنے، کانگریسی حکومت کے زمانہ میں ان کو اچھا اقتدار حاصل رہا، مگر خدا گواہ کہ اس اثر و اقتدار کو اپنی ذات کے لئے کبھی کام میں نہیں لاتے، جو کچھ کیا وہ مسلمانوں کے لئے۔

اُن کی زندگی نہایت سادہ تھی، غربت و عسرت کی زندگی تھی، گھر کے خوشحال نہ تھے، امارت سے معاوضہ بہت قلیل لیتے تھے، سفر معمولی سواریوں اور معمولی درجوں میں کرتے تھے اور اسی حال میں پورب سے پچھم اور پچھم سے پورب اور اُتر سے دکھن اور دکھن سے اُتر دوڑتے رہتے تھے، اُن کا دن کہیں گزرتا تھا اور رات کہیں، مسلمانوں کی سلامتی اور تنظیم کی ایک دُھن تھی کہ ان کو دن رات چکر میں رکھتی تھی، کہیں قربانی کا جھگڑا ہو، مسلمانوں پر

مقدمہ ہو، کہیں سیلاب آئے، کہیں آگ لگے، کہیں مسلمان کا تنازعہ ہو، ہر جگہ خود پہنچ جاتے تھے، معاملہ کا پتا لگاتے تھے، مظلوموں کی مدد کرتے تھے، ان کے لئے چندہ کرتے تھے۔ جہاں سے ہو سکتا وہ اُن کو لا کر دیتے تھے اور خود خالی ہاتھ رہتے تھے۔

بہار میں زلزلہ کے زمانہ میں انہوں نے جس تن دہی سے کام کیا اور ایک ایک گاؤں میں جا کر جس طرح بے گھروں اور بے خانماؤں کو مدد دی وہ اُن کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے، جس کا صلہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بارگاہ سے اُن کو عنایت فرمایا ہوگا۔

لیڈروں اور قومی کارکنوں کے پاس عام طور سے اُن کے اثر کے ذریعے تین ہیں، یا دولت ہے یا حسن تقریر ہے یا زورِ قلم ہے، مرحوم ان تینوں سے محروم تھے، وہ غریب تھے اور غریبوں ہی میں زندگی بسر کی، زبان میں لکنت تھی، جس سے وہ بولنے پر قادر نہ تھے، اور اسی لئے تقریر بہت کم کرتے تھے اور ان کے قلم میں وہ زور بھی نہ تھا جو آجکل کی انشاپردازی کا کمال ہے، تاہم ان سب کا بدل ان کے پاس اُن کا ایک اخلاص تھا، جو اُن کی ہر کمی کو پورا کر دیتا تھا، عجب نہیں کہ زبان اور قلم کا عجز ہی تھا جو اُن کی قوتِ عمل کی صورت میں ظاہر ہوا۔

جمعیۃ العلماء کے اجلاس کلکتہ کے خطبہ میں میرے قلم سے اُن کی نسبت یہ الفاظ نکلے تھے جو پہلے مدح تھی، اب مرثیہ ہے:۔

> "۱۳۴۳ھ کے اجلاس خاص مراد آباد کے موقع پر بھی مجھے یہ عزت عطا ہوئی تھی، مگر عین وقت پر وفد حجاز کی شرکت نے انکار پر مجبور کیا اور میں خوش ہوں کہ اس کی بدولت ایک خاموش ہستی بولی، ایک بے زبان نے زبان کے جوہر دکھائے اور ایک ہمہ تن سوز و گداز نے کاغذ کے صفحوں پر اپنے دل کے ٹکڑے بکھیرے"

یہ بھی مولانا ہی کی قوتِ جاذبہ تھی جو مختلف الخیال علماء اور مختلف الرائے سیاسی رہنماؤں اور قومی کارکنوں کو ایک ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع کئے اور ایک شیرازہ میں

باندھے ہوئے تھی۔

شاید یہ کم لوگوں کو علم ہو کہ مولانا کی خانگی زندگی غم سے بھری ہوئی تھی، اُن کے بڑے بھائی مجذوب تھے، ان کی بیوی معذور و مختل تھیں، اُن کا بڑا لڑکا جو پڑھ لکھ کر فاضل اور گھر کا کام سنبھالنے کے قابل ہوا، عین اُس وقت کہ اُس کے نکاح میں چند روز باقی تھے، باپ نے اس کی دائمی جدائی کا داغ اٹھایا اور یہ سننے کے قابل ہے کہ وہ لڑکا... مرض الموت میں تھا کہ مسلمانوں کی ایک ضرورت ایسی سامنے آئی کہ باپ بیمار بیٹے کو چھوڑ کر سفر پر روانہ ہو گیا، واپس آیا تو جوان بیٹا دم توڑ رہا تھا۔

اُن کی اپنی زندگی بھی دین و ملت ہی کے نذر ہوئی، ترہت کے دور افتادہ علاقہ میں جہاں کے ملیریا کے ڈر سے اِدھر کے لوگ اُدھر جانا موت کے منھ میں جانا سمجھتے ہیں، یہ مردِ خدا جان کو ہتھیلی پر رکھ کر سال میں کئی کئی دفعہ جاتا تھا اور کئی کئی دن وہاں رہتا تھا، آخری سفر بھی وہیں ہوا اور وہیں سے ملیریا کی سخت بیماری اپنے ساتھ لایا اور اسی حال میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی،

جانے والے تیری رُوح کو سلام! جب تو زندہ تھا تو تیری قوم نے تیری قدر نہ پہچانی اب تُو عالمِ ابد میں ہے، میرے کان غیب سے تیری زبانِ مجاز سے یہ آواز سنتے ہیں۔

يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِيْ	اے کاش کہ میری قوم جانتی کہ خدا نے مجھے بخشا
رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ (یٰسین)	اور مجھے ان میں داخل کیا جن پر اسکا کرم ہوا ہے۔

صفر ۱۳۶۰ھ

مارچ ۱۹۴۱ء

مولانا عبدالعزیز گوجرانوالہ

دو ماہ ہوئے کہ مولانا عبدالعزیز صاحب خطیب و امام جامع مسجد گوجرانوالہ نے جو دیوبند کے عالم اور وقت کے بڑے محدث تھے، وفات پائی، انہوں نے صحاح و مسانید کی مختلف کتابوں کی فہرستیں بطور اطراف بڑی محنت سے لکھی تھیں جن میں صرف بخاری کی فہرست نبراس الساری فی اطراف البخاری کے نام سے چھپی ہے، مرحوم نے مجھے لکھا تھا کہ مسند ابن حنبل کی بھی ایک فہرست بنائی ہے اور وہ اس کے چھپوانے کی فکر میں تھے، کیا اچھا ہو اگر ان کی یادگار میں اُن کی یہ کتاب گوجرانوالہ کے قدردان چھپوا سکیں، یا وہ اس نسخہ کو کسی قدر شناس کے سپرد کریں کہ وہ اس کو چھپوا کر اس فیض کو عام کرے۔

ذیعقدہ ۱۳۵۹ھ

دسمبر ۱۹۴۰ء

محمدؐ پاشا محمود

مصر کی ڈاک سے یہ معلوم کرکے بڑا افسوس ہوا کہ محمد پاشا محمود جو زغلول پاشا کے وفد کے ممبر تھے اور بعد کو الگ ہو کر مصر کی وزارت میں شامل ہو گئے تھے، وفات پا گئے، اُن کو ہندوستان سے یہ نسبت تھی کہ محمد علی مرحوم کے ساتھ آکسفورڈ میں انہوں نے بھی تعلیم پائی تھی، پیرس میں وفد خلافت اور وفد مصر کی ملاقاتوں کے سلسلہ میں ان دونوں رفیقوں میں بڑی دلچسپ گفتگو ہوئی تھی اور خاکسار سے زغلول پاشا کی ثالثی میں صحیح بخاری کی صحت پر ایک پُرلطف مناظرہ ہوا تھا، زغلول پاشا کا یہ فقرہ جو محمد پاشا محمود کو مخاطب کرکے انہوں نے کہا تھا، اب تک کانوں میں گونج رہا ہے، ودع الامام یتکلم' اللہ تعالیٰ نام کیطرح اُن کی عاقبت بھی محمود فرمائے۔

محرم ۱۳۶۰ھ

فروری ۱۹۴۱ء

سرشاہ سلیمان

نئی تعلیم نے جو بہتر سے بہتر نمونے ہماری قوم میں پیش کئے، ان میں سے ایک سرشاہ سلیمان تھے، وہ مشرقی تعلیم کے ایک ممتاز خاندان کے فردِ فرید تھے، ان کا آبائی وطن ضلع اعظم گڑھ ہی کا ایک ممتاز قصبہ تھا، ملا محمود جونپوری جن کا نام شمس بازغہ اور فرائد کے مصنف کی حیثیت سے آفتاب کی طرح درخشاں ہے، اُن کے مورثِ اعلیٰ تھے، سرسلیمان مرحوم نے بھی ابتدائی مشرقی تعلیم حاصل کی تھی اور عربی تعلیم سے بہرہ ور تھے، ملا محمود نے فلسفہ میں ادب کی اور ادب میں فلسفہ کی شان پیدا کی تھی، یہی خصوصیت سرسلیمان کی ذات میں تھی، ایک طرف وہ قصائد ذوق اور مثنویات میر کو ترتیب دیتے تھے اور دوسری طرف آئنسٹائن کے نظریہ پر نقد و تبصرہ کرتے تھے۔

سرسلیمان کی فطری ذہانت کی بجلی ان کی رگ رگ میں بھری تھی، وہ نہ صرف ہائیکورٹ کے جج رہے بلکہ قانون کے نکتہ شناس بھی تھے، ان کی لیاقت و قابلیت کی شرح کے لئے چند سطریں کسی طرح کافی نہیں ہوسکتیں اور ان سب باتوں کے ساتھ وہ مسلمان بھی تھے، ایماناً و عملاً مسلمان! وہ ان تنگ ظرفوں میں نہ تھے جو رومن حروف کے چند الفاظ پڑھ لینے کے بعد اپنے کو حقائق و معارف کا سب سے بڑا عارف مان کر دین و مذہب سے بے نیاز ہوجاتے ہیں اور بندگی کی حد سے آگے بڑھ کر خدائی کے عرش کا اپنے کو مستحق سمجھنے لگتے ہیں، مرحوم میں ان خوبیوں کے ساتھ بہت سی اخلاقی خوبیاں بھی جمع تھیں، وہ منکسر، متواضع، حلیم اور سادہ مزاج تھے، ساتھ ہی اپنی رائے کے مضبوط اور کام کے دھنی تھے،

وہ عالم تھے، مگر عمر بھر طالب العلم بنے رہے۔

مرحوم ہندوستان کا وقار اور مسلمانوں کا فخر تھے، افسوس کہ ۱۳ مارچ ۱۹۴۱ء کو ہمارے ملک کا یہ وقار اور ہماری قوم کا یہ فخر جاتا رہا، گلے کی ایک معمولی بیماری نے خناق کی اور خناق نے غالباً دماغ کے پھوڑے کی شکل اختیار کی، ۱۸۸۶ء پیدائش کا سال تھا، ۵۵ برس کی عمر میں اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن دنیاوی قانونوں کا جج اب دلوں کے سب سے بڑے قاضی القضاۃ اور احکم الحاکمین کی بارگاہِ عدالت میں ہے، دعا ہے کہ وہ احکم الحاکمین جو ارحم الراحمین بھی ہے اپنی شفقت و رحمت کی کرسی پر اس کو جگہ دے گا اور اپنی بخشش و بخشایش کی عزت سے سرفراز فرمائے گا۔

ربیع الاول ۱۳۶۰ھ

اپریل ۱۹۴۱ء

مولانا حاجی معین الدین ندوی

مصنّف خلفائے راشدین

افسوس کہ پانچ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ کو ہماری جماعت کے ایک لائق فرد مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے تقریباً پچاس برس کی عمر میں وفات پائی، انہوں نے اپنی پوری تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حاصل کی اور ۱۹۱۲ء میں درجہ تکمیل سے فراغت پائی، ۱۹۱۴ء کے آخر میں دارالمصنفین کے قیام پر وہ دارالمصنفین کے رفیق منتخب ہوئے اور سلسلہ سیر الصحابہ کی پہلی اور دوسری جلد خلفائے راشدین اور مہاجرین حصہ اول لکھی، ایک سال کے بعد یہاں سے کتب خانہ ندوہ کی ترتیب کے لئے لکھنؤ گئے اور اس کام سے ان کو ایسی دلچسپی ہوئی کہ بوہار امپیریل لائبریری کلکتہ میں ترتیب فہرست کے کام پر لگائے گئے اور کئی جلدیں بڑی قابلیت سے انگریزی میں مرتب کیں اور گورنمنٹ کی طرف سے چھپیں، اس جگہ کی تخفیف ہونے پر دائرۃ المعارف حیدر آباد میں قدیم ہندوستانی تاریخی مقالات کا ایک جغرافیہ عربی زبان میں ترتیب دیا، جو دائرہ کی طرف سے چھپا ہے، یہاں سے نکل کر وہ چند روز رامپور کی سرکاری لائبریری میں مقرر ہوئے اور آخر صوبہ بہار کی مشہور سرکاری عربی درس گاہ مدرسہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل مقرر ہوئے اور اسی خدمت پر وفات پائی۔

وہ نہایت خاموش طبیعت، ملنسار، متواضع اور نیک دل تھے، وطن صوبہ بہار کے دو مشہور گاؤں گیلانی اور استھانواں میں تھا، نوجوانی ہی میں جب وہ دارالعلوم میں پڑھتے تھے حج سے مشرف ہوئے تھے، اسی لئے وہ ہماری جماعت میں حاجی صاحب

کے نام سے ایسے مشہور و متعارف تھے کہ یہ ان کے اصلی نام کا جزو بن گیا تھا، انگریزی تعلیم صرف ندوہ میں چند ریڈروں تک پڑھی، مگر کام کرنے پر اپنی ذاتی محنت سے اتنی ترقی ترقی کی کہ انگریزی میں فہرست کی دو تین جلدیں ایسی لکھیں کہ اہل بصیرت نے بھی ان کی تعریف کی، آخر زمانہ میں وہ کتب حدیث کا درس دیتے تھے اور یہی ان کا آخری کارنامہ ہے، اللہ تعالیٰ اس مجموعۂ فضل و کمال و اخلاق کو اپنی عطاو مغفرت سے سرفراز اور اس کی خدمتوں کو قبول فرمائے ۔

ربیع الثانی سنہ ۱۳۶۰ھ

مئی سنہ ۱۹۴۱ء

مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ فرنگی محل کے ممتاز عالم مولانا عنایت اللہ خاں صاحب فرنگی محلی نے ۶ جولائی ۱۹۴۱ء کو دفعۃً وفات پائی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ مرحوم ابھی ۲۴، ۲۵، ۲۶ جون کو ہمارے ساتھ بھوپال میں عربی مدارس کے اصلاح کے کام میں شریک تھے، وہیں دردِ شکم میں مبتلا ہوئے، جس کے باعث وہ کئی دن تک وہاں علیل رہے، سوءِ ہضم، تسلسل بول اور ضعفِ قلب کے عوارض اُن کو پہلے سے لاحق تھے، بھوپال میں مرض کی تخفیف کے بعد لکھنؤ روانہ ہوئے اور میں بھی انہی کی وجہ سے انہی کے ساتھ لکھنؤ تک آیا، لکھنؤ اسٹیشن پر پہنچ کر مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کی زحمتوں اور خدمتوں کا شکریہ اسلئے نہیں ادا کروں گا کہ میں آپ کو اپنے سے علیحدہ نہیں سمجھتا، یہ کہہ کر سلام کے بعد ہم دونوں الگ ہوگئے، یہ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ سلامِ رخصت آخری سلام ہے۔

مرحوم فرنگی محل کے خانوادہ میں تنہا جامع علوم وفنون ہستی باقی رہ گئے تھے، معقولات اور منقولات پر ان کو یکساں دسترس حاصل تھی، مسائل پر وہ مبصرانہ اور ناقدانہ نظر رکھتے تھے، اُردو میں تاریخ حدیث ورجال پر کئی رسالے لکھے تھے، مدرسۂ نظامیہ کے صدر مدرس اور اچھے مدرس تھے، سیاسیات سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، خلافت اور مسلم لیگ کے کاموں میں حصہ لیتے رہتے تھے، کل ۵۴ برس کی عمر پائی، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی عنایتوں سے سرفراز فرمائے۔

اگست ۱۹۴۱ء

سر اکبر حیدری

افسوس ہے کہ ۸ر جنوری ۱۹۴۲ء کی شام کو سابق صدر اعظم ریاست حیدرآباد سر اکبر حیدری نے دلی میں وفات پائی، سر اکبر حیدری ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کے وزیر مالیات اور پھر صدر اعظم ہونے کے سبب سے تمام اسلامی اداروں سے ایک خاص مربیانہ تعلق رکھتے تھے اور اس بنا پر ان کا حادثۂ وفات ہم سب کے لئے غم والم کا باعث ہوا ہے، ان کی عمر اس وقت ۷۲ برس کی تھی، مگر اس عالم میں بھی جس انہماک، مصروفیت اور بیدار مغزی سے وہ اپنے مفوضہ خدمات کو انجام دیتے تھے، اس سے ان کے غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی ہونے کا ثبوت ملتا تھا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ

جنوری ۱۹۴۲ء

حامد نعمانی مرحوم

مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک ہی جسمانی یادگار باقی رہ گئی تھی، وہ بھی مٹ گئی، یعنی ان کے اکلوتے صاحبزادہ حامد نعمانی صاحب نے ۶۲ برس کی عمر میں ۶ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۹۴۲ء کی شب کو جونپور میں دفعۃً وفات پائی، وہ کئی برس سے مرضِ قلب میں گرفتار تھے، علاجوں کے سہارے سے چلتے پھرتے تھے، شام کو پہنچے، اپنا کام کیا، رات کو تین بجے کے قریب دردِ دل کا دورہ ہوا، اُن کے میزبان دوست اُن کے کراہنے کی آواز سُن کر اُن کے پاس آئے، مرحوم نے کہا کہ مجھے ذرا سہارا دے کر بٹھا دو، انہوں نے اپنے سینے کے سہارے سے بٹھا دیا، اسی کیساتھ مرحوم نے ان کو السلام علیکم کہا اور آخری سانس لیکر نامعلوم سفر کی منزل پر روانہ ہو گئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۲۰ کی صبح کو لاش کار سے اعظم گڑھ آئی اور شبلی منزل میں باپ کے پہلو میں ہمیشہ کے لئے سُلا دیا گیا۔

مرحوم بڑے توانا و تندرست، قوی ہیکل، بلند و بالا اور علی گڑھ کالج کے مشہور کھلاڑیوں میں تھے، گھوڑے کی سواری اور پولو میں بھی ممتاز تھے، تحصیلداری کے عہدہ پر فائز ہو کر پنشن پائی، پھر ریاست جھولی میں منیجر ہوئے، مگر صحت کی خرابی کے سبب سے مستعفی ہو گئے، پابند صوم و صلوۃ، نیک دل اور بہت رحیم المزاج تھے، اپنی ذاتی زندگی میں گو وہ بہت قانع اور منتظم تھے، مگر اسطرح سے جو بچتا تھا، اسکو ہمیشہ فیاضی کیساتھ نیک کاموں میں لگا دیا کرتے تھے، ۱۹۲۷ء میں حج بھی کیا تھا، زکوٰۃ کا پورا حساب رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے اور اپنے خزانہ سے ان کو اجرِ جزیل عطا کرے، مولانا شبلی مرحوم کی جو صاحبزادیاں تھیں وہ تو باپ کی زندگی ہی میں وفات پا چکی تھیں، ایک یہ فرزند تھے جو اب چل بسے، ع

افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

ربیع الاول ۱۳۶۱ھ، اپریل ۱۹۴۲ء

مولانا حیدر حسن صاحب محدث ٹونکی کی وفات

مولانا حیدر حسن خان صاحب محدث ٹونکی نے جو تقریباً دس پندرہ برس تک دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں شیخ الحدیث رہ کر دو سال ہوئے کہ ریاست کی خواہش پر اپنے وطن چلے گئے تھے، افسوس ہے کہ چند روز ہوئے کہ اپنے وطن ہی میں وفات پائی، محدث مرحوم اور ان کے بڑے بھائی مولانا محمود حسن خاں صاحب مصنف معجم المصنفین اس وقت کے علماء میں ایسے دو نامور فرد تھے کہ جن کے وجود پر علم و فضل اور ورع و تقویٰ کو ناز تھا الحمد للہ کہ ابھی مولانا محمود حسن خاں صاحب ہم میں موجود ہیں، مگر افسوس ہے کہ اُن کے چھوٹے بھائی مولانا حیدر حسن خان صاحب نے اس عالم فانی کو الوداع کہا، ایسے زمانہ میں جب نام کے مولویوں کی تعداد گو کثرت حاصل کر رہی ہے مگر کام کے علماء روز بروز کم سے کم ہوتے جارہے ہیں، مرحوم کی وفات مشرقی علم و فضل کی کائنات میں حادثہ عظیم سمجھی جائے گی۔

مرحوم بڑے جامع العلوم تھے، علوم عقلیہ و نقلیہ وریاضیہ کے وہ یکساں ماہر تھے۔ زیادہ تر اپنے بڑے بھائی مولانا محمود حسن خاں صاحب سے پڑھا تھا، حدیث کی سند شیخ حسین صاحب عرب یمنی خزرجی سے حاصل کی تھی، استفادۂ باطنی میں بھی ان کا درجہ بلند تھا اور علوم نقلیہ میں وہ ماہر کامل تھے، علم حدیث کو بطرز حنفیہ بہت خوبی سے پڑھاتے تھے، رجال پر ان کی نظر وسیع تھی، اُن کے درس کا طریقہ یہ تھا کہ حدیث پڑھاتے وقت احادیث کی ساری کتابیں اور اسماء الرجال اور اصول کی کوئی مستند کتاب اردگرد رکھ لیتے تھے، ہر نزاعی مسئلہ پر وہ داد تحقیق دیتے وقت راوی کی حالت زبانی بیان

کرکے مزید تشفی کے لئے ان کو کتاب کھول کر راوی پر جرح و توثیق کے اقوال بھی دکھا دیتے اور اصول سے اپنے مدعا کو ثابت کرتے تھے۔

ان سے اکثر مسائل میں گفتگو ہوتی رہتی تھی، اگر وہ ہمیشہ حاضر العلم نظر آئے اور جب کبھی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی صاف اقرار کر لیتے تھے اور دوسرے وقت وہ اس کو دوبارہ سمجھ کر بحث میں لاتے تھے اس علم و فضل پر بیحد منکسر، بیحد خاکسار، بیحد متواضع، اتباع سنّت اور پابندی شریعت میں ممتاز تھے ان کی نماز خضوع و خشوع اور سکون و طمانیت کی تصویر ہوتی تھی، دار العلوم کی مدرسی کے زمانہ میں لکھنؤ کے اکثر اہل علم ان کے معترف و مداح تھے اور مسائل میں ان کا فیصلہ قول فیصل کا حکم رکھتا تھا، اللہ تعالیٰ اس مجموعۂ خوبی کو اپنے فضل و کرم سے نوازے، اور مراتب اعلیٰ عنایت فرمائے۔

جمادی الاخریٰ ۱۳۶۱ھ

جولائی ۱۹۴۲ء

مولانا محمد سورتی رح

پچھلے مہینہ کا سب سے اندوہناک علمی حادثہ مولانا محمد سورتی کی وفات ہے، مرحوم اس عہد کے مستثنیٰ دل و دماغ اور حافظہ کے صاحب علم تھے، جہاں تک میری اطلاع ہے اس وقت اتنا وسیع النظر، وسیع المطالعہ، کثیر الحافظہ عالم موجود نہیں، صرف و نحو، لغت و ادب و اخبار و انساب و رجال کے اُس زمانہ میں درحقیقت وہ امام تھے، وہ چند ماہ سے مرض استسقا میں مبتلا تھے، علی گڑھ میں ان دنوں قیام تھا اور وہیں ۷، اگست کو بروز جمعہ وفات پائی۔

مرحوم کا اصلی وطن سورت (گجرات) تھا، وطن میں ابتدائی تعلیم پاکر یہ دلی آئے اور رامپور میں مولانا محمد طیب صاحب مکی کا تلمذ حاصل کیا، میری ان کی پہلی ملاقات ۱۹۰۸ء میں ہوئی، جب مولانا طیب مکی رامپور چھوڑ کر دار العلوم ندوہ لکھنؤ میں ادیب اول کے عہدہ پر فائز تھے، فاضل استاد کے ساتھ یہ لائق شاگرد بھی لکھنؤ وارد ہوا اور اس زمانہ سے لے کر اخیر تک اُن کے ساتھ میری علمی رفاقت اور ذاتی دوستی کا سلسلہ قائم رہا، معارف بھی ان کے رشحاتِ قلم سے کبھی کبھی مستفید ہوتا رہا ہے۔

مرحوم اس فضل و کمال کے باوجود ہمیشہ پریشان حال رہے اور کہیں ایک جگہ جم کر بیٹھنا ان کو نصیب نہ ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے علم سے استفادہ بہت کم کیا جاسکا اور کوئی کارآمد تصنیف بھی اپنی یادگار نہ چھوڑ سکے اور نہ کوئی لائق شاگرد ہی ان کا قائم مقام ہوسکا، البتہ چند جسمانی اولاد انکی یادگار ہیں۔ ایک زمانہ میں جامعہ ملیہ دہلی میں معلم رہے، پھر بنارس کے جامعہ رحمانیہ میں مدرس

ہوئے، بعد کو بمبئی میں ایک اہلحدیث مدرسہ میں حدیث کا درس دینے لگے تھے، ٹونک کے مشہور کتب خانہ کی کشش بھی اُن کو ٹونک لے جاتی تھی، انہوں نے شادی بھی ٹونک ہی کر لی تھی، قلمی کتابوں کی تلاش اور فراہمی اور نقل ان کا ذریعہ معاش رہ گیا تھا، اس تعلق سے وہ ٹونک، پٹنہ، رامپور، کلکتہ اور حیدر آباد کا سفر اکثر کیا کرتے تھے، لیکن آخرت کے سفر کے لئے ان کی تقدیر میں علی گڑھ کی مٹی لکھی تھی، ساٹھ کے قریب عمر پائی، سر بڑا، بدن گداز اور ہاتھ پاؤں بھاری تھے۔

مرحوم مسلکاً اہل حدیث تھے اور اپنے مسلک میں بے حد غالی تھے، طبیعت بیقرار اور وارستہ تھی، کسی ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتے تھے، ساتھ ہی نہایت سادہ مزاج، بے تکلف، احباب پرور، فیاض اور مستغنی تھے، کھانے اور کھلانے کے بیحد شائق تھے، ہمیشہ مقروض اور خانہ بدوش رہتے تھے۔

مرحوم کا پایہ علم و ادب اور رجال و انساب و اخبار میں اتنا اونچا تھا کہ اس عہد میں اس کی نظیر مشکل تھی، جو کتاب دیکھتے تھے وہ ان کے حافظہ کی قید میں آجاتی تھی، سینکڑوں نادر عربی قصائد، ہزاروں عربی اشعار و انساب نوکِ زبان تھے۔ ان کو دیکھ کر یقین آتا تھا کہ ابتدائی اسلامی صدیوں میں علماء ادباء اور محدثین کی وسعت حافظہ کی جو عجیب و غریب مثالیں تاریخوں میں مذکور ہیں وہ یقیناً صحیح ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ستمبر ۱۹۴۲ء

نواب محمد یار جنگ بہادر

نواب محمد یار جنگ بہادر (حیدر آباد دکن) کی وفات کا سانحہ بھی اسی اثنار میں پیش آیا، مرحوم نسلاً عرب تھے اور ایک مرنج و مرنجان بزرگ، نہایت مخلص، بے ریا، با خدا، اور نیک طبع تھے، صوبہ داری کے منصب سے وظیفہ یاب ہوکر بلدہ میں مقیم تھے، حیدر آباد کی ہر علمی و تعلیمی تحریک میں وہ شریک رہتے تھے، دائرۃ المعارف اور مدرسہ نظامیہ کی اعزازی خدمت بھی اُن کے سپرد تھی، دار المصنفین سے مرحوم کو بے حد دلچسپی تھی اور ہمیشہ وہ اس کی مدد فرماتے رہتے تھے، اہل علم کے لئے ان کا گھر ایک مہمان خانہ کی حیثیت رکھتا تھا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔

شعبان ۱۳۶۱ھ

ستمبر ۱۹۴۲ء

مسٹر نصیر بیرسٹر

بہار میں نئی تعلیم بنگال کے قرب بلکہ ملحقہ صوبہ ہونے کی وجہ سے بہت پہلے پھیلی، وہاں کے مسلمان شرفا کے جو نونہال ان میں سب سے زیادہ پھلے پھولے ان میں سیّد علی امام، حسن امام اور مظہر الحق وغیرہ کے نام ان کے بعض سیاسی اور قومی کارناموں کی وجہ سے بہت نمایاں ہیں، انہی کے معاصرین میں ایک نام مسٹر نصیر بیرسٹر کا ہے، پٹنہ کے قریب شرفا کا ایک مشہور قصبہ نگرنہسہ ہے، وہ وہیں کے انصاری خاندان کے چشم وچراغ تھے، خاندان میں عربی وفارسی علوم کا چرچا تھا، اُن کے دادا، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ یا حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی کے شاگرد تھے اور ان نفوس قدسیہ کے برکات کا خاصہ اثر اس مغربی تعلیم یافتہ کے ذہن وخیال پر تھا، افسوس کہ ستمبر ۱۹۳۲ء کے آخر میں اس دَور کی یہ یادگار شخصیت بھی مٹ گئی۔

۱۸۹۸ء میں جب خاکسار پہلی دفعہ دیہات سے نکل کر شہر (پٹنہ) میں آیا تو سب سے پہلے انہی کی کوٹھی پر جو مرادپور کی سڑک کے شمالی رُخ پر تھی اس تعلق سے قیام ہوا تھا کہ میرے چھوٹے چچا مرحوم اس زمانہ میں انہی کے ساتھ رہتے تھے، عمر میں یہ پہلا اتفاق تھا، اس لئے اُن کی ہر چیز مجھے عجیب معلوم ہوتی تھی، بہت گویا، بہت ہنس مکھ، ہر وقت خوش وبشاش، شعر وسخن کے دلدادہ، علمی صحبتوں کے شائق، بزرگوں کا ادب، دین کا پاس اور مذہب کا جوش، کوٹ پتلون اور ہیٹ کے اس پتلے میں عجیب رنگین کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں ندوۃ العلماء کا ساتواں سالانہ جلسہ پٹنہ عظیم آباد میں ہوا، جو قدیم تعلیم کے ساتھ جدید تعلیم کا بھی مرکز تھا، اجلاس میں علمار کرام اور مشائخ عظام کے پہلو بہ پہلو جسٹس مولوی سید شرف الدین مرحوم کی سرکردگی میں ان نوجوان بیرسٹروں کا جھرمٹ بھی تھا اور شاید یہ پہلا دن تھا جب مقدس شملے اور ہیٹ یکجا نظر آئے تھے، اسی اثنار میں جوش و حمیت کا یہ پتلا پورے انگریزی ڈریس میں اسٹیج پر آیا اور وہ دلدوز تقریر کی کہ میری ان آنکھوں نے بڑے بڑے مقدس علمار مشائخ کو ڈھاریں مار مار کر روتے دیکھا، مقرر کے جوش کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنا قیمتی کوٹ، گھڑی، انگوٹھی سب نذر کر دی، جن لوگوں نے اس منظر کو دیکھا تھا وہ سماں آج تک نہیں بھولے ہیں۔

یا تو میں نے ان کو انگریزی کپڑوں اور انگریزی شکل وصورت میں دیکھا، یا پھر ابھی دس برس ہوئے ریش سپید، مخملی ٹوپی اور اچکن اور کرتے میں دیکھا اور سنا کہ اب یہ عالم ہے کہ تسبیح وسجادہ سے سروکار ہے، مرحوم کی دوسری شادی نیورہ میں ہوئی تھی، چند سال ہوئے کہ وہاں اس سے بھی بڑھ کر محو استغراق پایا، مجھ سے عزیزانہ برتاؤ تھا، جوانی میں میلاد کا پرشوق رسالہ لکھا تھا اور پیری میں شاعری پر ایک اردو مثنوی لکھی جو خاکسار کے مقدمہ کے ساتھ مطبع معارف میں چھپی تھی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی مغفرت سے سرفراز کرے، انکے پورے حالات نقوش سلیمانی کے آخر میں ان کی مثنوی کے دیباچہ میں لکھے گئے ہیں۔

نومبر سنہ ۱۹۴۲ء

حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی

۲۷؍شعبان ۱۳۶۱ھ کو صوبہ بہار کے مشہور و ممتاز کہنہ مشق شاعر حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی نے اس دنیائے دوں کو الوداع کہا، مرحوم کی عمر اس وقت غالباً اسّی سے زیادہ ہوگی، کانوں سے اونچا سننے لگے تھے، مگر اس سن و سال میں بھی ان کی شاعری کے شباب کا وہی عالم تھا، غزلوں کے کہنے کا اتفاق کم ہوتا تھا، مگر قومی و علمی و اخلاقی اور فلسفیانہ نظموں کا شوق زیادہ تھا، زیادہ تر اردو میں اور کبھی کبھی فارسی میں کہتے تھے اور شاذ و نادر عربی میں بھی طبع آزمائی کی نوبت آجاتی تھی۔

پٹنہ میں سرسید مرحوم کی تعلیمی و قومی تحریک کے علمبردار قاضی رضا حسین صاحب مرحوم تھے، یہ اُن کے حیدرآباد کے وفد کے ایک رکن بھی تھے، قاضی صاحب مرحوم کی فیض بخش علمی صحبتوں میں بہار کے جو چند نوجوان اُبھرے، 'بڑھے اور پھیلے' ان میں ایک نام حافظ آزاد مرحوم کا بھی ہے، چنانچہ سرسید مرحوم کے اس ۱۸۹۱ء والے حیدرآبادی وفد میں جس کے دوسرے ممبر مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حالی وغیرہ تھے، قاضی رضا حسین صاحب کیساتھ آزاد مرحوم بھی تھے۔

میں نے ان کو سب سے پہلے ۱۹۰۰ء میں جب میری نوعمری تھی ندوہ کے اجلاس پٹنہ میں اپنا ترکیب بند پڑھتے سنا، بلند قد، اونچی آواز، خود اعتمادی کے تیور، لہجہ پرجوش، کٹہرے میں شیر کی گرج سی سنائی دیتی تھی، سامنے علماء اور مشائخ کی صفیں تھیں، جن کی تعداد کئی سو سے کم نہ ہوگی، اکثر کی نورانی شکلوں کی یاد اب بھی دل کو منور کرتی ہے، شاعر نے جب ان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرکے یہ شعر پڑھا ہے:۔

نشانِ کاروانِ رفتہ ہیں دل کے اُجالے ہیں
غنیمت ہی غنیمت ہیں کہ سب اللہ والے ہیں

تو تحسین و آفریں کی آوازوں سے ساری فضا گونج گئی تھی، اسی جلسہ میں آغا سنجر طہرانی بھی تھے، اور انہوں نے بھی اپنا وہ فارسی قصیدہ پڑھا تھا جس کا مطلع تھا،

ستایش می سزد البتہ یکتا ذاتِ یزداں را
کہ اوازِ نطق تشریفِ شرف بخشید انساں را

مولانا شبلی مرحوم سے ان کی ملاقات اسی عہد جوانی کی تھی، مولانا مرحوم نے جن دنوں ۱۹۰۸ء میں اپنی ان فارسی غزلوں کا سلسلہ شروع کیا تھا، جو بوئے گل اور دستۂ گل کے نام چھپ چکی ہیں اور ملک میں ان غزلوں کا پرجوش خیر مقدم کیا جارہا تھا اور اہل سخن ان کے جواب میں غزلیں لکھا کرتے تھے، تو ان میں سے ایک حافظ صاحب مرحوم بھی تھے، غالباً یہی سنہ تھا مولانا مرحوم کلکتہ سے لوٹ کر پٹنہ میں مولوی خدا بخش خاں مرحوم (کتب خانہ والے) کے یہاں ٹھہرے تھے، خاکسار بھی حلقہ تھا لاتے میں مولانا سے ملنے حافظ صاحب مرحوم بھی آگئے، اسی زمانہ میں مولانا کی ایک فارسی غزل نئی نئی شاق افتادہ بود، طاق افتادہ بود، نکلی تھی، وہ مولانا نے ان کو سنائی، انہوں نے بعد کو اسکا جواب لکھا، سب سے آخری دفعہ وہ ۱۹۲۶ء کے اجلاس ندوہ کانپور میں جس کے صدر حکیم اجمل خاں مرحوم تھے ادھر آئے تھے اور اپنی ایک نظم پڑھی تھی۔

مرحوم فطری شاعر تھے، کسی استاد سے کبھی اصلاح نہیں لی، مشکل قافیوں اور ردیفوں کا بھی شوق تھا، زبان و محاورات و روزمرہ کے بجائے دقیق مضامین و معانی کا شوق زیادہ تھا، اسی لئے مشکل الفاظ سے پرہیز نہ تھا، طبیعت میں ذکاوت و ذہانت تھی اور اپنے لئے آپ راستہ پیدا کرنے کی دھن تھی، تقلید عام سے نفور تھے، جوانی میں شاد عظیم آبادی سے بھی بھڑتے رہتے تھے اور الپنچ میں مذاقیہ اد نظم بھی دیتے تھے، ادھر مدت سے خانہ نشین تھے، باہر کی آمدورفت بند تھی، کبھی کبھی ایک آدھ نظم کسی رسالہ میں نکل جاتی تھی، اسی حالت میں اپنے وطن شاہو بگہہ ضلع گیا میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

رمضان المبارک ۱۳۶۱ھ، اکتوبر ۱۹۴۲ء

وصل بلگرامی

اس ماہ میں یوپی اور بہار کے دو ممتاز شاعروں اور ادیبوں کی وفات کی اطلاع ملی، ان صفحات میں ان مرحومین کا ذکر اس لئے ہوتا ہے کہ ہماری آئندہ نسلوں کو اپنے پچھلوں کے نام نیک کی خبر رہے، اسلامی تاریخ کا ایک بڑا اہم کارنامہ وفیات یعنی ہزاروں لاکھوں بزرگوں، فاضلوں، ادیبوں اور ممتاز لوگوں کی وفات کی تاریخ کا تعین ہے، تاریخ کی اس صنف پر بہت سی کتابیں مدون ہوئیں، کیا عجب ہے کہ شذرات کا یہ حصہ ایک دن اس عہد کے وفیات کے اوراق بن جائیں۔

وصل بلگرامی مرحوم ومغفور کے جاننے والوں اور ملنے والوں کو یہ سنکر بڑا قلق ہوگا، کہ ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۶۱ھ کورات کے وقت وہ ہمیشہ کے لئے اُن سے جدا ہوگئے، مرحوم بڑے ملنسار، متواضع، پر محبت، دوستوں کے فدا کار اور وقت پر ہر ایک کے کام آنے والے تھے، وہ گو ہمیشہ سے دیندار اور پابند وضع لوگوں میں تھے، جوانی میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث گنگوہی سے ملتے تھے اور اب ادھر دس بارہ برس سے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی (متعنا اللہ تعالیٰ بفیوضہ وبرکاتہ) سے ان کی ارادت کا تعلق تھا اور اب وہ زیادہ تر حضرت مولانا کی خدمت میں تھانہ بھون ہی میں خانقاہ امدادیہ کے ایک حجرہ میں مقیم رہتے تھے، وہیں اسی حجرہ میں چندروز کے بخار میں اچانک وفات پائی، شیخ نے اپنے مرید کی نماز جنازہ پڑھائی اور وہیں کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ خاکسار سے مرحوم کے تعلقات بہت پرانے تھے،

۱۹۰۶ء میں میری تعلیم ختم ہوئی اور وہ اس عمر میں تھے کہ عالمگیر کے نام ایک رسالہ نکال رہے تھے، ان سے بلگرام ہی کی مردم خیز زمین پر اسی زمانہ میں ملاقات ہوئی تھی، اس وقت وہ جوان شاعر اور ادیب تھے، اُردو فارسی قدرے عربی اور انگریزی جانتے تھے، پھر اُن کو جب وہ ادھیڑ ہو چکے تھے مولوی سبحان اللہ صاحب مرحوم رئیس گورکھپور کی سرپرستی میں گورکھپور میں دیکھا، اس کے بعد انہوں نے لکھنؤ پہنچ کر مرقع نام کا رسالہ جاری کیا، جو چند سال جیتا رہا، اب آخر میں وہ زاہد گوشہ نشیں ہو کر آتے اور اسی ہراں کے کارنامۂ حیات کا خاتمہ ہو گیا، اللہ تعالیٰ اس خلق محبت کے مجسمہ کو اپنی محبت سے نوازے۔

شوال ۱۳۶۱ھ

نومبر ۱۹۴۲ء

مولانا عبدالقادر صاحب قصوری

پنجاب کے نامور عالم اور وکیل و مجاہد سیاسیات مولانا عبدالقادر صاحب قصوری کی وفات کی خبر سے بڑا صدمہ ہوا، قصور ضلع لاہور ان کا وطن تھا اور وہیں وکالت کرتے تھے اور اچھے نامور وکیل تھے، عربی کے عالم، دینیات کے فاضل اور انگریزی کے واقف تھے، مولانا ابوالکلام کے الہلال والی تحریک سے ان کو ایسی دلچسپی تھی کہ اس کے لئے انہوں نے بہت کچھ نثار کیا، اپنے ایک صاحبزادہ کو ایک طرف عالم بنایا اور دوسری طرف کیمرج کا گریجویٹ، اسی طرح اپنے دوسرے بیٹے کو بھی عربی و انگریزی کی تعلیم دلائی اور دونوں کو مع اپنی زندگی کے بہت سے سرمایہ کے دعوت و تبلیغ اسلام کے کاموں کی نذر کر دیا، جس کا سلسلہ ایک زمانہ میں بمبئی سے لے کر مدراس تک جال کی طرح پھیلا تھا، خلافت کی تحریک میں کامیاب وکالت کو خیرباد کہہ کر قومی و سیاسی تحریکوں میں شامل ہو گئے اور اخیر تک اپنے عہد پر قائم رہے۔

مرحوم مسلکاً اہل حدیث تھے، نہایت دیندار، متواضع، ملنسار، پابند وضع، علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی تصانیف کے بڑے شائق تھے اور انہی کی تحقیقات پر ان کا عمل تھا، خلافت حجاز اور کانگریس میں بیش از بیش حصہ لیا اور اس عمر میں بھی جو غالباً اسی[۸۰] کے قریب ہوگی، وہ اپنے جذبات کے لحاظ سے ایسے ہی جوان تھے ادھر سیاسیات کی عملی تحریکوں سے کنارہ کش تھے،

مرحوم کو خاکسار سے گوناگوں تعلقات قلبی تھے، قومیات میں ہمیشہ ساتھ رہا خیالات

میں بہت کچھ ہم آہنگی تھی، سب سے اخیر بات یہ کہ حجاز کے وفد خلافت میں جو ۱۹۲۴ء میں جدہ تک جاسکا تھا وہ خاکسار کے ساتھ تھے، گو وفد کی صدارت برائے نام میرے نام تھی، مگر ان کے مشورہ کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا تھا، جدہ کے نہایت پُر خطر موقعوں پر جب جان کا خطرہ بھی تھا وہ برابر ہمت بڑھاتے رہتے تھے، مکلا، سوڈان، جدہ اور قاہرہ میں ہر جگہ وہ ساتھ تھے، افسوس کہ اس وفد کے تین ۳ ممبروں میں دو ۲ مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا عبدالقادر قصوری چل بسے، اب صرف ایک باقی ہے، معلوم نہیں وہ بھی کتنے دن کے لئے۔

ذیقعدہ ۱۳۶۱ھ

دسمبر ۱۹۴۲ء

سر محمد یعقوب

سر محمد یعقوب کی ناگہانی وفات کا سانحہ اخباروں میں آچکا ہے، مرحوم مراد آباد کے رہنے والے تھے، ان کے والد ماجد مولوی محمد اسماعیل صاحب وکیل شاہجہانپور نہایت نیک، متین و دیندار بزرگ تھے، ندوۃ العلماء کے رکن تھے اور ۱۹۰۷ء کی تبلیغی تحریک میں مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ تھے، سر محمد یعقوب نے گو انگریزی تعلیم پائی تھی، مگر مذہبی ذوق ورثہ میں پایا تھا اور بڑے خوش قسمت تھے، مراد آباد کی کامیاب وکالت سے لے کر کونسل کی صدارت تک اور پھر سرکار نظام کے مشیر اصلاحات کے رتبہ تک انہوں نے جو ترقی کی وہ سراسر ان کی خوش قسمتی کا نتیجہ تھی، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس عالم میں بھی خوش قسمت بنائے، وہ بہت خوش خلق، متواضع، متحمل اور حاجت مندوں اور ضرورتمندوں کی امداد میں کشادہ دست تھے، غفر اللہ تعالیٰ۔

ذیقعدہ ۱۳۶۱ھ

دسمبر ۱۹۴۲ء

دیانرائن نگم، بی۔اے،

اُردو زبان کے مشہور پرانے رسالہ زمانہ کے اڈیٹر دیانرائن نگم نے اسی مہینہ وفات پائی، کالج سے نکلنے کے ساتھ انہوں نے بریلی میں زمانہ کو جو اردو کا ایک معمولی رسالہ تھا، اپنی ادارت میں لیا اور اس کو کانپور لائے اور اس کو اس حد تک چمکایا کہ اُردو کے رسالوں میں گنا جانے لگا، بلکہ اس وقت وہ اردو کا سب سے پُرانا رسالہ ہے، پریم چند آنجہانی کو وہی سب سے پہلے اسٹیج پر لائے، اُن کے علاوہ اور بہت سے اچھے لکھنے والے اور کہنے والے ہندو اور مسلمان نوجوانوں نے اُن کے سایۂ قلم میں تربیت پائی اور کہنا چاہیئے کہ زمانہ صرف انہی کی بدولت ہندو اور مسلمان اہل قلم کا سنگم اب تک رہا اور اس کو دیکھ کر تسکین ہوتی تھی کہ ہندو مسلمانوں کی پرانی تہذیب کے شیدائی ہندو ابھی تک زندہ ہیں۔

مدت سے جسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

امید کہ زمانہ آئندہ بھی اپنے بانی کی یادگار میں اس کی بنائی ہوئی روش پر چلتا رہے گا۔ تاکہ اس اختلاف آباد ہند کی اس آندھی میں دیانرائن کا یہ دیا جلتا رہے۔

دسمبر ۱۹۴۲ء

مولانا محمد معزاللہ صاحب خیرآبادی

ایک زمانہ تھا کہ رامپور علمائے اعلام کا مرکز تھا اور خیرآبادی سلسلہ کے تعلق کے سبب سے وہاں کا مدرسہ عالیہ علوم عقلیہ کی سب سے بڑی درسگاہ تھی، لیکن مولانا فضل حق رامپوری مرحوم کی وفات پر اس کا بھی خاتمہ ہوگیا، اب پیران کہن سال میں وہاں ایک ہی صاحب رہ گئے تھے، یعنی مولانا محمد معزاللہ صاحب مرحوم، افسوس کہ ۶ر جنوری ۱۹۴۳ء کی رات کو انہوں نے بھی رحلت کی، یہ مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی کے آخری شاگرد اور مدرسہ کے پرانے اساتذہ اور بزرگوں کے فیض یافتہ تھے، فقہ میں مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی سے (جو فقہ واصول میں مولانا شبلی مرحوم کے بھی استاد تھے) اور مولانا حسن شاہ صاحب محدث رامپوری سے بھی استفادہ کیا تھا، سلسلہ نقشبندیہ اور قادریہ وچشتیہ کے مجاز بھی تھے، رامپور میں مرحوم کا علمی مرتبہ اتنا بلند تھا کہ کسی فتویٰ پر جب تک اُن کے دستخط نہ ہوتے وہ عام طور پر مستند نہیں سمجھا جاتا تھا، خاکسار کو دو سال ہوئے کہ مرحوم سے ملاقات کا اور ان کے درس کے سننے کا اتفاق ہوا تھا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے افسوس کہ پچھلے مدرسین اٹھتے جاتے ہیں اور زمانہ کی نئی آب وہوا اس تبحر اور مہارت کے نئے مدرسین عربی کی نشوونما سے عاجز ہے۔

فروری ۱۹۴۳ء

سیّد سجّاد حیدر مرحوم

۱۲ اپریل ۱۹۴۳ء کی رات کو سیّد سجاد حیدر مرحوم نے جو ادب کی دنیا میں یلدرم کے نام سے مشہور تھے، قلب کے عارضہ سے دفعتہً وفات پائی، یہ علی گڑھ کالج کے پُرانے تعلیمیافتوں میں اور اسی تعلق سے کالج کے اُن چند طالب علموں میں تھے جنہوں نے مولانا شبلی مرحوم کے درس اور صحبت سے شعر و ادب کا ذوق حاصل کیا تھا، مرحوم مولانا کے درس کے اس قسم کے واقعات کو مزے لے لے کر بیان کیا کرتے تھے، ان کا اصل وطن نہٹور (یوپی) میں تھا، ۱۹۰۱ء میں بی اے کی سند پاکر تعلیم سے فراغت پائی۔

ہماری زبان میں اس وقت ادب لطیف کا جو رواج ہے، اس کے پُرانے لکھنے والوں میں سب سے پہلا نام سیّد حیدر مرحوم کا ہے اور چونکہ قادر مطلق کو ان سے یہ کام لینا تھا، اس لئے ان کی زندگی میں اس کا مناسب سامان بھی پیدا کر دیا یعنی یہ کہ کالج کے زمانہ ہی میں ان کو ترکی پڑھنے کا خیال ہوا، علی گڑھ میں نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس علی گڑھ کے والد بزرگوار ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے، وہیں نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب کی تعلیم و تربیت ہوئی، اس زمانہ میں ترکی وہاں کی سرکاری زبان تھی، اس لئے ان کو ترکی بھی پڑھائی گئی اور جب وہ ہندوستان آئے تو وہ ترکی ادب کے گویا نمائندہ ہو کر آئے، چنانچہ سرسیّد کے "تماشائے عبرت" میں وہ اسی ہیئت سے اسٹیج پر آئے ہیں اور معارف علی گڑھ میں جس کے وہ شریک ایڈیٹر تھے، وہی ترکی ادب کی اشاعت کا ذریعہ بنے۔

بہرحال سجاد حیدر مرحوم نے انہی سے ترکی زبان سیکھی اور اس کا یہ فائدہ ان کو پہنچا کہ سرکار انگریزی نے ان کو علی گڑھ کالج کے پرنسپل مارین صاحب کی سفارش سے اپنے

ترکی سفارت خانہ میں ترجمان کی حیثیت سے لے لیا اور عراق میں ان کا تقرر ہوگیا، یہ سنہ ۱۹۰۴ء کا واقعہ ہے، جدید ترکی ادب پر فرانسیسی ادب کے بے حد اثرات تھے، مرحوم نے ترکی ادب کے انہی اثرات کو قبول کیا اور ان کو اُردو ادب میں منتقل کیا، اسی زمانہ میں سنہ ۱۹۰۱ء سے مخزن لاہور نے جنم لیا تھا، مرحوم نے اسی زمانہ میں ترکی ادب کا یہ تحفہ عراق سے ہندوستان کو بھیجا اور مخزن کے خوانِ ادب میں وہ شہر بہ شہر ہاتھوں ہاتھ بٹا، اسی زمانہ میں مخزن میں ایک معاشرتی افسانہ حقوق نسواں سے متعلق چھپا تھا، استاد مرحوم کی زبانی بار بار اس کی تعریف سُنی تھی، ان کے ان مضمونوں کا مجموعہ سنہ ۱۹۰۸ء میں خیالستان کے نام سے چھپا تھا۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں وہ بغداد سے ہندوستان آکر دہرہ دون میں سابق شاہ افغان امیر یعقوب خاں کے اسسٹنٹ پولیٹکل افسر مقرر ہوئے، تین سال کے بعد ترکی کے انقلاب اول کے بعد سنہ ۱۹۱۱ء میں ترکی گئے، چھ ماہ کی سیاحت کے بعد وہاں سے واپس آکر دوبارہ اپنے عہدہ کا چارج لیا، سنہ ۱۹۱۴ء میں وہ مہاراجہ محمود آباد کے پرائیوٹ سکریٹری بنے، سنہ ۱۹۱۸ء میں ڈپٹی کلکٹر ہوکر سلطان پور (اودھ) میں مامور ہوئے، سنہ ۱۹۲۰ء یا سنہ ۱۹۲۱ء میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کے بعد وہ یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار اور اردو کے صدر مقرر ہوئے۔ جنگِ عظیم کے بعد مصطفیٰ کمال پاشا کے انقلاب کے بعد سنہ ۱۹۲۴ء میں دوبارہ چھ ماہ کے لئے ترکی کا سفر کیا اور وہاں سے بہت سے نئے حالات کا مطالعہ کیا اور ترکی علم و ادب کے نئے اصحاب سے تعارف پیدا کیا اور بہت سی اچھی کتابوں کا تحفہ ساتھ لائے، میری ان کی ملاقات علی گڑھ کے دوران میں ہوئی تھی جو ذاتی روابط کے حد تک بڑھ گئے تھے، انہیں دارالمصنفین سے دلچسپی تھی۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں انہوں نے عراق و ایران کا سفر کیا اور وہاں سے واپسی پر پہلے ہردوئی میں ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے، ایک سال کے بعد وہ جزائر انڈمان کے یونیو کمشنر ہوکر انڈمان گئے، وہاں سے واپس ہوکر غازی پور میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے، غازی پور کے زمانہ قیام میں

لئے پرانے شوق کو پورا کیا، یعنی دارالمصنفین آکر استاد مرحوم کی قبر کی زیارت کی اور دارالمصنفین کو دیکھا، ۱۹۳۳ء میں انہوں نے فریضۂ حج ادا کیا اور ایک سال کے بعد ۱۹۳۵ء میں پنشن پاکر دہرہ دون میں سکونت اختیار کی، ۱۹۳۶ء میں راقم بھی دو ماہ کیلئے دہرہ دون تبدیل آب وہوا کے لئے جاکر رہا تھا، اس زمانہ میں ان سے بار بار ملاقاتیں ہوتی رہیں، وہ وہاں ایک اسلامیہ اسکول کے سکریٹری تھے، مگر صحت اچھی نہیں رہی تھی، اس لئے علیل رہتے تھے، ۱۹۳۷ء میں بچوں کی تعلیم کی خاطر لکھنؤ آکر رہے اور موجودہ راجہ صاحب محمود آباد کے پرائیوٹ سکریٹری بنے اسی زمانہ میں اگست ۱۹۴۲ء میں کابل کا سفر کرکے بلاد اسلامیہ کی سیاحت پوری کرلی اور ۱۲ر اپریل ۱۹۴۳ء کو ہمارے سیاح عالم نے عالم آخرت کا سفر اختیار کیا۔

وہ بغداد کے زمانۂ قیام میں شاید سرکاری ملازم ہونے کے سبب سے اپنے شروع کے مضمونوں میں اپنے نام کے بجائے "یلدرم" لکھا کرتے تھے، جو مشہور ترکی سلطان بایزید کا لقب تھا، جس کے معنی بجلی کے ہیں، چونکہ وہ اپنے دشمنوں کی بے خبری میں اُن کے سروں پر اس تیزی سے آکر گرتا تھا کہ لوگ اس کو یلدرم کہتے تھے۔

سجاد حیدر یلدرم ہماری زبان میں ایک نئی صنف ادب کے جس کو ادب لطیف کہتے ہیں بانی تھے اور اس لئے ہماری ادبی تاریخ میں ان کا ایک پایہ ہے، وہ کئی ادبی افسانوں کے مصنف اور ترکی ناولوں کے مترجم ہیں، وہ بڑے متواضع، مرنج و مرنجان' ہنس مکھ، ملنسار، شگفتہ دل، بذلہ سنج اور شریف و نرم طبع تھے، ان کے دوستوں کو ان کی یاد بہت آئے گی، اُن کی وفات کا حادثہ لکھنؤ میں پیش آیا اور وہیں کی خاک کے سپرد ہوئے، اللہ تعالیٰ اُن کی قبر پر اپنے فیض و کرم کے چھینٹے برسائے۔

ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ، مئی ۱۹۴۳ء

شمس العلماء عبدالرحمان شاطر مرحوم

دکن ٹائمز مدراس میں یہ پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ مدراس کے مشہور و ممتاز فلسفی شاعر مولانا شاطر کا وسط اپریل ۱۹۴۳ء میں انتقال ہو گیا۔

ارکاٹ احاطۂ مدراس میں اسلامی علم و تمدن کی فراموش شدہ تاریخ کا ایک ورق ہے، نواب ارکاٹ کا محل ارکاٹ کے جنگی خاتمہ کے بعد خود شہر مدراس ہے شمس العلماء عبدالرحمان شاطر اسی برج فلکی کے آفتاب تھے، عمر ستر کے قریب ہوگی، اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں سے واقف تھے، نواب صاحب ارکاٹ کے سکریٹری بھی تھے اور مدراس ہائیکورٹ میں مترجم بھی رہے تھے، گو وطن مدراس تھا، مگر ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۳ء میں حیدرآباد دکن کے بزم علمی میں اس کے شریک تھے، جب مولانا شرر اور داغ اور گرامی حیدرآباد کی زینت تھے، وہ ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے اور ان سے اپنے ذوقِ ادب کی پرورش کرتے تھے اور اسی زمانہ سے وہ مولانا کے قریب رہنے والوں اور قریب سے جاننے والوں میں تھے اور ان کی وہی محبت تھی جو حضرت الاستاد کی وراثت میں مجھے ملی تھی۔

عبدالرحمان مرحوم شاعر تھے، شاطر تخلص کرتے تھے، اشعار حکیمانہ اور فلسفیانہ کہتے تھے، قطعات، رباعیات اور قصائد موزوں کرتے تھے، جدید سائنس اور فلسفہ کے مسائل کو اسلامی الٰہیات سے تطبیق دیتے تھے، زبان سخت تھی اور مشکل الفاظ کے استعمال سے ان کو پرہیز نہ تھا، ان کی سب سے مشہور فلسفیانہ نظم "اعجازِ عشق" ہے، جو ایک

طویل رائیہ قصیدہ ہے جس میں جدید و قدیم فلسفیانہ مسائل و آراء سے الہیاتِ اسلامیہ کی تفسیر و تشریح کی ہے یہ نظم ۱۹۰۴ء میں لکھی گئی تھی اور اس زمانہ کے تمام اکابر و مشاہیر مولانا حالی، مولانا شبلی، مولانا نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ خاں، نواب عماد الملک، مولوی سید اکبر حسین، پروفیسر عبد الغفور شہباز، امجد علی اشہر، شاد عظیم آبادی، جلال لکھنوی، علی حیدر طباطبائی، استاد گرامی وغیرہ نے بیحد توصیف و تحسین کی تھی، ان میں سے مولانا شبلی کی جامع دمانع و مختصر تقریظ بطور نمونہ حوالہ قلم ہے۔

"آپ کا قصیدہ میں نے دیکھا، اس سے پہلے آپ کی مختلف نظمیں نظر افروز ہوئی تھیں، میں مدت سے آپ کی قادر الکلامی اور خوش فکری کا معترف ہوں، آپ کے کلام میں فلسفیانہ خیالات جس خوبی و برجستگی سے ادا ہوتے ہیں، اس کی مثالیں اردو میں کم ملتی ہیں"۔

معارف نومبر ۱۹۲۵ء میں مرحوم اور ان کے فکر کی شاعرانہ لیاقت و قابلیت کا ذکر بسلسلہ سفر مدراس کیا گیا تھا اور اسی کے پس و پیش زمانہ میں مثلاً اپریل ۱۹۳۰ء میں ان کی کچھ نظمیں بھی معارف میں نکلی ہیں۔

دکن میں مولانا شاطر جیسے اردو کے حکیم شاعر کا وجود اس زبان کی عالمگیری کی دلیل قاطع تھی جس نے چالیس برس تک اہل دکن کو اپنی خوش نوائیوں سے مسرور و محسوس رکھا، افسوس کہ اس سرزمینِ دکن کا یہ بلبلِ شیریں نوا اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

جون ۱۹۴۳ء

منشی احتشام علی صاحب

لکھنؤ کی سرزمین میں اپریل کے چوتھے ہفتہ میں ایک اور حادثہ پیش آیا یعنی کاکوری کے ممتاز خاندان کے رئیس جناب منشی محمد احتشام علی صاحب نے ۲۲ اپریل کی صبح کو ۷۵ برس کی عمر میں وفات پائی، کہنا چاہئے کہ اودھ میں قدیم شریفانہ جوہر وضعداری، دینداری، مروت، سیرچشمی، غربانوازی اور مسکین پروری کا یہ اخیر نمونہ تھا، ان کی پوری زندگی میں جس میں وسعت کا زمانہ بھی تھا اور تنگی کا بھی، ان کے ہاتھ یکساں کھلے رہے۔ اور اس اخفار کے ساتھ کہ بائیں ہاتھ کو بھی داہنے ہاتھ کی خبر نہ تھی، وہ مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی سے بیعت تھے، اس تعلق کو اخیر اخیر وقت تک جس طرح نباہا، وہ ان کی سعادت مندی کا نشان ہے، پابندی یہ کہ مرتے وقت تک سجدۂ عبودیت ادا کیا ہے اور صبر و شکر کے کلمے زبان سے نکلتے رہے۔

ان کی جوانی تھی کہ ندوۃ العلماء کا غلغلہ بلند ہوا، چونکہ اس مجلس کے سر پر فضل رحمانی سایہ فگن تھا۔ اس لئے حضرت شیخ کے سارے حلقہ بگوش اس کے حلقہ میں تھے اور اسی مناسبت سے جناب منشی محمد اطہر علی صاحب مرحوم اور ان کے ساتھ میں جناب منشی محمد احتشام علی صاحب ندوہ کے خدام میں داخل ہوئے تھے، اپریل ۱۸۹۵ء میں اس کا پہلا جلسہ لکھنؤ میں ہوا تھا، اس اپریل ۱۸۹۵ء سے لے کر ۲۲ اپریل ۱۹۴۳ء کی صبح تک جب کہ انہوں نے زندگی کی اخیر سانس لی ہے، یکساں دلچسپی، خلوص و انہماک سے اپنے فرائض کو انجام دیا ہے۔ نہ صرف رئیسوں میں بلکہ مسلمانوں میں

اس قدامت خدمت اور مخلصانہ مذہبی و قومی خدمت گزاری کی مثال شاید ہی ملے۔

خیالی گنج میں ان کی بڑی اور وسیع کوٹھی، اُن کے عزیزوں کا مسکن، نوواردوں کا ماویٰ، غریبوں کا ملجا، بڑے بڑے قومی خادموں کی فرودگاہ، علمار فضلار اور صلحار کا مہبط اور مسلمانوں کے بڑے بڑے قومی جھگڑوں اور فیصلوں کی عدالت گاہ رہی ہے۔ گو سیلاب نکل جانے کے بعد بھی زمین پر اس کے آثار باقی تھے، افسوس ہے کہ منشی صاحب مرحوم کی وفات کا حادثہ پچھلے دَور خدمت کے قدیم جواہر فضائل کو بھی اپنے ساتھ لے گیا، إنا لله، اب اُن کے جانشین فرزندوں منشی محمد انعام علی اور منشی محمد احترام علی صاحب سے امید ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے نیک نام کو اپنی خدمات سے زندہ رکھیں گے۔

ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ

مئی ۱۹۴۳ء

موتُ العَالِم موت العَالَم

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

محفل دوشیں کا وہ چراغِ سحر جو کئی سال سے ضعف و مرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا، بالآخر ۸۲ سال ۳ ماہ ۱۰ روز جل کر ۱۵ رجب ۱۳۶۲ھ کی شب کو ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔

داغِ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یعنی حکیم امّت، مجدد طریقت، شیخ الکل حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مرض ضعف و اسہال میں کئی ماہ علیل رہ کر ۱۹ اور ۲۰ جولائی کی درمیانی شب کو ۱۰ بجے نمازِ عشاء کے وقت اس دارِ فانی کو الوداع کہا اور اپنے لاکھوں معتقدوں اور مریدوں اور مستفیدوں کو غمگین و مہجور چھوڑا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اب اس دور کا بالکلیہ خاتمہ ہوگیا، جو حضرت شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، مولانا یعقوب صاحب نانوتوی، مولانا قاسم صاحب نانوتوی، مولانا شیخ محمد صاحب تھانویؒ کی یادگار تھا اور جس کی ذات میں حضرات چشت اور حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت سید احمد بریلوی کی نسبتیں یکجا تھیں، جس کا سینہ چشتی ذوق و عشق اور مجددی سکون و جمعیت کا مجمع البحرین تھا، جس کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمان تھی، جس کے قلم نے فقہ و تصوف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا اور جس کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے اپنی تعلیم و تربیت اور تزکیۂ ہدایت

سے ایک عالم کو مستفید بنا رکھا تھا اور جس نے اپنی تحریر و تقریر سے حقائقِ ایمانی، دقائق فقہی، اسرارِ احسانی اور رموزِ حکمتِ ربانی کو برملا فاش کیا تھا اور اسی لئے دنیا نے اس کو حکیم الامت کہہ کر پکارا اور حقیقت یہ ہے کہ اس اشرفِ زمانہ کیلئے یہ خطاب عین حقیقت تھا۔

سوانح: حضرت کی پیدائش ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو چہار شنبہ کے دن ہوئی، ابتدائی عربی تعلیم تھانہ بھون میں مولانا فتح محمد صاحب تھانوی سے حاصل کی، ۱۲۹۵ھ سے شروع ۱۳۰۱ھ تک مدرسہ دیوبند میں رہ کر مولانا یعقوب صاحب کے حلقہ میں تکمیل کی، فراغت کے بعد ہی ۱۳۰۱ھ میں مدرس ہو کر کانپور آ گئے اور چودہ سال یہاں مقیم رہے اور اپنے درس، مواعظ اور فتاویٰ سے لوگوں کو مستفید کیا۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ سے بواسطہ خط کے غائبانہ بیعت مہاجر الی اللہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے ۱۲۹۹ھ میں ہو چکی تھی، لیکن ۱۳۰۱ھ کے آخر میں ایام حج میں بعد حج حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اخذ فیض فرمایا اور واپس آ کر ۱۳۰۶ھ تک علمی مشاغل، تصنیف و تالیف اور تدریس کے ساتھ ذکر و شغل بھی ضمناً معمول رہا، مگر ۱۳۰۷ھ میں رنگ نے پلٹا کھایا اور یہ رنگ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ۱۳۱۰ھ میں مضطربانہ اور والہانہ حج کا دوبارہ ارادہ کیا اور حضرت حاجی صاحب کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو کر دوبارہ ایک زمانۂ خاص تک رہ کر استفادۂ باطنی فرمایا، واپس آ کر ۱۳۱۳ھ تک پھر کانپور میں رہے، آخر حضرت حاجی صاحب کے مشورہ کے مطابق ۱۳۱۵ھ میں کانپور سے ترکِ تعلق فرما کر تھانہ بھون میں متوکلانہ اقامت فرمائی اور اس وقت سے لے کر اخیر وقت تک یعنی اس ۱۳۶۲ھ تک اسی شان سے خانقاہ امدادیہ کی سہ دری میں بیٹھ کر افادہ و افاضہ میں برابر معروف رہے اور ایک خلق کو اپنی برکات سے بہرہ مند فرمایا، اسی اثناء میں اپنے مواعظ تصانیف اور ملفوظات سے لاکھوں کو انسان، ہزاروں کو مسلمان اور سینکڑوں کو متقی کامل

بنادیا اور حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعا یا پیشگوئی پوری ہوئی۔

"بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے، امید ہے کہ آپ سے
خلائق کثیر کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ و مسجد کو ازسرِ نو
آباد کریں، میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور خیال رہتا ہے۔"

۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ

تصانیف: حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف و رسائل کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے اور کل کی کل تحقیقاتِ علمیہ، حقائقِ دینیہ اور نکات احسانیہ سے لبریز ہیں۔ ان میں تفسیر البیان، شرح مثنوی، فتاویٰ امدادیہ، التعرف الی التصوف، اور بہشتی زیور وغیرہ کتابیں کئی کئی جلدوں میں ہیں، ملفوظات اور مواعظ و خطبات کی تعداد سینکڑوں کی حد تک ہے، ان تصانیف میں قرآن پاک کی مشکل آیات کریمہ کی تفسیر، احادیث شریف کی شرح، فقہ کے مشکل مسائل کا جواب، سلوک و طریقت کے نکتے، اخلاقی فضائل و رذائل کی حکیمانہ تحقیق اور ان کے حصول و ازالہ کی تدابیر اور زمانہ حال کے شکوک و شبہات کے جوابات سب کچھ ہیں، تصانیف میں متفرق علوم و مسائل اس کثرت سے ہیں کہ اگر ان سے کسی ایک موضوع کے مباحث کو علیحدہ علیحدہ کیا جائے تو ایک ایک مستقل کتاب بن جائیں، چنانچہ حضرت کے تربیت یافتوں نے اس قسم کے بیسیوں مجموعے تیار کئے ہیں، سب سے اخیر میں اس قسم کا مجموعہ "بوادر النوادر" کے نام سے ایک ہزار صفحوں میں چھپ کر شائع ہوا ہے، خطوط کے جوابات کا جن کے متعلق وفات کے دن تک یہ اہتمام رہا کہ آج کے خط کا جواب کل کے لئے اٹھا نہ رکھا جائے، عظیم الشان دفتر الگ ہے۔

تصنیفات میں بلکہ ہر تحریر میں اہل نظر کو یہ معلوم ہوگا کہ گویا مصنف کے سامنے سارے مسائل و مواد یکجا ہیں اور وہ سب کو اپنی اپنی جگہ احتیاط سے رکھتا جاتا ہے، عام طور سے

یہ ہوتا ہے کہ مصنف جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے، اس کو اس میں ایسا غلو ہو جاتا ہے کہ دوسرے گوشوں سے اُس کو ذہول ہو جاتا ہے، حضرت کی تصانیف کی خاص بات یہ ہے کہ قلم ہر ایک کی احتیاط اور رعایت کر کے اور غلو سے بچ کر اس طرح نکلتا ہے کہ جاننے والوں پر حیرت چھا جاتی ہے، حضرت کا ترجمۂ قرآن پاک تاثیر، سہولت بیان اور وضوحِ مطالب میں اپنا آپ نظیر ہے، بہشتی زیور کہنے کو تو عورتوں کی کتاب ہے، مگر فقہ حنفی کی ضروریات کے لئے انتہائی احتیاط و کاوش کا نتیجہ ہے، تفسیر القرآن کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ روح المعانی اور تفاسیر ماسبق کی اُردو میں حد درجہ محتاطانہ ترجمان ہے، سلوک و طریقت کی کتابوں کا بھی یہی حال ہے۔

حضرت کی تجدید طریقت کا بڑا کمال یہ ہے کہ طریقت کو جو ایک زمانہ سے صرف چند رسوم کا مجموعہ ہو کر رہ گئی تھی، زوائد و حواشی سے صاف کر کے قدماء اور سلف صالحین کے رنگ پر لے آئے۔

کبھی فرصت سے سُن لینا بڑی ہے داستان میری

علالتِ طبع: حضرت کی صحت ادھر چند سال سے رُو بانحطاط تھی، دو دفعہ خاص علاج کی غرض سے لکھنؤ تشریف لانا ہوا اور دونوں دفعہ صحت و عافیت کے ساتھ مراجعت ہوئی، علالت اصلی یہ تھی کہ معدہ و جگر کا فعل صحیح نہیں رہا تھا، علاج سے طبع مبارک اصلاح پذیر ہو جاتی تھی، مگر بالکلیہ ازالہ نہیں ہوتا تھا، اس دفعہ تین ماہ سے طبیعت پر اضمحلال طاری تھا، چنانچہ علاج کے لئے سہارنپور تشریف لے گئے اور چند روز قیام فرما کر واپس تشریف لے گئے، لیکن طبیعت صاف نہیں ہوئی، وطن میں حکیم سعید صاحب گنگوہی کا علاج شروع ہوا اور ورم جگر و معدہ کا مرض تشخیص ہوا، مگر فائدہ نہ ہوا، اشتہا ساقط تھی، روزانہ اسہال کی تعداد چالیس پچاس تک پہنچ گئی اور ضعف روز بروز بڑھتا گیا، وصال سے قریب بیس روز پہلے حکیم خلیل صاحب سہارنپوری کا علاج

شروع ہوا، ضعفِ معدہ اور ضعفِ جگر کی تجویز تھی، حکیم صاحب کے علاج سے دستوں میں کمی آگئی، مگر اشتہا بالکل ہی ساقط تھی اور ضعف میں ترقی ہی ہوتی رہی۔

میری آخری حاضری: خاکسار جون کے آخر میں اپنے مستقر سے تھانہ بھون اور پھر بھوپال کے ارادہ سے روانہ ہوا، لیکن لکھنؤ پہنچ کر دارالعلوم ندوہ کے معاملات نے الجھا دیا، لکھنؤ میں ہر روز حضرت کی شدتِ علالت کی اطلاعیں آرہی تھیں، حضرت کے ہزاروں معتقدوں کی طرح خاکسار بھی زیارت کے لئے بے چین تھا، حضرت کی طرف سے سخت قدغن تھی کہ باہر لوگوں کو اس شدتِ علالت اور کیفیتِ مزاج کی کوئی اطلاع نہ دی جائے تاکہ مخلصین میں اضطراب نہ پیدا ہوا، اور وہ سفر کی زحمت نہ اٹھائیں، جو پہنچ جاتے تھے عام طور سے بطور تنبیہ ان کو اندر جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی، اس پر بھی خاکسار خلاف دستور بے اطلاع ۶ر جولائی کو لکھنؤ سے روانہ ہوگیا اور ۷ر کی دوپہر کو عین بارش کی حالت میں اسٹیشن سے خانقاہ تک پیادہ پا بھیگتے ہوئے پہنچا، دریافتِ حال سے معلوم ہوا کہ افاقہ کی صورت ہے، جس سے تسکین ہوئی، میرا اس طرح خلافِ دستور بے اطلاع اچانک پہنچ جانا حضرت کے لئے تعجب کا موجب ہوا، میری آمد کے خبر دینے والے سے پوچھا، "تم مولوی سلیمان کو پہچانتے بھی ہو یا یونہی کہہ رہے ہو" اس نے اثبات میں جواب دیا تو ارشاد ہوا کہ ان کی عادت بے اطلاع آنے کی نہ تھی، حضرت کے عزیز خاص مولانا جمیل احمد صاحب نے عرض کی علالت کی سن کر چلے آئے ہونگے۔ نمازِ ظہر کے بعد مجلس میں حاضری ہوئی، ضعف سے بستر پر لیٹے تھے، مصافحہ فرمایا خاکسار نے دستِ مبارک کو بوسہ دیا، شفقت سے بشاشت ظاہر فرمائی، سفر کا حال پوچھا، کسی خادم کے ساتھ نہ لینے پر نصیحت فرمائی، قیام کے دن پوچھے، خاکسار نے بھوپال کے سفر کی ضرورت ظاہر کی کہ سرکار بھوپال نے اپنی ریاست میں مسلمان عورتوں کے طلاق و تفریق کے مسائل کے طے کرنے کے لئے علماء اور اہلِ قانون کی ایک مجلس مقرر کی ہے، اسی کی

شرکت کے لئے مع مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب یہاں سے جانا چاہتا ہوں، اس لئے مجلس کی تاریخ کی اطلاع تک یہاں چند روز رہنا چاہتا ہوں۔

فرمایا اللہ تعالیٰ والیہ بھوپال پر رحمت فرمائے کہ انہوں نے مسلمان عورتوں کے حال پر رحم کھایا، خاکسار نے عرض کی کہ حضرت وہاں اب والیہ نہیں، والی ہیں، فرمایا، ٹھیک ہے، غرض اس حالت میں بھی کہ ضعف پوری شدت پر تھا، تکلم میں تکلف تھا، پھر بھی حاضرین مجلس پر شفقت فرما کر ملفوظات سے ذرا تھم تھم کر بہرہ ور فرما رہے تھے اور لوگوں کے آئے ہوئے خطوط سُن رہے تھے اور بدستور جواب لکھوا رہے تھے، بلکہ بعض بعض خطوط پر خود دستِ مبارک سے بھی لکھ دیتے تھے، کبھی جو قوت پاتے اور اس وقت کام کرنے لگتے یا ملفوظات ارشاد فرمانے لگتے تو تھوڑی کے لئے حاضرین کو یہ خیال ہونے لگتا کہ حضرت بیمار ہی نہیں، مگر ادھر جوشِ بیاں کم ہوا اور ادھر سر تکیہ پر رکھ دیا، ہمیشہ کی عادت یہ تھی کہ بڑا تکیہ پیٹھ سے لگا کر سر کو بے سہارے اونچا رکھتے تھے، یہی حال اس وقت بھی تھا، دیکھنے والوں کو تکلیف معلوم ہوتی اور اس مشورہ کو جی چاہتا تھا کہ دوسرا تکیہ اور رکھ کر اس پر حضرت سر مبارک کو رکھ لیں، چنانچہ میں نے اس سلسلہ میں یہ عرض کیا، تو ارشاد ہوا نہیں، اس کی حاجت نہیں، بعد میں خواجہ صاحب (خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری ریٹائر انسپکٹر آف اسکولس یو پی، جو حضرت کے خلیفہ خاص، محرم خاص بلکہ خادم خاص ہیں) نے فرمایا کہ حضرت کی ہمیشہ کی عادت یہی ہے، اس ضعف و اضمحلال کی حالت میں بھی مجلس کا وقار، نظم و ضبط اور اصول و قواعد کی پابندی بدستور جاری تھی اور آخر لحظہ حیات تک اس میں فرق نہیں آیا۔

عصر کے وقت مجلس برخاست ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ کھانے کے الگ انتظام کی ضرورت نہیں، چند روز کے مہمانوں کے لئے اس کی ضرورت نہیں، بڑے گھر سے کھانا جائے گا اور ایک خادم خاص کو اس کی ہدایت فرمائی، اس ناسزاوار کے لئے تو یہ خیر و برکت

کا ساماں تھا، یہ بھی ارشاد ہوا کہ جب چاہو اور جس وقت چاہو آسکتے ہو، کوئی قید نہیں، یہاں سے اٹھ کر جب خانقاہ پہنچا تو بعد نماز حضرت والا کی طرف سے حضرت کی آخری تصنیف بوادر النوادر کا ایک نسخہ مولانا جمیل احمد صاحب نے ہدیہ لاکر عنایت فرمایا اور یہ ارشاد سامی پہنچایا کہ میرے مضامین سے اقتباسات جمع کر کے شائع کرو، اس حکم کو اپنی ہدایت ورہنمائی کا نسخہ سمجھ کر اپنی سعادت کا اظہار کیا، دوسرے دن حاضری کے موقع پر حضرت نے اپنی زبانِ مبارک سے خود یہ ارشاد فرمانا چاہا تو خاکسار نے حضرت کی زحمت تکلم کے خیال سے عرض کیا کہ یہ ارشاد مبارک مولانا جمیل احمد صاحب کے ذریعہ پہنچ چکا، مگر وہاں سے اُٹھنے کے بعد مولانا جمیل صاحب سے جب میں نے پوچھا کہ حضرت کا مقصود کیا ہے، یعنی اس کتاب بوادر سے اقتباس یا عام کتابوں سے، انہوں نے فرمایا اس کو میں نے اچھی طرح خود بھی نہیں سمجھا، بعد کی حاضری میں موقع پاکر میں نے تفصیل چاہی تو ارشاد ہوا نہیں، عام کتابوں میں جو مضمون مفید نظر آئیں، ان کو یکجا کر لیا کرو۔

آخری حالات: میری حاضری ۷ جولائی سے ۱۱ جولائی کی دوپہر تک رہی، اشتہار کا سقوط اور ضعف کا استیلا اپنی حالت پر رہا، دست پانچ، چھ، سات تک آتے رہے، مزید یہ کہ ہاتھوں اور پاؤں پر ورم تھا، ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کے ناخنوں میں نیلاہٹ نمودار ہوگئی تھی، جو باعثِ تشویش تھی، دو روز کے بعد اس میں کمی آگئی، مگر وفات کے چند روز پیشتر وہ پھر عود کر آئی تھی۔

خدمت اور خاص کر رات کے وقت نوبت بہ نوبت جاگ کر خدمت کی سعادت خدام خاص کی قسمت میں آئی، جن میں پہلا درجہ خواجہ صاحب کا ہے، ان کے علاوہ مولانا جمیل احمد صاحب، بندو میاں (ملازم نواب صاحب باغپت) اور مولوی شبلی صاحب جونپوری نے اس خدمت خاص کی سعادت اخیر تک پائی، بعد کو مولانا ظفر احمد

صاحب بھی ڈھاکہ سے آکر اس میں شامل ہو گئے۔

حاضری کے دوسرے یا تیسرے دن استفسار ہوا کہ کھانا تو مزاج کے موافق ہوتا ہے، عرض کی کہ بالکل مطابق ہے۔ کس تواضع اور کس شفقت اور کس بلاغت سے ارشاد ہوا کہ میں معافی کا خواستگار نہیں مستحق ہوں، اس نکتہ پر اہل ذوق نے تحسین کی سعادت پائی کہ ضعف ونقاہت کے اس عالم میں بھی دل ودماغ ناقصوں کی تربیت میں مصروف ہیں اور اکرام ضیف کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔

دو تین واقعے ذکر کے قابل ہیں، اسی اثنائے حاضری میں بنگال سے ایک معتقد باالاخلاص کا خط آیا، جس میں لکھا تھا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب نبیؑ کی وفات کا وقت آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اختیار دیتے ہیں کہ خواہ وہ دنیا میں رہنا پسند کرے یا اللہ تعالیٰ کے یہاں جانا، یہ تمہید لکھ کر اس میں تھا کہ میرے اعتقاد میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متبعین خاص کو بھی اس اختیار خاص سے حسب استعداد حصہ ملتا ہوگا، اس لئے عرض ہے کہ ہم ناقصوں کی تربیت کے لئے حضرت والا چند روز اور اس دنیا میں قیام منظور فرمائیں"۔ خط کے جواب میں لکھوا دیا "تم اپنے دماغ کا کسی حاذق طبیب سے علاج کراؤ"۔ پھر حاضرین سے خطاب کر کے فرمایا "اول تو یہ ثابت نہیں کہ جو انبیاء (علیہم السلام) کو ملتا ہے، اس میں اولیاء ومشائخ کو بھی حصہ ضروری ملتا ہے"۔ اور اس کے بعد فرمایا "اور اگر ایسا بھی ہو تو انبیاء نے کیا کیا؟ (یعنی اللہ تعالیٰ کے قرب ہی کو حیاتِ دنیا پر ترجیح دی)۔

ایک دفعہ بعد ظہر خط لکھوا کر فارغ ہو چکے تھے کہ اونگھ آگئی، ہوشیار ہوئے تو فرمایا کہ ایسا معلوم ہوا کہ اس تخت پر ایک لفافہ رکھا ہے جس پر عبدالعزیز لکھا ہے، خواجہ صاحب نے عرض کی ابھی حضرت نے خطوط لکھوائے ہیں وہی خیال قائم رہا، ارشاد ہوا، ہاں یہ صحیح ہے، مگر عبدالعزیز نام کیوں ہے، بات ختم ہو گئی، مجلس کے برخاست

کے بعد خواجہ صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کی عمر کیا تھی ؟ میں نے کہا اسّی بیاسی برس یاد آتا ہے (اب دارالمصنفین آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ کی عمر شریف اکاسی برس کے قریب یعنی اسّی برس کچھ مہینے ہوئی ہے، بہرحال اس سے خواجہ صاحب کی نکتہ شناس نظر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تشابہ حال پر پہنچ گئی ۔

ہرچند یہ تاکید تھی کہ شدت علالت کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے، احباب اشارات وتلمیحات اور اطلاعات میں اپنے متعلقین اور دوستوں کو اطلاع دیتے تھے، غرض یہ تھی کہ زائرین ہجوم نہ کریں، اس پر بھی دور دور سے معتقدین آجاتے تھے، ایک صاحب نے پشاور سے آنے کی اطلاع کرائی، دوسرے نے گورکھپور سے، کسی نے کسی اور دور مقام سے، مگر ہر ایک سے یہی ارشاد ہوا کہ اجازت نامہ کہاں ہے، جب وہ معذوری ظاہر کرتے اور اعترافِ قصور کرتے تو فرماتے تمہاری غلطی کا خمیازہ میں کیوں اٹھاؤں، پھر حاضرین کی طرف خطاب کرکے فرمایا ان کو میں محروم کرکے بھی محروم نہیں کرتا ہوں، ایک سبق دے رہا ہوں، پھر اسی معنی کا خواجہ صاحب کا ایک مصرعہ پڑھا، پھر ارشاد فرمایا کہ ان کے ناکام واپس جانے کا یہ اثر ہوگا کہ اس کو سُن کر دوسرے لوگ آنے سے رک جائیں گے اور اس سے ان کو فائدہ پہنچے گا، غرض یہ تھی کہ لوگ اس بے کار کی زحمت اور تکلیف سے خود بھی بچیں اور حضرت کو بھی ہجوم سے بچائیں ۔

ایک روز بعد مغرب یاد فرمایا اور مشورہ چاہا کہ اشتہا مطلق نہیں اور ضعف بڑھ رہا ہے، گو میں اس کے نتیجہ پر راضی ہوں، مگر بہرحال اگر اس کی تدبیر کوئی ضروری ہو تو کرنا چاہیے۔" اس اثناء میں خیال ظاہر فرمایا کہ "لکھنؤ میں ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب (ناظم ندوہ) کو (جو مزاج شناس تھے) لکھا جائے کہ صرف اشتہا پیدا ہونے کے لیے کوئی نسخہ تجویز کریں۔" خاکسار نے عرض کی کہ حضرت چار روز خط کے جانے میں اور چار روز آنے میں

لگیں گے، اتنی دیر بہت ہے، پھر رائے ہوئی کہ سہارنپور میں کوئی اچھا ڈاکٹر ہو تو بُلایا جائے، مگر دوسرے ہی دن مولوی محمد حسن صاحب اور دوسرے احباب لکھنؤ کا خط آیا کہ حکیم عبدالمجید صاحب لکھنوی جن کے علاج سے پہلے بھی فائدہ ہو چکا تھا، اگر اجازت ہو تو ان کو لے کر حاضر ہوں، چنانچہ اجازت کا خط لکھا گیا، طالبین کے خطوط بدستور آ رہے تھے، لوگ حسب دستور ہدایا منی آرڈر سے بھیج رہے تھے، مگر شدتِ احتیاط بدستور قائم تھی اور وہ واپس ہو رہے تھے، مگر اخلاص و محبت کے سرمایہ کو بہت خوشی سے قبول فرما لیتے تھے، ایک قریب کے نواب صاحب کی ایک رقم آئی تو قبول فرما کر ارشاد ہوا کہ ان لوگوں کا ممنون ہوں کہ وہ دے کر اُلٹے خود ممنون ہوتے ہیں کہ اس نے (اپنی ذات کی طرف اشارہ) قبول کیا، ایک غریب نے کچھ پیش کیا تو اللہ اکبر اس کو آنکھوں سے لگایا۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

حضرت کو ضبط، صبر اور استقامت سے اپنی تکالیف ظاہر نہیں فرماتے تھے اور نہ آئندہ کے خطرہ کو زبان پر لاتے تھے کہ دوسروں کو بے صبری نہ ہو، مگر بات بات سے سفر کی آمادگی ظاہر ہوتی تھی، گو ان کی زندگی اور طرزِ زندگی جس صفائی، پاکیزگی اور باقاعدگی کی عادی تھی، اس کا اثر یہ تھا کہ وقت اخیر کے لئے کوئی کام اٹھا نہیں رکھا کہ سالکِ کامل ہر لمحہ کو لمحۂ اخیر سمجھتا ہے اور اسی کی تیاری رکھتا ہے، یہی حال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، کوئی چیز کرنی باقی نہ تھی، تمام انتظامات، حساب و کتاب اور وصایا سے پوری پوری فراغت تھی، عادت شریف تھی کہ آج کا کام کل پر اٹھا کر نہیں رکھا، گویا ہر وقت آمادۂ سفر تھے۔

خاکسار کو بھوپال کی مجلس کی تاریخ ۹ کو تار سے معلوم ہو چکی تھی، ۱۰ کو رفیقِ سفر مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا بھی مکرمت نامہ آگیا، ۱۱ کی صبح کی مجلس کے بعد

رخصت کی درخواست پیش کی، بااین ہمہ ضعف وقوت لیٹے ہی لیٹے دونوں ہاتھ رخصت کے لئے بڑھائے، حقیر نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر دست مبارک کو بوسہ دیا اور آنکھوں کو ملا، آہ! کس بلا کا رخصتانہ تھا، فرمایا، "جاؤ خدا کے سپرد کیا" یہ لفظ کانوں نے پہلے نہیں سُنے تھے، آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور دیر تک چہرۂ مبارک پر جمی رہیں، کہ یہ جمال جہاں آرا شاید پھر دیکھنے کو نہ ملے، سو ایسا ہی ہوا۔

بعد کے اخیر حالات: خاکسار کے جانے کے دو ایک روز کے بعد حکیم عبدالمجید صاحب تشریف لے آئے اور علاج اپنے ہاتھ میں لیا، پہلے روز عرق دانۂ انار دیا، دوسرے روز ایک بٹیر کی یخنی دلوائی، تیسرے روز دو بٹیروں کی، مگر حکیموں کی ہر میسحائیِ تدبیر محکمۂ تقدیر سے رد ہوتی رہی، حکیم صاحب کا ایک ہفتہ علاج رہا، مگر حالت میں تغیر نہیں ہوا، میں نے بھوپال سے مولانا جمیل احمد صاحب کو طلب خیریت کا خط لکھا، جس کے جواب میں دوشنبہ کے روز یعنی جس کی آنے والی شب میں وفات ہوئی، یہ تحریر فرمایا:

"حکیم عبدالمجید صاحب آئے تھے، ہفتہ پورا کر کے کل واپس جارہے ہیں، حکیم سمیع اللہ (حضرت کے خلیفہ حقداد خاں صاحب لکھنوی کے صاحبزادہ) رہیں گے، علاج ان ہی دونوں کا ہے، افاقہ کی صورت نہیں، دست بہت ہیں، ضعف بیحد ہے، سانس میں تکلیف ہے، بائیں پاؤں میں کل سے سخت درد ہے، ہم سب پریشان ہیں"

(جمیل احمد، دوشنبہ)

لکھنؤ میں ثقات سے جو حاضر تھے معلوم ہوا کہ دوشنبہ کے روز دست زیادہ آئے، ظہر کے بعد ضعف زیادہ محسوس ہوا، عصر کے بعد مولانا شبیر علی صاحب کو (جو حضرت کے بھتیجے اور تمام امور خانقاہ و مدرسہ کے مہتمم و متولی تھے) یاد فرمایا،

اطلاع دی گئی کہ وہ سہارنپور دوا لینے گئے ہیں، محلی خورد سے فرمایا کہ امانتوں کا صندوقچہ اٹھالو، (امانتیں وہ رقمیں تھیں جن کو اہلِ خیر حضرت کو وکیل بنا کر کارِ خیر کے لئے بھیجتے تھے) مختلف تھیلیاں مدوار ہوتی تھیں، ایک تھیلی میں بی بی صاحبہ نے عرض کیا کہ پانچ روپے ہیں، فرمایا، چھ ہوں گے، چنانچہ ہاتھ ڈالا تو ایک روپیہ کا نوٹ اور نکلا، ارشاد فرمایا کہ یہ کل رقمیں ان کے مالکوں کو واپس کر دی جائیں، یہ اس مسئلہ شرعی پر عمل تھا کہ وکیل یا مؤکل کی موت کے بعد وکالت ختم ہو جاتی ہے اور ملک مالک کے تصرف میں واپس جانی چاہیے۔ مولانا ظفر احمد صاحب کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک کاغذ پر یہ بشارت نامہ لکھ کر وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعَالَمِيْنَ (خاکسار کو بعد کو مولانا ظفر احمد صاحب کے والا نامہ سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ وفات سے دو دن پہلے کا ہے)۔

مغرب کے بعد حالت اور زیادہ نازک ہوئی، سانس کی تنگی محسوس ہوتی تھی، مولانا ظفر احمد صاحب نے ڈھاکہ واپس جا کر لکھا۔

"آپ تھانہ بھون سے بھوپال گئے اور یہاں سخت بھونچال آگیا کہ حضرت حکیم الامۃ قدس اللہ سرہٗ نے دار البقا کی طرف ارتحال فرمایا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

کاوت لہا شمّ الجبال تزول

یہ ناچیز اخیر وقت تک حاضرِ خدمت رہا، دل پر پتھر رکھ کر بیٹھا رہا قلب اطہر کی طرف متوجہ رہا، تشنگی رفع کرنے کے لئے آبِ زمزم دیتا رہا، یہاں تک کہ آخری سانس میرے سامنے ختم ہوا، یٰسین اور کلمہ کی تلقین کرتا رہا، غسل بھی دیا، نماز بھی پڑھائی"

رات کے دس بجے تھے کہ عشاء کی نماز کے لئے خدام قریب کی حوض کی مسجد میں گئے، کہ اسی اثناء میں وہ دم آگیا جس دم کے لئے ہر دم تیاری رہتی تھی، اور

ودیعۂ حیات کی آخری سانس اس دنیا میں لے کر واصل بحق ہوئے۔ اللّٰھم انزل علیہ شآبیب رحمتك وارفع درجتہ وارزقنا من برکاتہ۔

اس وقت خدام خاص کی کیفیت خیال کے قابل ہے، جو ایک طرف اپنے محبوب کے فراق میں بیقرار تھے اور دوسری طرف مقام صبر و رضا کی تعلیم سے بہرہ ور تھے اور حق تھا کہ حضرت سرور انبیاء سید الرسل علیہ الصلوۃ والسلام کی اتباع میں وہ کہیں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے محبوب فرزند ابراہیم کی وفات کے وقت ارشاد فرمایا تھا کہ "اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے غمگین ہیں لیکن زبان سے ہم وہ ہی کہیں گے جس میں ہمارے پروردگار کی رضامندی ہو" تاکہ محبت اور تسلیم و رضا دونوں کا حق ادا ہو۔

تجہیز و تکفین کے متعلق یہی فیصلہ ہوا کہ صبح کو ہو، صبح کے وقت خبر کے لئے دو آدمی سہارنپور بھیجے گئے، ایک مدرسہ مظاہر العلوم میں جس سے حضرت کو بہت روحانی تعلق تھا اور دوسرا سہارنپور کے احباب کے پاس، اس صبح کی جانے والی اور آنے والی گاڑیوں میں آدھ ہی گھنٹہ کا فصل ہوتا ہے اس لئے جو لوگ سننے کے ساتھ جس حال میں تھے اسی حال میں چل پڑے، وہ تو پہلی گاڑی سے روانہ ہو سکے، مگر اس کے بعد بھی سیکڑوں آدمی اسٹیشن پر پہنچ گئے، چنانچہ دوسری اسپیشل ٹرین چھوڑی گئی اور قریب ڈیڑھ ہزار آدمی کے جنازہ کے وقت تک پہنچ سکے۔

حضرت نے ہر چیز کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا، یعنی ایک زمین لے کر اس کو تکیہ یا قبرستان خاص بنا کر وقف کر دیا تھا، ایک مختصر سے احاطہ کے اندر ایک زمین گھیر دی گئی تھی، جس میں کچھ درخت بھی لگا دیئے گئے تھے، چھوٹی سی مسجد اور ایک مختصر سا سائبان بھی اس میں ہے، اسی میں دوسرے اعزہ اور خدام بھی آسودہ ہیں، اسی کے بیچ میں اس مخدوم کی استراحت ابدی کے لئے زمین چنی گئی۔

جنازہ کی نماز کے لئے مولانا شبیر علی صاحب نے مولانا ظفر احمد صاحب کو اشارہ کیا، مجھے معلوم ہوا کہ پہلے تو مولانا ظفر احمد صاحب نے تواضع کرنا چاہا مگر انہیں اپنا خواب یاد آیا تو آگے بڑھے اور نماز جنازہ ادا کی، میں نے سنا کہ مولانا ظفر احمد صاحب ڈھاکہ میں تھے اور حضرت کی شدتِ علالت کی خبریں جارہی تھیں اور گھر سے آنے کے لئے شدید تقاضا بھی ہو رہا تھا تو انہوں نے خواب دیکھا کہ وہ تھانہ بھون پہنچے اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ ایک نماز پڑھانے والا آگیا۔

یہ واقعات تھانہ بھون میں ۱۹ر اور ۲۰ر جولائی کو پیش آئے، مگر باہر والوں کو اطلاع دو دن بعد ملی، دہلی میں ۲۱ر کو لکھنؤ میں ۲۲ر کو، مذہبی حلقوں کو اطلاع دو دن بعد ملی اور عربی مدرسوں میں سناٹا چھا گیا۔

خاکسار اب تک بھوپال میں تھا، عنایت الٰہی دیکھئے کہ عین شب وصال کو خواب دیکھا کہ مولانا شبیر علی صاحب مجھ سے فرما رہے ہیں کہ حضرت مولانا کو پوری صحت ہوگئی صبح اٹھ کر میں نے حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ سے یہ خواب بیان کیا، دونوں چپ رہے، مفتی صاحب ۲۱ر جولائی کو اور خاکسار ۲۳ر جولائی کو بھوپال سے روانہ ہوئے، میں ۲۳ر کی دوپہر کو لکھنؤ پہنچا اور ندوہ آیا، حادثہ سے بالکل بے خبر تھا۔ مدرسہ پہنچنے کے ساتھ میرے بچے سلمان سلمہٗ نے سب سے پہلے خبر دی اور اتفاق دیکھئے کہ بھوپال سے خط تو میں نے خیر خیریت کے لئے مولانا جمیل احمد کو لکھا تھا، چنانچہ انہوں نے دوشنبہ کے روز شدتِ علالت اور مایوسی کی اطلاع لکھی اور اس کی دوسری طرف بلا توقع مولانا شبیر علی صاحب کے قلم کی عبارت یہ تھی۔

حضرت مخدوم معظم دام ظلکم العالی السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

بعد تحریر خط ہذا ۱۹، ۲۰ر جولائی کی درمیانی شب میں حضرت والا کا وصال

ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون، بجز اطلاع کے اور کیا عرض کرسکتا ہوں۔
کیونکہ الفاظ اظہار کے لئے نہیں ملتے۔

مصیبت زدہ شبیر علی

۲۴ کو سہارنپور اور دہلی سے مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور اور مولانا الیاس صاحب کاندھلوی لکھنؤ دار لوم میں آئے تو مزید اطلاعات اور تفصیلات معلوم ہوئیں، ۲۶ر جولائی کا لکھا ہوا مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا غم نامہ ملا۔

مکرم محترم، دامت معالیہم،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید ہے کہ اب آپ بھوپال سے واپس آگئے ہوں گے، میں نے دہلی پہنچ کر حضرت مولانا تھانوی کے وصال کی خبر سنی، آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا، فوراً یاد آیا کہ جس شب کو مولانا نے دنیا کو چھوڑا یعنی دوشنبہ سہ شنبہ کی درمیانی شب، اسی رات کی صبح کو جناب نے بھوپال ـــــ میں مجھ سے ذکر کیا تھا کہ آپ نے مولوی شبیر علی صاحب کو خواب میں دیکھا کہ وہ کہہ رہے ہیں حضرت بالکل صحت یاب ہوگئے، آپ کا خواب سچا ہوا، مولانا نے دنیا وی تکالیف سے بالکل صحت پائی، اور رفیق اعلیٰ سے جاملے، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً واسکنہ الفردوس الاعلیٰ، ہندوستان ایک حکیم الامۃ مجدد الملۃ سے محروم ہوگیا۔"

حضرت کے ایک خلیفہ نے جن کو صدق رؤیا کی نعمت ملی ہے، وصال کی دوسری یا تیسری شب کو خواب میں دیکھا کہ حضرت فرما رہے ہیں کہ میرے فیوض اب بھی جاری رہیں گے، اللہ تعالیٰ نے مجھے مقام شہداء (فرمایا یا مقام شہود) عطا فرمایا، حضرت نے اسہال کے مرض سے وفات فرمائی اور حدیث نبوی ہے والمبطون شہید (پیٹ کی بیماری

سے مرنے والا شہید ہے)

مجھ سے مولوی محمد حسن صاحب کاکوروی (علیگ) مالک انوار المطابع لکھنؤ نے جو حضرت کے خدام قدیم میں سے ہیں بیان کیا اور انہوں نے خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری بی، اے (علیگ) سے سُنا ان کو چھوٹی پیرانی صاحبہ سے معلوم ہوا (خواجہ صاحب کی اہلیہ بھی ساتھ تھیں) کہ جس وقت رُوحِ مبارک پرواز کر رہی تھی حضرت کے داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کے بیچ میں ایک نگینہ سا چمکتا معلوم ہوتا تھا، جس کو انہوں نے دیکھا اور دوسری عورتوں نے بھی دیکھا" محرم خاص حضرت خواجہ صاحب نے فرمایا کہ چونکہ جو نور ہدایت حضرت کے ذریعہ پھیلا وہ زیادہ تر ان کی انگلیوں یعنی تصنیفات کے ذریعہ سے پھیلا، اس لئے وہ نور انگلیوں ہی کے درمیان ممثل ہو کر نظر آیا، واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت کے بہت سے محبین کی طرح ایک محب خاص مولانا مسعود علی صاحب ندوی کو اس عقیدت وعظمت کی بنا پر جو اُن کے دل میں تھی حضرت کی مغفرت کے لئے دعا مانگنے میں دلی کشمکش محسوس ہوتی تھی، انہوں نے خواب دیکھا کہ وہ خانقاہ تھانہ بھون میں حاضر ہیں کہ دفعۃً حضرت تشریف لے آئے اور ان سے فرمایا کہ میری صحت کے لئے دعا مانگا کرو۔

حل ایں نکتہ ہم از روئے نگار آخر شد

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ایک کامل زندگی کو جو کمال زہد و ورع، کمال اتباع شرع، کمال اتباعِ سنت کے ساتھ تھی، اس زمانہ میں نمونہ کے لئے پیدا کیا، وہ آئی اور ساٹھ برس کے مجاہد کا نمونہ دکھا کر واپس گئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وادخلہ اعلیٰ علیین وصلی اللہ تعالیٰ علی النبی الامین وآلہ واصحابہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

سید محفوظ علی صاحب بدایونی مرحوم

اسی مہینہ میں ۲۰ر اکتوبر کو ایک اور پُرانے ادیب سید محفوظ علی صاحب بدایونی مرحوم نے فالج کے مرض میں انتقال کیا، مرحوم بدایوں کے ایک قدیم اور شریف خانوادہ کی یادگار علیگڑھ کالج کے ممتاز تعلیمیافتہ اپنے دور کے نامور ادیب اور علیگڑھ منتھلی، اولڈ بوائے، دکن ریویو، نقیب اور ہمدرد کے دوراوّل کے ممتاز لکھنے والوں میں تھے اور اس زمانہ میں ان کے مضامین بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے، وہ سنجیدہ اور ظریفانہ دونوں طرز کے شگفتہ نگار ادیب تھے، غالباً متفرق مضامین کے علاوہ کوئی مستقل قلمی یادگار نہیں چھوڑی، ادھر برسوں سے علم وادب کا کوچہ چھوڑ کر خلوت گزینی کی زندگی اختیار کرلی تھی، وہ ابتداء سے بڑے دیندار او ظاہری وضع وقطع میں بھی پابند شریعت تھے، ناواقف شخص ان کو دیکھ کر انگریزی تعلیمیافتہ ہونے کا گمان بھی نہیں کرسکتا تھا اور یہ رنگ برابر گہرا ہوتا گیا، آخر میں بڑا ذوق وشوق اور بڑی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اور اسی پر ان کا خاتمہ ہوا، اللہ تعالیٰ اس طالب آخرت کو اپنی رحمت ومغفرت سے سرفراز فرمائے، ہماری پرانی بزم ادب کی شمعیں ایک ایک کرکے بجھتی جاتی ہیں، جو باقی ہیں وہ بھی شمعِ سحر ہیں اور جب تک ہیں غنیمت ہیں، ان کے بعد یہ روشنی بھی نظر نہ آئے گی۔

مرحوم مولانا شبلی مرحوم کے زمانہ میں علیگڑھ میں پڑھتے تھے، اس نسبت سے ان کو میرے ساتھ بھی یک گونہ محبت سی تھی اور خصوصیت کی ملاقات مرحوم دوست مولانا عبدالماجد صاحب بدایونی کی وساطت سے ہوئی اور ایسی ہوئی جو اُن کے اخیر لمحہ تک قائم رہی، وہ اپنے مذہبی انقلاب کا ایک عجیب ظریفانہ واقعہ بیان فرماتے تھے۔

ایک دفعہ گرمیوں میں وہ علی گڑھ سے کہیں جارہے تھے، پیاس شدت کی تھی، گاڑی میں

سوار ہوئے تو دیکھا ایک بزرگ نہایت ثقہ صورت اس میں بیٹھے تھے، سامنے نہایت نازک اور سبک صراحی جس پر سُرخ یک رنگہ (ڈول) کا کپڑا منڈھا تھا اور آبخورہ بھی تھا، یہ داڑھی صاف علی گڑھ کے نوجوان تھے، پیاس کی طلب نے یہ صراحی دیکھ کر بیتاب کر دیا تھا، صاحب صراحی سے پانی پینے کی اجازت چاہی، انہوں نے کہا کہ پہلے یہ تو معلوم ہو کہ آپ مسلمان بھی ہیں، میر صاحب نے کلمہ پڑھا، انہوں نے کہا کہ کلمہ تو ہندو بھی پڑھ دیتا ہے، یہ ظریفانہ شوخی کے ساتھ بولے تو اپنے اسلام کا ثبوت پیش کروں، وہ بزرگ بھی بڑے بے دھڑک نکلے، یہ ثبوت تو یہودی بھی پیش کر سکتا ہے، اب میر صاحب کا ترکش خالی ہو گیا، ہار مان لی، شرم سے پسینہ آگیا، آخر اُن بزرگ نے پانی دیا اور انہوں نے پیا، اس ساقی کے ایک جام نے ان کے خیالات کی دنیا بدل دی۔

بعض اچھے سرکاری عہدوں پر رہے۔ افریقہ میں برطانی عہدہ دار ہو کر گئے کہتے تھے وہیں کی آب و ہوا نے وقت سے پہلے اُن کو بوڑھا بنا دیا اور سن سپید ہو گئے، ماشاء اللہ بڑی نورانی صورت پائی تھی، سپید لمبی داڑھی، کبھی کبھی سر پر عمامہ باندھتے تھے۔

وہ کہتے تھے کہ اُن کے بال افریقہ کے قیام کے زمانہ میں پک گئے اور جوانی ہی میں بوڑھے ہو گئے وہ افریقہ میں ایک برٹش آفیسر کی حیثیت سے گئے تھے، وہاں سے واپسی پر وہ حیدر آباد رہے، محمد علی مرحوم سے ان کی ملاقات اور تعلقات کی وابستگی علی گڑھ کالج کے زمانہ سے تھی، محمد علی مرحوم نے جب ہمدرد نکالا تو دوسرے لکھنے والوں کے ساتھ ان کو بھی اس اخبار میں زبردستی کھینچا، تجاہل عارفانہ کے نام سے علی گڑھ کے معاملات اور حاجی نواب اسحاق خان مرحوم کے خلاف جو مزاحیہ مضمون نکلا کرتا تھا، وہ مرحوم ہی کی جدت قلم کا نتیجہ تھا۔

اخیر میں اپنے گھر میں اپنی زمینداری کے کاموں میں مصروف ہو کر رہ گئے تھے، اور دن رات اللہ اللہ کرنا اُن کا کام رہ گیا تھا۔

دسمبر ۱۹۴۳ء

مولانا عنایت اللہ صاحب دہلوی مرحوم

گزشتہ اکتوبر کو علمی جماعت کے پرانے ممتاز رکن مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی مرحوم سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن نے انتقال کیا، مرحوم علی گڑھ کالج کے دورِ اوّل کے ممتاز تعلیمیافتہ تھے، علم وادب کا مذاق اپنے نامور باپ مولوی ذکاء اللہ صاحب دھلوی سے ورثہ میں پایا تھا، طالب علمی ہی کے زمانہ سے اُن کے یہ جوہر نمایاں تھے سرسید کے بہت سے علمی اور ترجمہ وغیرہ کے کام وہی انجام دیتے تھے، اس دَور کے اُن کے بعض تراجم اب تک یادگار ہیں، ان میں سب سے اہم پروفیسر آرنلڈ کی مشہور کتاب "پریچنگ آف اسلام" کا ترجمہ "دعوتِ اسلام" ہے، تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۸۹۳ء میں وہ کالج لائبریری کے لائبریرین مقرر ہوئے، کچھ دنوں تک ریاضی کی پروفیسری کی۔ اعزازی خدمت اور تہذیب الاخلاق کی ادارت کے فرائض انجام دیئے، ۱۹۰۰ء میں گورنمنٹ کے سلسلۂ ملازمت میں داخل ہوئے اور جونپور کی عدالت جج میں منصرم مقرر ہوئے، ۱۹۱۵ء میں ریاست گوالیار نے گورنمنٹ سے ان کی خدمت مستعار لے کر اپنے شعبۂ فنانس کا انڈر سکریٹری بنایا۔ دورانِ ملازمت میں ترجمہ کا شغلہ برابر جاری رہا اور اس میں ان کو اتنی شہرت حاصل ہوگئی کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے سلسلہ میں حیدرآباد میں جب دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا، تو گورنمنٹ نظام نے ان کو حیدرآباد میں منتقل کرا کے ۱۹۲۰ء میں ان کو دارالترجمہ کا ناظم مقرر کیا، ۱۴ سال تک بڑی قابلیت کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیتے رہے، ۱۹۳۴ء میں اس سے سبکدوشی حاصل کرکے دہرہ دون

کی پرسکون فضا میں قیام اختیار کیا اور یہیں ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو وفات پائی۔

مرحوم کا خاص کمال ترجمہ کی مہارت تھی، اس میں ان کو ایسا ملکہ حاصل تھا کہ غیر زبانوں کی کتابوں کو اس طرح اردو کے قالب میں ڈھالتے تھے کہ تصنیف کا گمان ہوتا تھا، انگریزی کتاب سامنے رکھ کر اس کا ترجمہ اس روانی کے ساتھ پڑھتے جاتے تھے کہ معلوم ہوتا اُردو کی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ وہ ضخیم سے ضخیم کتابوں کا ترجمہ چند مہینوں میں کر ڈالتے تھے، اُن کے چھوٹے بڑے تراجم کی تعداد جن میں نظمیں، قصے، کہانیاں، ناول، افسانے اور ڈرامے بھی ہیں اور سنجیدہ علمی اور تاریخی کتابیں بھی پچاس ساٹھ سے اوپر ہیں، ان میں بیشتر کتابیں شائع ہو چکی ہیں، پھر بھی اس کا معتدبہ حصہ ابھی قلمی مسودہ کی صورت میں ہے، مستقل تصانیف بہت کم ہیں، لیکن ان کے بہت سے تراجم کی افادی حیثیت بھی مستقل تصانیف سے کم نہیں ہے، ان کی سب سے اہم علمی خدمت اندلس کا تاریخی جغرافیہ ہے جو اُن کی سالہا سال کی محنت کا نتیجہ ہے جس محنت تحقیق وتلاش وجستجو سے یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کا اندازہ صرف اہل علم ہی کر سکتے ہیں، درحقیقت یہ جغرافیہ نہیں ہے بلکہ ایک حد تک اندلس کے اسلامی فتوحات اور اسکی ابتدائی دور کی تاریخ بھی ہے، وہ طبعاً بڑے شریف، متواضع اور خاکسار تھے، ۷۰ سال کی عمر پائی۔ شادی نہیں کی اور ساری عمر عروس علم کی خدمت میں گزار دی، اللہ تعالیٰ اس شیفتہ علم کو اپنی عنایت بے پایاں سے سرفراز فرمائے۔

دسمبر ۱۹۴۳ء

آہ! شمس العلماء مولانا محمد حفیظ اللہ

سابق مدرس اعلیٰ دارالعلوم ندوہ

حضرت مولانا ابوالحسنات عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی کی آخری یادگار مٹ گئی یعنی اُن کے آخری شاگرد یعنی مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب، جو ان کی مجلس درس کی اکیلی یادگار رہ گئے تھے، ۱۳۶۲ھ کے خاتمۂ ماہ میں وفات پاگئے۔

مرحوم ۱۸۵۶ء کے آخر میں ضلع اعظم گڑھ کے چھوٹے سے گاؤں بندی میں پیدا ہوئے تھے، غدر ۱۸۵۷ء میں وہ ۶ ماہ کے تھے اور اسی قدر وہ مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے بڑے تھے، ابتدائی کتابیں گھر پر پڑھ کر وہ اپنے عزیز مولانا سلامت اللہ صاحب جیراجپوری (والد حافظ اسلم صاحب جیراجپوری) کے ہمراہ بنارس تعلیم کے لئے گئے، وہاں سے واپس آکر مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں پڑھنے کے لئے گئے، وہاں فارسی کی اونچی کتابیں پڑھیں، اس زمانہ میں غازی پور میں حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلی کے شاگرد رشید مولانا غلام جیلانی صاحب تھے، اُن سے باصرار عربی کتابیں شروع کیں اور چند سال میں ان سے متوسطات تک پڑھ کر انہی کے مشورہ سے فرنگی محل لکھنؤ میں مولانا ابوالحسنات عبدالحیٔ صاحب فرنگی محل کی مجلس درس میں حاضر ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا، جب داروغہ حیدر بخش کی مسجد جو چوک میں عربی اور طب پڑھنے والوں کا گویا دارالاقامۃ تھا، نئی بن کر تیار ہوئی تھی، چنانچہ حضرت مولانا عبدالحیٔ صاحب کی سفارش سے ان کو اس کے حجرہ میں رہنے کی جگہ ملی، اور یہاں کئی سال رہ کر معقولات اور دینیات کی تعلیم حاصل کی، فراغت کے بعد

جو غالباً ۱۸۸۰ء میں ہوئی ہوگی وہ کاکوری ضلع لکھنؤ کے ایک مقامی مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے، یہی سلسلہ ہے جس سے وہ جناب منشی احتشام علی مرحوم رئیس کاکوری سے ملے، کہ پھر اُن کے دل الگ نہ ہوئے اگلے زمانہ میں دوستوں کی وضعداریاں، آج عجیب معلوم ہوتی ہیں، چند ہی سال کے بعد ریاست رامپور کے مشہور مدرسۂ عالیہ میں مدرس مقرر ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ رامپور اہل علم کا مرکز تھا، مولانا عبدالحق خیرآبادی کا وہاں طوطی بول رہا تھا، اس عہد میں ان کا وہاں جانا اور اہل علم کی نگاہوں میں وقار پیدا کرنا معمولی کارنامہ نہیں، دونوں میں نواب صاحب کے سامنے ایک دفعہ کسی فلسفیانہ مسئلہ پر مناظرہ بھی ہوا، مولانا مرحوم کو زیادہ تر شوق معقولات ہی کا تھا، قدیم فلسفہ ومنطق میں بڑی دسترس حاصل کی تھی، ساتھ ہی ریاضیات میں کمال پیدا کیا تھا، چنانچہ رامپور کے زمانۂ قیام میں تصریح پر ۱۳۱۲ھ میں حاشیہ لکھا، جو عام طور سے شائع ہے۔

رامپور کے زمانۂ قیام میں جنرل عظیم الدین مرحوم کا عہد دیکھا تھا، اُن کے شجاعانہ کارنامے وہ خوب بیان کرتے تھے، یہ تو رزم تھی، بزم میں جناب منشی امیر احمد صاحب مینائی مرحوم کی صحبت اٹھائی تھی، ان کے شاعرانہ کمالات اور بعض مشاعروں کے حالات بڑی دلچسپی سے سُناتے تھے، آداب مجلس سے خوب واقف تھے اور بڑی مزہ دار باتیں کرتے تھے، لطائف وظرافت کی بھی کمی نہ تھی، سیر وشکار کا بھی شوق تھا، بڑے قادر انداز تھے۔

رامپور سے وہ لکھنؤ آئے اور دارالعلوم ندوہ کے افتتاح کے وقت ۱۳۱۷ھ میں وہ اس کے مہتمم اور مدرس اول مقرر ہوئے، جس پر وہ ۱۹۰۸ء تک فائز رہے، ہیچمدان نے اسی زمانہ میں اُن سے مدرسہ دارالعلوم میں معقولات ومنقولات کی کتابیں پڑھیں۔

مولانا شبلی مرحوم کے وہ معاصر تھے، اس لئے جب صحبت ہوتی تو دونوں

میں خوب نوک جھونک ہوتی، گفتگو کا موضوع کوئی فلسفہ کا مسئلہ یا عقل ونقل کی تطبیق کی معرکہ آرائی ہوتی۔

دارالعلوم سے وہ ۱۹۰۸ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں گئے، ۱۹۲۱ء میں وہاں سے پنشن یاب ہوئے، اسی سال وہ حج کو گئے اور وہاں سے واپس آکر لوگوں کے اصرار سے دوبارہ ندوہ کی صدر مدرسی قبول کی اور کئی سال تک یہ خدمت انجام دینے کے بعد ۱۹۳۰ء میں ندوہ سے الگ ہو کر وطن واپس آگئے تھے اور یہیں ۷ ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ کو وفات پائی۔

مولانا عبدالحئی مرحوم کی شاگردی کے باوجود مرحوم آخر میں عامل بالحدیث ہوگئے تھے، عدم تقلید کا میلان پہلے سے رکھتے تھے، جو شاید مولوی سلامت اللہ صاحب کی ابتدائی صحبت کا اثر رہا ہو، ان کی تصانیف میں تصریح الافلاک کا حاشیہ علمی یادگار ہے۔ ۱۸۵۶ء کے آخر میں پیدا ہوئے تھے، اس حساب سے وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً ستاسی اٹھاسی سال کی تھی، لیکن دو چار سال پہلے ان کی صحت وتوانائی قابل رشک تھی اور ان کے جسمانی قویٰ نہایت اچھے تھے، ادھر چند برسوں سے البتہ ضعف واضمحلال کا اثر نمایاں اور آخری زمانہ میں ذہول ونسیان کا غلبہ زیادہ ہوگیا تھا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت ومغفرت سے سرفراز فرمائے۔

محرم ۱۳۶۳ھ
جنوری ۱۹۴۴ء

وفاتِ عیسیٰ الہ آبادی

حضرت مولانا سید محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادی نے جو حضرت مولانا تھانوی ؒ کے اولین خلفا میں تھے، ۲۵ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ مطابق ۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء کی سہپہر کو جونپور میں جہاں وہ بغرض علاج آئے تھے ۶۲ برس کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا، اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن خیال تھا کہ مرشد رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اُن کی ذات مرجعِ انام بنے گی، مگر اللہ تعالیٰ اپنی مصلحتوں کو آپ جانتا ہے، ان کا وطن محی الدین پور ضلع الہ آباد تھا، نسبتاً سادات کرام میں تھے اور گھر کے خوش حال زمیندار تھے، غالباً ۱۳۰۱ھ کی پیدائش ہوگی، بچپن ہی سے وہ زاہد و متقی تھے، باپ کے حکم سے انگریزی شروع کی اور بی اے تک پڑھ کر چھوڑ دیا اور ایک اسکول میں انگریزی کے ماسٹر اور آخر میں گورنمنٹ کالج الہ آباد میں عربی کے پروفیسر ہوگئے۔

نوجوان ہی تھے کہ الہ آباد و کانپور میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ سننے کا اتفاق ہوا، جو بات سنی، دل میں گھر کرتی چلی گئی اور روز بروز یہ نشہ تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ بیعت و ارادت سے مشرف ہو کر مجاہدہ ریاضت میں مصروف ہوئے، آخر تکمیل طریق کے بعد خلافت و اجازت سے سرفراز ہوئے، اللہ تعالیٰ کی شان بندہ نوازی نظر آتی ہے کہ ایک انڈر گریجویٹ میں جس نے صرف انگریزی ہی کی تعلیم پائی تھی چند روز میں یہ انقلاب پیدا ہوا کہ اُس نے اس عمر میں آکر سرکاری ملازمت کے ساتھ عربی تعلیم پوری کی اور قرآن و حدیث کا علم حاصل کیا اور ساتھ ہی قرآن پاک حفظ کیا اور سیرت و صورت میں یہ رنگ پیدا کیا کہ

کوئی دیکھ کر یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ انگریزی کا ایک لفظ بھی جانتا ہے۔

سلوک وطریقت، مسلک ومشرب، صورت وسیرت، حتٰی کہ نشست وبرخاست اورخط وکتابت اور گفتگو میں اپنے مرشد کامل سے اس درجہ مشابہت حاصل کرلی تھی کہ ان کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا تھا۔

تاکس نگوید بعدازیں من دیگرم تودیگری

وہ نہایت ہی عابد، زاہد متبع سنت اور مرشد کے اصولوں کے سختی سے پابند تھے، اطراف میں حلقۂ ارشاد بھی قائم تھا، اپنے مرشد کی متعدد کتابوں کے خلاصے اور شروح شائع کئے، جن میں سب سے اہم ''انفاسِ عیسیٰ'' ہے جو سلوک اشرفی کی معتبر ترین کتابوں میں ہے، مردوں کے لئے بہشتی زیور کا خلاصہ بہشتی ثمر کے نام سے کیا، جو مکاتب میں رائج ہوئی، تفسیر بیان القرآن کا خلاصہ مترجم قرآن کے حواشی کے طور پر کیا، جو الہ آباد میں زیرِ طبع تھا، حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کمالاتِ امدادیہ کے طرز پر انہوں نے کمالاتِ اشرفیہ لکھی جو فنِ سلوک ومعرفت کے متعلق ان کی استعداد وصلاحیت کی آئینہ دار ہے۔ حدیث میں ازالۃ الوسن بالف من السنن اردو ترجمہ کے ساتھ ان کی مفید تالیف ہے زہد وورع، اخلاق اور سلوک کی ایک ہزار حدیثیں جمع کی ہیں۔

صاحب مقامات مستجاب الدعوات اور واردات صحیحہ سے سرفراز تھے، کالج سے پنشن لینے کے بعد اپنے گاؤں میں مقیم ہو گئے تھے اور متوسلین کو اپنے رشد وہدایت سے سیراب کرتے تھے، اسی عالم دو برس ہوئے کہ ایک شب تہجد کے لئے اٹھے تو فالج کا حملہ ہوا، اس کے بعد امسال دوسرا حملہ ہوا جس کے بعد علاج کے لئے جونپور آئے، جہاں ۱۱ مارچ کو تیسرا حملہ ہوا اور زبان بند ہوگئی۔ وفات کے آخری لمحہ میں آخری بار زبان کھلی اور تین دفعہ بلند آواز سے اللہ اللہ

کہا اور جان، جان آفریں کے سپرد کر دی،

عجیب بات یہ ہے کہ جونپور میں وہ بالکل مسافرانہ وارد تھے، لیکن حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد خلفاء مجازین اور صحبت یافتہ بغیر کسی ظاہری داعیہ کے عین وقت پر پہنچ گئے۔ انہی میں سے ایک نے یٰسین پڑھی، ایک نے غسل دیا، ایک نے نماز جنازہ پڑھائی اور سب نے پڑھی اور دو نے قبر میں اتارا، جونپور ہی میں محلہ رضوی خان کی ایک اکبری مسجد کے عقب میں ۲ بجے رات کو تدفین عمل میں آئی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

اپریل ۱۹۴۴ء

حضرت مولانا الیاس کاندھلوی

افسوس ہے کہ ۲۱ر رجب ۱۳۶۳ھ کی صبح کو مولانا الیاس صاحب کاندھلوی مقیم بستی نظام الدین دہلی نے چند ماہ کی علالت کے بعد بستی نظام الدین دہلی میں انتقال فرمایا، وہ اس عہد میں ان نفوس قدسیہ کی مثال تھے، جن کے دم قدم سے ہندوستان میں اسلام کا چراغ روشن ہوا، ان کا وجود اس دعوٰی کی کہ ہندوستان میں اسلام بادشاہوں کے تیغ و خنجر کے سایہ میں نہیں بلکہ بے نوا فقیروں کے فیوض و برکات کے زیر سایہ بڑھا اور پھلا پھولا ہے، سب سے تازہ دلیل ہے، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی قبر پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔

پایۂ تخت دہلی کے اردگرد ہزاروں میواتی جن کی تعداد کم و بیش پچاس لاکھ تک پہنچ جاتی ہے سینکڑوں برس کے شاہانہ جاہ وجلال اور رعب و ہیبت کے باوجود ایسے ہی نو مسلم تھے جو اسلام کے بجائے بت پرستی سے زیادہ قریب تھے اور سنہ ۱۹۰۷ء سے لے کر پچھلے آریہ فتنہ تک اُن کے ارتداد کا خطرہ ہمیشہ مسلمانوں کا دامنگیر رہتا تھا۔ حضرت مولانا نے نہایت خاموشی کے ساتھ صرف اپنے مخلصانہ سادہ طریق اور صحیح اصول دعوت کے ذریعہ پچیس برس کی انتھک محنت میں ان کو ان خالص و مخلص مسلمانوں کی صورت میں بدل دیا، جن کے ظاہر و باطن پر خاندانی مسلمانوں کو بھی رشک آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خوش خبری سنائی ہے کہ قیامت تک امت محمدیہ میں سے ایک جماعت حق پر استوار اور قائم اور غالب قوت کے ساتھ دنیا میں موجود رہے گی انشاء اللہ تعالیٰ

اسلام کی تاریخ کا ہر پچھلا دور اس بشارت کی خبر کو دنیا میں سناتا اور اپنے عمل سے اس کی صداقت کو ظاہر کرتا رہے گا۔

لوگ عموماً سلاطین اور بادشاہوں کو دین کا محافظ سمجھتے ہیں اور ان کے فاتحانہ کارناموں سے خوش ہوتے ہیں، لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ ظاہری حکومت کی یہ طاقت اگر کسی روحانی قوت کے شمول سے محروم ہو، تو اس ظاہری حکومت کا جاہ وجلال حق کی قوت کے بجائے باطل کی قوت کے فروغ کا سامان ہوجاتا ہے، تاریخ کا ہر صفحہ اس دعوے کے ثبوت کی تازہ دلیل ہے، لیکن باطن کی قوت ظاہری طاقت کی محتاج نہیں ہوتی، اسلام کا ظہور اسی شکل سے ہوا اور ہندوستان میں اسکی ترقی بھی کچھ اسی شان سے تقدیر الٰہی معلوم ہوتی ہے اور اسی طریقے سے اس کی ظاہری قوت کا فروغ بھی تقدیر الٰہی میں بظاہر مقدر نظر آتا ہے، واللہ اعلم بحقیقۃ الاحوال والمبدء والمآل فی الماضی والاستقبال۔

ہندوستان میں اسلام کی ظاہری طاقت دلی کی مغلیہ حکومت کے خاتمے پر ختم ہوجاتی ہے مگر عین اسی وقت اللہ تعالیٰ نے شاہان دہلی کا ایک اور سلسلہ کھڑا کر دیا، جن کے سپرد اس سرزمین میں اسلام کی حفاظت کا کاروبار کر دیا اور جس کو وہ اس وقت سے آج تک برابر سلسلہ بہ سلسلہ اسی طرح انجام دیتے چلے آرہے ہیں جس طرح ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا چلا جاتا ہے، اس سلسلہ کے مسند نشین بے تاج وکلاہ، فوج ولشکر کے بغیر اور زر وجواہر کے خزانوں سے بے نیاز اپنے دلق مرقع میں اور اپنی شکستہ حصیر وبوریا پر بیٹھ کر دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں

ان شاہان دہلی کا مسکن گو دلی کا ایک ویرانہ تھا، جو اب ایسا ویرانہ ہے کہ جہاں اس سلسلہ کا ایک فرد بھی سکونت پذیر نہیں، تاہم اس کے وجود اور ظہور میں ہندوستان کے متعدد صوبے شریک ہیں، اجدا ور رہتک اور سون پت میں متوطن ہوکر دہلی آئے اور

مادری سلسلہ ملتان سے چلا اور بہار آیا اور یہاں سے جونپور کو منتقل ہوا، پھر اودھ کے ایک قصبہ سدھور سے پیوند ہوا، پھر وقت کے عین تقاضے پر سمٹ کر دہلی پہنچا اور اطراف دلّی کے ان قصبات سے آمیز ہوا، جو آج مظفر نگر، میرٹھ اور سہارنپور کے اضلاع میں واقع ہیں، جس کی صورت یہ ہوئی کہ سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں اُن کے نانہالی مورث کو جو سدھور میں سکونت گزین تھے، بارہہ کے پاس جاگیر میں کچھ گاؤں ملے اور اس تقریب سے وہ خاندان سدھور سے پھُلت (ضلع مظفر نگر) کو منتقل ہو گیا اور اس طرح تقدیر الٰہی کے نقاش نے دلّی اور پھُلت کے پیوند سے دِلّی کے ان شاہانِ فقر کے مرقع کو تیار کیا اور اس تقریب سے ان بزرگوں کے دم قدم ان اطراف کے قصبات سے وابستہ ہو کر اُن کے لئے سعادت کا باعث بنے اور ان بزرگوں کی آمد ورفت سے ان اطراف و دیار میں توفیق الٰہی اور علوم نبوی نے اس دور میں جلوہ گستری کی۔

ممکن ہے کہ یہ میری وہبی خوش عقیدگی ہو، لیکن کئی سال سے میرے دل یہ خیال بار بار آتا رہا کہ ان بزرگوں کے انفاس قدسیہ توجہات قلبیہ اور برکات سماویہ ہی کے اثرات ہیں، جو ان اطراف میں اس زمانۂ اخیر میں اکابر امت، علماء امت اور سالکین حقیقت انبوہ در انبوہ وجود پذیر ہوئے اور جن کی بدولت اس تجدید ملت کے دَورہ کو جس کا آغاز حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا، جس کا اشارہ بار بار انہوں نے کیا ہے، اب تک بقاء اور امتداد کی سعادت حاصل ہو رہی ہے چنانچہ ان حضرات کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک ان اطراف کے قصبات و دیہات سے جس قدر علمائے عاملین اور صلحائے متقین پیدا ہوئے، اس دَور میں اس ملک کے کسی خطہ میں پیدا نہیں ہوئے اور یہ وہ واقعہ ہے جس کی تصدیق مشاہدہ سے صاف نظر آتی ہے۔

پھلت، کاندھلہ، کیرانہ، جھنجانہ، گنگوہ، نانوتہ، تھانہ بھون، انبیٹھہ، رائے پور، منگلور

سہارنپور، دیوبند وغیرہ قصبوں سے اس دَور میں جو مبارک اور مقدس ہستیاں عالم وجود میں آئیں اور ان کے علمی و روحانی آثار و برکات سے پورے ملک ہند کے مسلمانوں نے اس زمانہ میں جو فیض پایا کیا اس سے کوئی انکار کر سکتا ہے۔

کاندھلہ: سہارنپور، شاہدرہ (دہلی) لائٹ ریلوے لائن کے وسط میں دہلی کے رخ پر یہ قصبہ واقع ہے، اس کی پرانی آبادی کا حال تو مجھے معلوم نہیں، لیکن حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے آج تک اس قصبہ کا ایک سلسلۂ فیض مسلسل نظر آرہا ہے، حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ شاہ صاحب ممدوح کے محبوب تلامذہ میں تھے اور شمائل نبویؐ میں شیم الحبیب اُن کا مشہور رسالہ ہے، اسی قصبہ کے دوسرے بزرگ مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی ہیں، جو حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ کے شاگرد تھے اور علم و فضل کے ساتھ زہد و تقویٰ میں یگانہ تھے، اسی خانوادہ کے انتساب اور اتصال سے وہ بزرگ ہستی عالم وجود میں آئی جس کے تذکرہ کی سعادت ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

خاندان ولادت: مولانا ممدوح اسی قصبہ میں اور اسی خاندان میں پیدا ہوئے جس کا سلسلۂ نسب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے، تاریخی نام الیاس اختر تھا، جس سے ۱۳۰۳ھ کی تاریخ پیدائش ظاہر ہے، مولانا کی والدہ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کی نواسی تھیں اور مولانا مظفر حسین صاحب مولانا محمود بخش کے صاحبزادہ اور حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کے بھتیجے تھے، مولانا مظفر حسین صاحب بہت سیدھے سادھے بزرگ تھے، زہد و ورع اور اتباعِ سنت اور سادگی میں بے مثال تھے، گھروں میں اور مسجدوں میں وعظ فرماتے تھے، مستورات کو اُن کے بیان سے بڑا فائدہ ہوتا تھا، اُن کی ایک صاحبزادی بی بی امۃ الرحمان تھیں، جو اپنے باپ کی نمونہ تھیں، نہایت عابدہ و زاہدہ، یہاں تک کہ اکابر تک ان کے پاس حاضر ہونا اور اُن سے دعائیں

لینا برکت کا باعث سمجھتے تھے، انہی بزرگ خاتون کی صاحبزادی بی بی صفیہ مولانا الیاس صاحب کی والدہ تھیں، یہ بھی بہت عبادت گزار اور ذاکرہ و شاغلہ تھیں، قرآن پاک کی حافظہ تھیں اور روزانہ دیگر وظائف کے علاوہ قرآن پاک کی تلاوت ایک ایک منزل کرتی تھیں۔

مولانا کے والد مولانا حافظ اسماعیل صاحب تھے، جو بڑے فرشتہ صفت بزرگ دہلی کے آخری بادشاہ ظفر شاہ کے سمدھیانہ میں بچوں کی تعلیم پر ملازم تھے، ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد وہ بستی نظام الدین میں رہنے لگے، یہاں مرزا الٰہی بخش نے (جن کی بیٹی بہادر شاہ کے ولی عہد مرزا فخرو سے منسوب تھیں) ایک مسجد بنوائی تھی جس کو بنگلہ والی مسجد کہتے ہیں، مولانا اسماعیل صاحب نے اپنی بقیہ عمر اسی مسجد میں بسر کی اور وفات کے بعد اسی مسجد کے گوشہ مشرق و جنوب میں مدفون ہوئے، اس آبادی کے اطراف میں جو مسلمان آباد ہیں، مولانا اسماعیل صاحب کے فیض سے وہ مستفید ہوتے رہے۔

مولانا اسماعیل صاحب نے دو شادیاں کیں، پہلی سے مولوی محمد صاحب اور دوسری سے مولانا محمد یحییٰ صاحب شاگرد خاص حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور مولانا محمد الیاس صاحب ہوئے اور ماشاء اللہ تینوں صاحبزادے عالم و فاضل اور صالح و متقی، مولانا یحییٰ صاحب کے صاحبزادے مولانا زکریا صاحب ہیں، جو بالفعل مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے شیخ الحدیث اور متعدد کتابوں کے مصنف اور موطا امام مالک کے آخری شارح ہیں۔

ایں خانہ تمام آفتاب است

تعلیم: مولانا نے ابتدائی تعلیم اور فارسی وغیرہ وطن کے مکتب میں اور خاندان کے بڑوں سے حاصل کی، ابتدائی عربی تعلیم کے زمانہ میں ان کو درد سر کا ایک خاص قسم کا دورہ ہو جاتا تھا، جس سے مہینوں کا ناغہ ہو جاتا تھا، اس لئے مولانا کے

بڑے بھائی مولانا یحییٰ صاحب (تلمیذ خاص وخادم خاص مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ)
ن کو اپنے ساتھ گنگوہ لے گئے اور ان کو ایک خاص نصاب کے ماتحت پڑھا کر مولانا
ود حسن صاحبؒ کے پاس دورۂ حدیث میں شرکت کی غرض سے دیو بند بھیجدیا، اس
ے فراغت کے بعد مظاہر العلوم سہارنپور میں داخل ہو کر مولانا خلیل احمد صاحب
تہ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے اور ان سے اور وہاں کے دوسرے اساتذہ
ے باقی فنون کی تکمیل کی، جس سے فارغ ہونے پر اسی مدرسہ میں بدرس کر دیئے گئے،
وسطات تک کی تعلیم اُن کے سپرد تھی۔

بیعت و استفاضہ: مولانا کے معاصروں اور دیکھنے والوں کا متفقہ
بیان ہے کہ وہ فطرۃً نہایت نیک، صالح اور متقی تھے، خود مولانا یحییٰ صاحب اُن
کی بڑی قدر کرتے تھے اور بڑی محبت رکھتے تھے، دونوں بھائی ایک دوسرے کے
جاں نثار اور محب و محبوب تھے۔

مولانا گنگوہیؒ طالب علمی میں کسی کو مرید نہیں کرتے تھے، لیکن مولانا الیاس
کو انہوں نے اسی زمانہ میں اُن کی خواہش پر ان کو مرید کر لیا، مولانا گنگوہی کی وفات کے
بعد تکمیل علوم سے فارغ ہو کر مولانا خلیل احمد صاحب کے دستِ مبارک پر دوبارہ
تجدید بیعت کی اور تکمیل باطن میں مصروف ہوئے اور یہاں تک ترقی کی کہ خلافتِ ارشاد
سے مشرف ہوئے۔

بستی نظام الدین: جیسا کہ پہلے گزرا ہے کہ مولانا کے والد غدر کے بعد ہی
سے بستی نظام الدین کی ایک مسجد میں مقیم ہو کر اطراف کے مسلمانوں کے رشد و ہدایت
میں مصروف رہتے تھے، ان کی وفات کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادہ مولوی محمد صاحب
اُن کے جانشین ہوئے، یہ بھی بڑے بزرگ اور نیک و صالح تھے، عبادت و زہد و تقویٰ
کے ساتھ پوری زندگی بسر کی، اطراف کے مسلمانوں کو ان سے فائدہ پہنچا اور اہل میوات

میں بکثرت اُن کے مرید و معتقد تھے اور دہلی کے مسلمان بھی اُن سے مستفید ہوئے، مرنے سے پہلے ۱۶ سال تک اُن کی تہجد کی نماز قضا نہیں ہوئی اور مرتے دم تک نماز باجماعت کے پابند رہے، عشار کی نماز کے بعد وتر کے سجدہ میں انتقال فرمایا۔

مولانا محمد صاحب کی وفات کے بعد یہ مسجد بالکل خالی رہی، مولانا کے دوسرے بڑے بھائی مولانا یحییٰ صاحب کا اس سے پہلے ۱۳۳۴ھ میں انتقال ہو چکا تھا اور مولانا الیاس صاحب ابھی اپنی تکمیل میں مصروف تھے، اس لئے جب فراغت ہوئی تو دہلی کے مخلصین کے پیہم اصرار پر مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو بیعت و تلقین کی اجازت دے کر دہلی بھیج دیا اور مولانا نے اپنے بھائی کی جگہ بستی نظام الدین میں متوکلانہ اقامت شروع کی، ابتدا میں ان کو بڑی تکلیفوں کا سامنا ہوا، مگر اُن کے پائے استقامت کو لغزش نہیں ہوئی، آخر اللہ تعالیٰ نے اُن کے کاموں میں برکت دی ان کو مسلمانوں میں حسن قبول عطا فرمایا۔

سب سے پہلے انہوں نے مکتب کو ترقی دی۔ جو وہاں پہلے سے قائم تھا اور اس کو مدرسہ کی سطح پر لے آئے، شروع سے اُن میں علمی کے بجائے عملی رنگ گہرا تھا، یہی گہرائی ان کے کاموں میں بھی تھی، مدرسہ قائم کیا تو ہر طالبعلم کا یہ فرض قرار دیا کہ ہر نماز کے بعد ایک طالب علم کھڑا ہو کر نمازیوں کے سامنے ایک مسئلہ بیان کرے، دوسرا ایک حدیث سنا دے، تیسرا قرآن پاک کی کسی آیت کا ترجمہ اور مطلب بیان کرے، اسطرح نمازیوں کا بڑا فائدہ ہونے لگا اور اسی سے اُن کی تبلیغی کوششوں کا آغاز ہوا۔

یاد ہوگا کہ تحریک خلافت کے شباب میں ۱۹۲۴ء میں شردھانندجی کی کوشش سے آریہ تحریک نے زور پکڑا اور خصوصیت کے ساتھ ملکھانوں اور میواتیوں میں اپنا کام شروع کیا، میوات کا بڑا علاقہ ہے جو دہلی کے پاس سے لے کر راجپوتانہ کی ریاستوں تک پھیلا ہوا ہے میرا خیال ہے کہ اس قوم کی آبادی پچاس لاکھ کے قریب ہوگی، اُن کا پیشہ کاشتکاری

اور مویشی پالنا ہے، لیکن یہ لوگ حد درجہ لڑاکے اور چوری، ڈاکہ اور قتل میں بدنام تھے کہنے کو تو مسلمان تھے لیکن نام بھی مسلمانوں کا نہیں اور کام بھی نہیں، مولانا نے یہ سمجھ کر کہ یہ سارا فساد ان کی جہالت کے سبب سے ہے، میوات کے پورے علاقے کا بڑی محنت سے دورہ فرمایا، میلوں پیادہ چل کر بیل گاڑی میں بیٹھ کر اور جہاں سڑک تھی موٹر پر پورے علاقے میں سالہا سال پھرتے رہے، جگہ جگہ مسجدوں اور مکتبوں کا انتظام کیا، ہر جگہ وعظ کیا، لوگوں سے ملے، اُن کو اپنے سے آشنا کیا، ان کو سمجھایا، ان کو دین بتلایا، کلمہ سکھلایا، جو جان چکے اور سیکھ چکے اُن کو آگے بڑھایا، اُن کو دوسروں کے بتانے اور سکھانے کا کام سپرد کیا، جو اہل نظر آئے، ان کو ذکر و فکر کی تلقین کی، جو تعلیم کے قابل ہوئے اُن کو تحصیلِ علم پر مامور کیا، اخلاص سے کام کرنے والوں کو آس پاس سے بٹورا، ان کو اپنی طرزِ دعوت سے آشنا کیا اور اُن کو تھوڑی تھوڑی تعداد میں اس شرط کے ساتھ کہ وہ کھانے پینے اور سفر کا کل خرچ اپنی جیب سے کریں گے، گاؤں گاؤں میں بھیجا اور اس طرح میوات کی پوری سرزمین مخلص مبلّغ سپاہیوں کا کیمپ بن گئی اور چند سال کے بعد ڈاکوؤں اور چوروں کا جرائم پیشہ گروہ نیک صالح اور دیندار مسلمانوں کی جماعت بن گئی، یہ حضرت مولانا کی مساعی جمیلہ کی وہ کرامت ہے جس کو پولیس کی سرکاری رپورٹ میں بھی صحیح مان لیا گیا اور جرائم پیشہ گروہ سے وہ خارج قرار دیا گیا۔

مولانا کا طریق دعوت بالکل سادہ تھا، خود سادہ تھے، سراپا اخلاص تھے، سراپا درد تھے، دین کے سچے غمخوار اور مسلمانوں کے بدل خدمت گزار، اللہ پر متوکل، ایک دھن تھی کہ دن رات اُن کو بیقرار رکھتی تھی، اُن کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، جو تھا وہ صرف دین کی خدمت اور مسلمانوں کی غمخواری اور اصلاح کی فکر تھی، یہی ان کی تقریر تھی، یہی اُن کی گفتگو اور اسی کا شب و روز ملنے جلنے والوں سے اعلان و اظہار۔

میری ملاقات: مولانا کا ذکر خیر مدت سے سُن رہا تھا، ہمارے مدرسہ دارالعلوم

ندوۃ العلماء کے متعدد اساتذہ کرام جن کے سرخیل مولانا ابوالحسن علی ندوی تھے، کئی دفعہ بستی نظام الدین جاکر مولانا سے مل چکے تھے اور بابرکت فیض سے مستفید ہو چکے تھے بلکہ ہمارے یہاں سے کئی سال سے متواتر طلبہ کے وفود مولانا کے حلقہ مبلغین میں داخل ہو کر خدمت کیا کرتے تھے اور واپس آکر اپنے تاثرات بیان کرتے تھے، مگر خاکسار کو ذاتی طور پر نیاز کا شرف حاصل نہ تھا، اتفاق دیکھئے کہ گزشتہ سال مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی نے مولانا اور اُن کے ساتھیوں کو لکھنؤ اور ندوہ میں قیام کرنے کی دعوت دی، چنانچہ شعبان کی بیچ کی تاریخ اس کے لئے مقرر ہوئی، ادھر رجب کے شروع میں جولائی کی بیچ کی تاریخیں تھیں، خاکسار تھانہ بھون میں تھا کہ مولانا کی آمد کی اطلاع ملی، اور تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ وہ واپس دہلی کے لئے اسٹیشن روانہ ہو گئے، مجھے بھی دہلی جانا تھا اور اسی گاڑی سے مولانا ظفر احمد صاحب کے ساتھ اسٹیشن آیا، دیکھا کہ ایک دبلے پتلے نحیف سے میانہ قد، بڑی داڑھی، کچھ کچی اور کچھ پکی، ہاتھ میں چھڑی، سر پر عمامہ، مگر وہ کبھی سر سے اُترا اور کبھی سر پر رکھا ہوا، اسی طرح جسم پر لمبے کرتے کے اوپر ایک عبا سا، مگر وہ بھی کبھی دربر اور کبھی باہر، ایک کمبل بچھائے ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہیں، ہم دونوں بھی سلام کے بعد جاکر بیٹھ گئے، وہ اور مولانا ظفر احمد صاحب تو مدت کے رفیق اور ایک دوسرے کے محب اور دوست تھے، مولانا نے فوراً اپنی تبلیغ کی تقریر شروع کر دی اور ان کو اپنے طریق دعوت کی توضیح بھی بیان فرماتے رہے اور وہ مجھ سے بالکل ناآشنا تھے اور میں اُن کے نام اور کام سے آشنا، مگر خود اُن کی حقیقت سے ناآشنا تھا، میں اُن کی باتوں کو چپ چپ سنتا رہا، آخر میں یہ عرض کی کہ حضرت! ایسے لوگوں کو جو صرف دو چار دن آپ کی صحبت میں رہے اُن کو تزکیہ اور تصفیہ کے بغیر مبلغ بنا کر بھیجنا کیونکر مفید ہوگا، فرمایا، مکتوبات مجدد الف ثانی پڑھیئے، معلوم ہو جائے گا دوبارہ عرض کی، میں نے اُن کو پڑھا ہے، مگر اُن سے تو اس مشکل کا حل معلوم نہ ہوا،

شاید مولانا کو کچھ اچنبھا سا ہوا، مولانا ظفر صاحب سے پوچھا آپ کون ہیں، انہوں نے میرا نام لیا تو خوشی سے اُچھل پڑے، کھڑے ہو گئے، سینہ سے لگایا اور مجبور کیا کہ انہی کے ساتھ انہی کے ڈبہ میں سیکنڈ کلاس میں سفر کروں، میرا ٹکٹ بدلوایا اور اس وقت سے لے کر کاندھلہ تک برابر ڈیڑھ دو گھنٹہ بڑے جوش و خروش سے کلام فرماتے رہے اُن کی زبان میں لکنت تھی، تقریر پر قادر نہ تھے، تقریر بھی اُلجھی ہوئی ہوتی تھی، مگر جوش و خروش کا سمندر ان موانع کے سارے خس و خاشاک کو بہائے لئے جاتا تھا تھوڑی گفتگو کے بعد۔

واہ ری تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا وہ بھی میرے دل میں ہے

جسمانی کمزوری اور ضعف سینہ کے باوجود اُن کے پھیپھڑے ان کی پُرزور تقریر اور پُرجوش گفتگو کے تسلسل اور تواتر کے سبب سے ہر وقت اس طرح اُبھر اُبھر کر اٹھتے تھے کہ مجھے تو ڈر لگتا تھا کہ کہیں یہ پھٹ نہ جائیں، یا گلے کی رگیں جو بار بار پھول پھول جاتی تھیں وہ نہ پھٹ جائیں، یہ سب سہی مگر دریا اپنی روانی میں ہر خطرہ سے بے خبر اور ہر اُفتاد سے بے پروا تھا۔

مولانا نے اس اثنا میں جو کچھ فرمایا، میں نے اپنی استعداد کے مطابق اس کو پوری طرح سمجھ لیا، اتنے میں کاندھلہ آیا، اور وہ اتر گئے مگر مجھ سے یہ وعدہ لے لیا کہ کل رات کو دہلی میں پھاٹک حبش خاں میں ان کا تبلیغی جلسہ ہے، میں اس میں شرکت کروں، چنانچہ شریک بھی ہوا اور تقریر بھی کی اور مولانا نے اس کی تصدیق و تصویب بھی فرمائی۔

میں اس سفر سے لوٹ کر جب لکھنؤ آیا، تو مولانا کے اہل تبلیغ مجاہدوں کی آمد لکھنؤ میں شروع ہو چکی تھی اور ندوہ کی مسجد میں اُن کا قیام تھا، اللہ اللہ کیا سادگی کی شان پائی، سادہ، تکلف سے بری، شب زندہ دار، تہجد گزار، پچھلے پہر سے ذکر و فکر میں مصروف صبح کی نماز پڑھ کر اپنے کام کے لئے مستعد اور تیار۔

ایک دو روز کے بعد مولانا مع اپنے دوسرے رفقار کے آئے اور ندوہ کے مہمان خانہ میں ساتھ ہی قیام فرمایا اور تقریباً ایک ہفتہ تک دن رات ساتھ رہا، ہر گفتگو میں شریک اور ہر مجلس میں رفیق، جیسے جیسے ملتا جاتا تھا، اُن کی تاثیر بڑھتی جاتی تھی، مولانا کی تقریر گو الجھی ہوئی اور بیان ژولیدہ بدستور تھا، مگر میں نے دیکھا کہ جو آیا وہ اثر سے خالی نہ گیا۔

اُدھر کہتا گیا وہ اور اِدھر آتا گیا دل میں
اثر یہ ہو نہیں سکتا کبھی عولئے باطل میں

لکھنؤ میں کئی جلسے ہوئے اور بار بار تقریریں ہوئی، لوگوں نے مطلب سمجھا شرکت پر آمادہ ہوئے، کام کا آغاز ہوا، دلی سے مبلغین لکھنؤ کے کوچہ کوچہ میں پھرے اور مسلمانوں کو کلمہ اور نماز کی تلقین کی، ایک ہفتہ کے بعد کانپور کی جانب کوچ ہوا، دو تین روز قیام رہا، خاکسار بھی ساتھ تھا، یہاں ہر وقت ان کی صحبت اٹھائی، اُن کی تقریریں سُنیں۔ ان کے کام کو جانچا، اُن کی دُھن کو دیکھا، ہر وقت مسلمانوں کی اصلاح، دین کی سربلندی اور اعلائے کلمہ کے لئے درگاہ الٰہی میں دستِ نیاز دراز، آنکھیں پُر نم، آواز دلگیر۔

زیادہ دیکھنے والوں اور بار بار ملنے والوں کو تو خدا جانے کیا کیا ادائیں پسند ہونگی لیکن مجھے اس تھوڑی سی ملاقات میں ان کی تین ادائیں بہت پسند آئیں، صبح کی نماز کے بعد مقتدیوں کے رُخ بیٹھ کر وہ کام کرنے والوں کو دن کا کام سمجھاتے تھے اور بار بار اُن کی کامیابی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائیں فرماتے تھے، ان دعاؤں میں لفظ اللہ ان کے دل کی گہرائی سے نکل کر دوسروں کے دلوں کی گہرائی میں گھر کر لیتا تھا، ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد، مختلف اوقات میں ان کی زبان سے کسی قدر آواز میں یہ دعائے ماثورہ یَا حَیُّ وَیَا قَیُّوم۔ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ اَصْلِحْ لِیْ شَاْنِیْ كُلَّهٗ وَلَا تَكِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَیْنٍ (اے حی و قیوم خدا میں تیری رحمت سے چاہتا ہوں کہ تو میری فریاد کو سُنے، تو میری حالت کی درستی فرما دے اور ایک لمحہ کے لئے بھی مجھے میرے

نفس پر نہ چھوڑے) نکلتی تھی اور ان کے فقر و التجا الی اللہ کی کیفیت کو ظاہر کرتی تھی، وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہتے تھے اور ان میں کسی قسم کا امتیاز نہیں چاہتے تھے وہ لکھنؤ سے کانپور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ تھرڈ کلاس میں سوار تھے۔ ان کے بعض معتقد فرسٹ کلاس میں سوار تھے، بھیڑ کا یہ عالم تھا کہ تھرڈ میں تو ہلنا، بلکہ اپنی جگہ سے نکلنا بھی مشکل تھا، سیکنڈ میں بیٹھنے کی جگہ تھی، مگر اندر جانے کی جگہ نہ تھی، فرسٹ میں گنجائش تھی ہر اسٹیشن پر کوشش کی گئی کہ مولانا نکل کر فرسٹ میں چلے آئیں، مگر منظور نہیں فرمایا، آخر کانپور کے قریب پہنچ کر ظہر کی نماز یا اور کسی ضرورت کی بنا پر اس درجہ میں داخل ہوئے۔

لکھنؤ کے قیام میں ایک دفعہ ایک دوست کے ہاں عصر کے وقت چائے کی دعوت تھی، پاس کوئی مسجد نہ تھی، اُن کی کوٹھی ہی میں نماز باجماعت کا سامان ہوا خود کھڑے ہو کر اذان دی، اذان کے بعد مجھ سے ارشاد ہوا کہ نماز پڑھاؤ، میں نے معذرت کی تو نماز پڑھائی، نماز کے بعد مقتدیوں کی طرف رُخ کر کے فرمایا، بھائیو! میں ایک ابتلا میں گرفتار ہوں، دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے نکالیں، جب سے میں یہ دعوت لے کر کھڑا ہوا ہوں لوگ مجھ سے محبت کرنے لگے ہیں، مجھے یہ خطرہ ہونے لگا ہے کہ مجھ میں اعجابِ نفس نہ پیدا ہو جائے، میں بھی اپنے کو بزرگ نہ سمجھنے لگوں، میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس ابتلاء سے بسلامت نکال لیں، آپ بھی میرے حق میں دعا فرمائیں۔

مجھے کبھی بستی نظام جانے اور ان کی مسجد میں قیام کرنے کا اتفاق نہیں ہوا مگر جانے والوں سے سُنا کہ پچھلے پہر رات کا سماں بڑا موثر ہوتا تھا، دن کے سپاہی رات کے راہب بن جاتے تھے، ہر طرف سے تہجد گزاروں اور ذاکروں اور تسبیح خوانوں کی آوازیں بلند ہوتی تھیں، کوئی سجدہ میں ہوتا تھا تو کوئی رکوع میں، کوئی گریہ وبکا میں تھا، تو کوئی دعاؤں میں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سچائی کا ایک آفتاب کیونکر متعدد ذروں کو اپنے پاس

کھینچ کر روشن بنا دیتا ہے۔

مولانا کا جسمانی ضعف، پھر شب و روز کی یہ محنت اور دعوت کے کاموں میں ہمہ وقت کا یہ شدید انہماک، اور آرام و راحت کی ہر تدبیر سے کابل اعراض نے ادھر ان کو ضعیف بنا دیا تھا، مہینوں سے پیچش اور اسہال کا عارضہ پیدا کر دیا تھا اور ضعف روز بروز بڑھتا جاتا تھا، ہر علاج ناکام رہا، مگر اس حالت میں بھی کام کے انہماک اور دعوت کے جوش کا وہی عالم تھا، آخر میں یوں تو نشست و برخاست دشوار ہو گئی تھی، سہارے سے اٹھتے بیٹھتے تھے، مگر اس حالت میں بھی نماز باجماعت کا اہتمام اخیر تک رہا، بلکہ فرض نماز کھڑے ہو کر ادا فرماتے رہے اور خدا جانے اس وقت اُن کے اندر کہاں سے طاقت آجاتی تھی۔

اس زمانہ میں جو لوگ اُن سے ملنے اور اُن کو دیکھنے گئے، سب نے اُن کی بڑی پُرتاثیر کیفیتیں بیان فرمائی ہیں، برادر عزیز مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کی تحریر اخباروں میں آچکی ہے۔ یہ اخیر وقت تک مولانا کے ساتھ تھے، دوسری تحریر مولانا ظفر احمد صاحب نے لکھ کر بھیجی ہے، جو "تبصرۃ الناس فی ترجمہ الیاس" کے نام سے الگ چھپے گی اور اپنے اس مضمون میں بھی میں نے اس سے استفادہ کیا ہے، یہ بھی اخیر زمانہ میں مولانا سے ملے تھے اور اس زمانہ کے احوال و تاثرات قلمبند فرمائے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے مسلمانوں کو نفع روزی فرمائے۔

۲۱ رجب ۱۳۶۳ھ (۱۳ جولائی ۱۹۴۴ء) کو وفات پائی اور اسی مقام بستی نظام الدین کی مسجد کے صحن کے باہر جنوبی و مشرقی گوشہ میں اپنے والد و برادر معظم کے پہلو میں سپرد خاک ہوئے۔

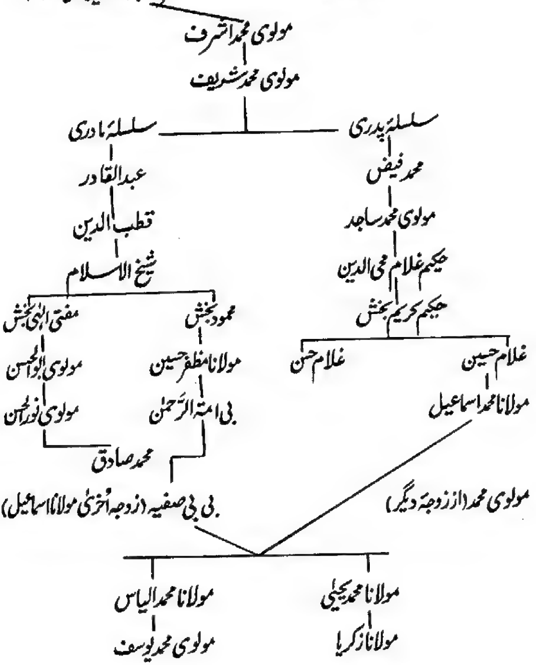
چپہ چپہ ہے واں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہو گا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

ذیل میں ہم تبرکاً اس خانوادہ کا پورا سلسلہ درج کرتے ہیں۔

(شجرۂ نصب اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

شجرۂ نسب

مولوی محمد اشرف بن شیخ جمال محمد شاہ بن شیخ بابن شاہ بن شیخ بہاء الدین شاہ بن مولوی شیخ محمد بن شیخ محمد فاضل بن شیخ قطب شاہ از سلسلۂ اولاد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ



ایک بہادر مسلمان کی موت

بہادر خان

چار پانچ ہفتے ہوئے میں ایک گاؤں میں تھا کہ دفعتہً ایک صاحب نے ایک انگریزی اخبار کے حوالے سے نواب بہادر یار جنگ کی اچانک موت کی اطلاع دی، موت ہر وقت آتی ہے اور ہر وقت آسکتی ہے تاہم جن کے مرنے کو دل نہیں چاہتا اُن کے مرنے کی خبر کا یقین بھی دفعتہً نہیں آتا۔ اُن کا ہشاش بشاش متبسم چہرہ، اُن کا صحیح وتنومند جسم، اُن کا خوب صورت اور دل فریب قد بالا، ہر چیز بجلی کی کوند کی طرح سامنے آئی اور ان کی موت کی خبر کو جھٹلا کر چلی گئی، خود جا کر اخبار پڑھا ورق کو اُلٹا پلٹا، روایت نے صدق کی اور صدق نے یقین کی اور یقین نے آنسوؤں کی صورت اختیار کی اور اِنا للہ کے ساتھ دل کی گہرائی سے مغفرت کی دعا نکلی۔

مرحوم سے جان پہچان اور بار بار کی ملاقات تو بارہ تیرہ برس سے تھی، مگر ابھی اسی سال فروری مارچ اور وسط اپریل تک حیدرآباد میں دارالعلوم ندوہ کے سلسلہ سے تقریباً ان سے روزانہ ہی ملنا جلنا اور ساتھ ساتھ لوگوں کے پاس آنا جانا اور گھنٹوں بیٹھ کر ہر موضوع پر اظہارِ خیال کا اور ہر پہلو سے اُن کے جانچنے اور پرکھنے کا موقع ہاتھ آیا اور ہر پہلو سے محبوب ہی نظر آئے ارادے کے پکے، بات کے دھنی مخلص وفادار، خدا ترس، عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم، مجاہد اسلام، بہادر مسلمان سپاہی اور ہر معنی میں سپاہی اور بہادر پٹھان اور بہادر مسلمان۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ زبان کے تیز ہاتھوں کے کمزور ہوتے ہیں، یعنی باتوں کے دھنی

ہاتھوں کے سست ہوتے ہیں، مگر وہ زبان اور ہاتھ دونوں کے تیز تھے اور اسی کا کرشمہ تھا کہ صرف چند سال کے اندر کشمیر کی پہاڑیوں سے لے کر دکن تک پورے ہندوستان پر چھا گئے۔

بارہ تیرہ سال گزرے ہوں گے کہ مجھے ان کا نام حیدرآباد میں پہلے پہل ایک مدراسی فاضل دوست افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کے ایک تار میں جس کو کرنول سے انہوں حیدرآباد میرے نام بھیجا تھا، نظر آیا، اس تار میں مجھے نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ کرنول کے ایک جدید مدرسہ کے افتتاح میں بلایا تھا، آنکھوں نے تار کی سطروں میں نواب بہادر یار جنگ کا نام پڑھا، دل نے کہا، نواب! عیش کا پروردہ، دولت کا آفریدہ، راحت کا خوگر، محراب و ممبر سے ناآشنا، وہ قومی وہ مذہبی مجالس کا ہیرو ہو، میرا قیام اپنے عزیز دوستوں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے گھر میں تھا، میں نے اُن سے اپنی حیرت کا اظہار کیا، مولانا گیلانی نے بڑھ کر انکی تحسین کی اور فرمایا جی ہاں انہیں بچپن سے جانتا ہوں، خوب بولتے ہیں اور بڑی دل نشین تقریر کرتے ہیں، اسکول میں جب پڑھتے تھے مجھے بلا بلا کر اپنے جلسوں میں لیجاتے تھے تقریر کے انعامی مقابلوں میں میں انہیں انعام اور تمغے دیا کرتا تھا، آج کل میلاد کی مجلسوں میں اُن کی تقریریں بہت پسند کی جاتی ہیں، یہ وہ زمانہ تھا جب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی صدر الصدور دولت آصفیہ تھے اور ان کے سبب سے میلاد کی محفلوں کی بڑی کثرت اور چہل پہل تھی، شستہ اور محتاط مقررین کی تلاش رہتی تھی، اس سلسلہ میں تازہ وارد نوجوان بہادر خان کی حوصلہ افزائی پر حوصلہ افزائی کی جاتی رہی۔

علی گڑھ یونیورسٹی یونین سے داد پانا آسان نہیں، یونین میں ان کی پہلی تقریر تھی۔ موضوع حیدرآباد میں مسلمانوں کی سیاسی حیثیت اور دعویٰ ہائے اقتدار تھا، جب تک وہ تقریر کرتے رہے، تاثیر کا دریا بہتا رہا اور ہر شخص کو تسکین ہو گئی کہ حیدرآباد ی مسلمانوں کا

دعویٰ بالکل صحیح ہے، ایک اچھے مقرر لیڈر کو یہ کہتے سُنا کہ انہوں نے اپنے کیس کو بہت خوبی سے پیش کیا، طالب علموں نے اُن پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے، یہ علیگڑھ میں اُن کی پہلی جیت تھی۔

جس زمانہ میں حیدر آباد میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی پہلی شورش ہوئی اور چند مسلمان کسی ہندو محلہ میں شہید کر دیئے گئے، مسلمانانِ حیدر آباد میں آگ سی لگ گئی تھی، اُن شہیدوں کا جنازہ لاکھوں مسلمانوں نے بڑی دھوم سے اٹھایا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مجمع کا جوش سارے شہر میں ہندوؤں کو تہ تیغ کئے بغیر ٹھنڈا نہ ہوگا، سر اکبر حیدری کی وزارت تھی، نواب بہادر یار جنگ کو تقریر کی ممانعت تھی، دم بدم مجمع کا جوش بڑھ رہا تھا اور خطرہ سب کے سامنے تھا، اس وقت اعلیٰ حضرت نظام خلد اللہ ملکہ کی اعلیٰ سیاست نے اس شخص کو جان لیا جو اس بھڑکتے ہوئے شعلہ پر پانی ڈال سکتا تھا، مرحوم کہتے تھے کہ میں اپنے گھر میں تھا کہ خود اعلیٰ حضرت نے مجھ سے ٹیلیفون پر ارشاد فرمایا کہ بہادر خان! میں تم سے خواہش کرتا ہوں کہ تم اس کو فرو کرو، عرض کی اعلیٰ حضرت! یوں نہ فرمائیں، بلکہ حکم دیں، فدوی ہتھیلی پر سر رکھ کر ابھی جاتا ہے اور حکم شاہانہ بجا لاتا ہے، چنانچہ وہ تنہا اس مجمع میں گئے اور چند منٹ کی مؤثر تقریر میں سارا مجمع امن و سکون کے ساتھ منتشر ہو گیا، مسز سروجنی نائیڈو مکان کی چھت سے یہ سارا تماشہ دیکھ رہی تھیں، انہوں نے بعد کو مرحوم سے کہا کہ میں نے امن و سلامتی کی حالت میں اسٹیج لیڈر مقرر تو بہت دیکھے مگر انتقام کی آگ سے مشتعل اور جوش سے بھرے ہوئے مجمع کو اس طرح قابو میں لے آنے والا لیڈر اور مقرر میں نے آج ہی دیکھا۔

اتفاق دیکھئے کہ چند ہی روز بعد مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی صدر اعظم دولت آصفیہ کے یہاں دعوت ہوئی، بہت سے مہمان تھے، کھانے سے فرصت ہوئی تو ایک خوبصورت سڈول نوجوان شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس بے تکلفی کے ساتھ آگے بڑھا، اور

ادب سے ہاتھ ملاکر گویا ہوا، میں خود اپنا تعارف کراتا ہوں، میں ہوں آپ کا شاگرد بہادر بہادر خان، آنکھوں نے حیرت سے صورت دیکھی، ناآشنا پایا، تفصیل پوچھی، فرمایا آپ کی کتابوں کو پڑھ کر علم پایا اور خطبات مدراس کورٹ کر میلاد کی محفلوں کو گرمایا۔ ان کی اس تواضع سے دل شرمندہ ہوا اور ان کی اس شرافت سے سننے والے کی گردن جھک گئی۔

ان کی یہ تواضع اور خاکساری تنہائیوں ہی میں نہیں، ہزاروں کے مجمع میں اسی طرح ظاہر ہوتی تھی، مولانا گیلانی کے ساتھ اُن کی ممنونیت برملا اُن کی زبان سے ظاہر ہوتی، مولانا شروانی کی حوصلہ افزائی کا اعتراف علی گڑھ یونین کی پہلی تقریر میں خود میرے کانوں نے سُنا، دارالمصنفین کی کتابوں کے احسان کی کہانی اسی سال مارچ میں دارالسلام حیدرآباد کے عظیم الشان جلسہ میں سب نے سُنی۔

مرحوم کی تقریر میں فصاحت و بلاغت اور بدائع تینوں کے جوہر تھے شاعری وہ نہیں کرتے تھے، مگر اُن کی نثر شاعری کا نمونہ ہوتی تھی، اُن کی تقریریں بارہا سُنیں، ان کی اساس تین چیزیں ہوتی تھیں، اسلامی تاریخ کے معلومات، اقبال کے اشعار، ابوالکلام کے الفاظ، انہوں نے اقبال کو بہت سمجھ کر پڑھا تھا، ان کا بیشتر کلام اُن کے حافظہ کے خزانہ میں محفوظ تھا، جس کو وہ اپنی تقریروں میں بہت دلنشین انداز میں موقع موقع سے پڑھتے تھے اور حاضرین سے خراج تحسین وصول کرتے تھے۔

مرحوم کی تقریروں کا اصلی میدان مسلم لیگ کے اجلاس اور اتحاد المسلمین حیدرآباد کے جلسے ہوتے تھے، مرحوم کا مذاق مذہب آمیز سیاست تھا، اُن پر دینی سیاست کا راز کھل چکا تھا اور وہ یہی راز سب کو بتانا چاہتے تھے، اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا تھا اُن کا یہ رنگ تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا تھا، یہاں تک کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کراچی کے بعد سے لیگ کے خالص دنیاوی سیاسیوں پر ان کی تقریر بار ہونے لگی تھی۔

حیدرآباد میں اگرچہ پچھلے چند برسوں کے اندر جب سر حیدری کی سیاست حیدرآباد

کے دستور کی ترکیب وتحلیل میں مصروف تھی، نواب بہادر یار جنگ کا وجود نہ ہوتا تو حیدر آباد کے نظم ونسق کا کچھ اور ہی انداز ہو گیا ہوتا، بیرونی ہندو لیڈروں اور دکن کے مرہٹوں نے ریاست کی امن دوست اور وفادار غیر مسلم رعایا کو بھڑکانے میں کمی نہیں کی اور یہ دعویٰ کیا کہ مردم شماری کے مطابق ریاست میں دونوں قوموں کے حقوق مانے جائیں، یہ سب کچھ ہو رہا تھا، مگر اس ملک کے مسلمان بالکل خواب غفلت میں تھے اور بجز عیش وآرام اُن کا کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا، دہانکے مسلمان جاگیردار جو اس ملک کی بڑی قوت ہیں، محو استراحت تھے، دکن کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ صدیوں سے حکومت کے سر پر سارا بوجھ رکھ کر آرام طلبی اور بے فکری کے عادی ہو گئے ہیں، اس بے کاری سے اُن کے دست وبازو شل اور قوائے عمل معطل ہیں، اُن کا کوئی قومی تخیل اور سیاسی جذبہ زندہ نہیں رہا ہے، اور کسی حال میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ اُن کشورستانوں کی یادگار ہیں، جنہوں نے اپنے کو بڑی مشکلوں میں ڈال کر دکن کی آصفی حکومت کو قائم کیا تھا۔

مرحوم کا بڑا کارنامہ اسی جذبہ کو زندہ کرنا تھا، انہوں نے جاگیرداروں کو جھنجھوڑ کر جگایا اور بتایا کہ اگر انہوں نے اٹھ کر اپنی زندگی اور ملک کی دینی ضرورت کا یقین نہیں دلایا تو زمانہ کا سیلاب اُن کے اقتدار کو بہالے جائے گا، عام مسلمانوں کو یہ یاد دلایا کہ یہ ملک تمہارا مفتوحہ اور مقبوضہ ملک ہے اور تم بحیثیت قوم کے اس کے کشورکشا اور فاتح ہو اور خانوادۂ آصفی کا سرتاج تمہاری حکومت کا نمائندہ، تمہاری طاقت کا مظہر، تمہاری بادشاہی کا ستون اور تمہاری وفاداری کا مرکز ہے۔

مرحوم نے اپنے سیاسی تخیل کی بنا پر تکلیفیں بھی اٹھائیں، اُن پر پابندیاں بھی عائد ہوئیں اُن کے متعلق غلط فہمیاں بھی پیدا کر دی گئیں، تاہم انہوں نے ایثار کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا، یہاں تک کہ اپنے خطاب ومنصب سے بھی دستبردار ہو گئے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

مرحوم کی کوششوں سے دکن کے مسلمانوں نے صدیوں کے آرام کے بعد کروٹ لی اور اتحاد المسلمین کے زیر سایہ ایک مرکز پر جمع ہو گئے، اس کی شاخیں سارے ممالک محروسہ میں قائم ہو گئیں، اس کی آواز نے ملت کی آواز کا رتبہ پایا، اس کے سالانہ اجلاس میں ایک دفعہ پچاس پچاس ہزار آدمی جمع ہو جاتے تھے۔

مرحوم کا خیال تھا اور بجا خیال تھا کہ کسی ملک کی سرکاری تعلیم سے قومی روح زندہ نہیں ہو سکتی، اس لئے حیدر آباد میں وہ ایک خالص قومی یا اسلامی درسگاہ قائم کرنا چاہتے تھے، جو دکن میں اسلامی روح پیدا کرے اور جب تک یہ درسگاہ قائم نہ ہو ایک اسلامی بورڈنگ کی بنیاد ڈالی جائے، جس میں شہر کے ہر اسکول و کالج کے مسلمان طلبہ اقامت پذیر ہوں اور وہ بورڈنگ کی تعلیم و تربیت میں رہیں، چنانچہ انہوں نے پچھلے ہی سال قومی چندہ سے ایک لاکھ میں حیدر آباد کے گویا وسط میں ایک بہت بڑی عمارت خریدی، جس میں آئندہ تعمیرات کے لئے بہت بڑی وسعت ہے، یہی عمارت دار السلام کہلاتی ہے اور یہی اُن کے اتحاد المسلمین کا مرکزی دفتر ہے، اسی عمارت میں ایک اسلامی دار الاقامہ اور علوم مشرقیہ کی ایک چھوٹی سی درس گاہ قائم کی تھی، اس سال کے شروع میں یہ ادارے قائم ہوتے اور اس کے ظاہر کرنے میں مجھے مسرت ہے کہ اُن کے سیاسی و مذہبی تخیلات کی آبیاری اور ان اداروں کی سربراہی میں جو گمنامی آدمی کام کر رہا ہے، وہ تمام تر دار العلوم ندوۃ العلماء کی پیداوار ہے، ندوہ کے لئے یہ شکر کا مقام ہے کہ دین و دنیا کی جامعیت کے ساتھ جب کہیں کوئی کام شروع ہوتا ہے تو اس کے فرزند اس کے لئے بہترین اہل ثابت ہوتے ہیں، مولوی عبد القدوس ہاشمی آروی جو تکمیل کے بعد ہمیشہ علمی مشاغل میں مصروف رہے، مرحوم کی رفاقت کے لئے وہ بہترین رفیق ثابت ہوئے اور مرحوم بھی ان کی کما حقہ قدر کرتے تھے، بہر حال اُن اداروں کی نگرانی ان کے سپرد کی اور انہوں نے وہیں قیام اختیار کر لیا۔

اس سال فروری اور مارچ اور نصف اپریل کے چند مہینے ندوہ کی قومی امداد کے سلسلہ میں اُن کے بہت قریب گزرے، ہر دوسرے تیسرے اُن کے مکان پر جانا ہوا جب گیا ان کو مصروف اور بہت مصروف پایا، صبح سے شام تک ضرورت مندوں اور ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، ٹیلیفون سامنے ہوتا اور ڈاک دوسری طرف رکھی ہوتی تھی، معمولی مسلمان سے لے کر تاجر، بیوپاری، وکیل، اہل سیاست، اہل مشورہ اور حکام سب ہی قسم کے اشخاص باری باری سے آتے اور باتیں کر کے واپس جاتے تھے، ملنے ملانے اور کہیں آنے جانے کے لئے کئی کئی روز پہلے وقت مقرر ہوتا اور پھر بھی اُن کا کام پورا نہیں ہوتا، میں نے حیدر آباد کے لیڈروں میں اُن سے زیادہ ہر دلعزیز کوئی آدمی نہیں دیکھا، جس کا سکّہ ہر کہہ دمہ پر یکساں چلتا تھا۔

ان کی عربی تعلیم کچھ زیادہ نہ تھی۔ تاہم حج کے موقع پر حجاز میں اور حج کے بعد مصر میں کچھ روز اُن کا قیام رہا تھا اور اس طرح عربی کی کچھ مہارت بہم پہنچائی تھی اور چونکہ قرآن پاک کی تلاوت کا سلسلہ برابر جاری تھا، اس لئے قرآن پاک کی آیتوں کے معنی بے تکلف سمجھ لیتے تھے اور تفسیروں کی مدد سے قرآن پاک کے سمجھنے کی کوشش بلیغ کرتے رہتے تھے، صبح کو نماز کے بعد تقریباً نو بجے تک اپنے قریب کی مسجد میں خود ہی لوگوں کو قرآن پاک کا درس سناتے تھے اور ہفتہ میں ایک دن ان کے یہاں اقبالؔ کی کتابوں کا درس ہوتا تھا اور اقبالؔ کے فلسفہ کی گتھی سلجھائی جاتی تھی۔

مرحوم ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے تھے، وہ نسل کے سدوزئی پٹھان تھے، اُن کے آباؤاجداد ہندوستان کے آخری مغل عہد میں جب ہر شمشیر زن قسمت آزما تھا، کچھ حوصلہ مند سپاہیوں کی جمعیت کے ساتھ ہندوستان وارد ہوئے، پہلے ریاست جے پور میں طرح اقامت ڈالی اور راجہ سے کچھ جاگیر پائی اور بعد ازیں حیدر آباد وارد ہوئے اور جمعدار کے عہدہ پر سرفراز ہوئے اور تیس ہزار کی نسلاً بعد نسل جاگیر پائی، مرحوم نے

اپنی یہ خاندانی داستان کہی بار سنائی، مگر کیا معلوم تھا کہ یہ داستان گو اب چند روز کا مہمان ہے، ورنہ اس داستان کا حرف حرف محفوظ رکھا جاتا۔

بہادر خان سا آدمی صدیوں میں پیدا ہوتا ہے اور جب پیدا ہوتا ہے تو انقلاب انگیز ہوتا ہے، اس کی ذات سے امتِ اسلامیہ کو بڑی بڑی امیدیں قائم تھیں اور خصوصیت کے ساتھ دکن کے مسلمانوں کے حق میں اس کا وجود آبِ حیات کا حکم رکھتا تھا تاہم انسان ناچار ہے، اس کی ناچاری کا راز ایسے ہی موقع پر کھل جاتا ہے، تقدیر کا نوشتہ اور قضا کا حکم ناقابلِ تفسیر ہے فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ، ۲۵ جون ۱۹۴۴ء کو دفعتہً وہ حکم آیا اور بندہ نے بلاچون وچرا ایک لمحہ کے اندر اس کی دعوت پر لبیک کہا اور اس دنیائے دوں سے چل بسا، اس پر اللہ تعالیٰ کی صد ہا رحمتیں ہوں اور بے شمار نوازشیں۔

غالباً مارچ ۱۹۴۴ء کی کوئی تاریخ تھی، نواب دوست محمد خاں (جاگیردار) کے یہاں دعوت تھی، جو مرحوم کے بڑے دوستوں میں تھے، احباب کا مجمع تھا، گفتگو علمی اور مذہبی تھی، مرحوم نے بڑے پراثر انداز میں کہا، آج قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے جب وہ مصر سے نکل کر مدین پہنچے ہیں یہ دعا تلاوت میں آئی رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ (اے میرے پروردگار! تو میرے لئے بہتری کا جو سامان بھی مہیا فرمائے میں اس کا محتاج ہوں) مرحوم نے اس موثر دعا کے ایک ایک لفظ کو بڑی تاثیر کی حالت میں پڑھا اور سامعین کے سامنے اسکی تشریح کی، خدائے بے نیاز کی بارگاہ میں عرض ہے کہ لے بار آلہا! آج جب اس دعا کا خواستگار تیرے حضور میں ہے اور تیرے گھر مہمان، تو تو اس کے لئے وہی فرما جس کا وہ محتاج ہے۔

اگست ۱۹۴۴ء

فراقِ مجذوب

خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب

یہ ہوتا ہے رخصت غلامِ محبت
سلامِ محبت سلامِ محبت

افسوس ہے کہ ۱۷ر اگست ۴۴ء کی صبح کو خواجہ صاحب نے اُورئی ضلع جالون میں اپنے گھر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

ابھی چند ماہ ہوئے کہ خواجہ صاحب ہمارے دار المصنفین میں آئے تھے، کئی دن رہے، اہل شہر اور اطرافِ شہر کا ہجوم ان کی زیارت اور ان کے کلام کو سننے کے لئے جمع ہو رہا تھا، جو کچھ بھی کہا تھا اور جو کچھ بھی کہتے تھے سب نوکِ زبان تھا، جب وہ اپنے شعر پڑھتے تھے تو خود بے خود ہو جاتے تھے اور دوسروں کو بیخود کر دیتے تھے، ایک جوش تھا جو اُن کے سینہ میں موجزن ہوتا تھا اور وہ موزوں نغموں کی صورت میں اُن کی زبان سے باہر آتا تھا، کس کو خیال تھا کہ یہ چہکتا ہوا بلبل یوں دم کے دم میں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں اور اعلیٰ علیین میں جگہ بخشیں۔

مرحوم کو میں نے سب سے پہلے تھانہ بھون خانقاہ امدادیہ میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی مجلس میں دیکھا، یہ وہ زمانہ تھا جب وہ اشرف السوانح لکھ رہے تھے، دیکھا کہ مجلس کے اندر لیکن مجلس سے بے خبر ایک بزرگ اپنا دفتر لئے دیوار سے ٹیک لگائے لکھنے میں معروف ہیں، بہ تہ ان کو میرا اور مجھے ان کا بعد کو چلا، اس وقت نہ ایک نے دوسرے کو جانا نہ پہچانا۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اُن سے جان پہچان کی پہلی ملاقات نواب سید علی حسن خاں مرحوم کے یہاں اُن کے مکان بھوپال ہاؤس لکھنؤ میں ہوئی، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ خواجہ خضر کی صورت، دراز قد، گورا رنگ، لمبی سپید داڑھی، گول میرٹھی ٹوپی، سر پر دیئے اور پرانے زمانے کی اچکن پہنے، پرانے ماڈل کی موٹر کو ڈرائیو کرتے ہوئے آئے اور سامنے موٹر روک کر اُترے، سب نے سروقد تعظیم کی، آیئے خواجہ صاحب' آیئے خواجہ صاحب' دل نے کہا یہ ضرور خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوب ہیں، اس حقیر کا بھی تعارف ہوا، لطف فرمایا۔

اس کے بعد جب قسمت نے خواجہ صاحب سے خواجہ تاشی کی نسبت کی سعادت بخشی تو تعارف نے ملاقات، ملاقات نے ان کے ساتھ عقیدت اور عقیدت نے محبت کی شان پیدا کی۔

احبُّ الصّالحین ولست منھم لعل اللہ یرزقنی صلاحًا

"صالحوں میں گو میرا شمار نہیں.... مگر ان سے محبت رکھتا ہوں کہ شاید ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ مجھے بھی صلاح بخشیں۔"

خواجہ صاحب کا اصل وطن ریاست بھرتپور میں قصبہ ندبئ تھا، مقامی اور خاندانی روایتوں کی رُو سے سلطان شہاب الدین غوری نے جب راجپوتانہ فتح کیا، تو یہاں مسلمانوں کے مختلف قبیلوں نے بارہ بستیاں آباد کیں، جن میں سے ایک یہ قصبہ بھی ہے، جس میں مختلف قبیلوں کے نام سے مختلف قبیلے آباد ہیں، جن میں سے ایک غوری پاڑہ ہے اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ خواجہ صاحب کے اجداد میں ہمایوں شاہ کے عہد میں الہ داد بن خواجہ غوری ایک بزرگ گزرے ہیں، جن کے اس نام کا

کتبہ قصبہ کی مسجد میں بانی کے نام کی حیثیت سے لگا ہوا ہے، قصبہ میں مختلف سلاطین کی ٹوٹی پھوٹی یادگاریں اب بھی موجود ہیں۔

خواجہ صاحب کے والد شیخ عزیز اللہ صاحب مرحوم عربی کے عالم تھے، چنانچہ میزان، منشعب، پنج گنج اور نحو میر کے اردو ترجمے عزیز المبتدی، عزیز الطالبین اور عزیز النحاۃ کے نام سے کئے، جو کہیں کہیں مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں اور دُکانوں میں ملتے ہیں، فراغت کے بعد انہوں نے مدرسی پیشہ اختیار کیا، اس زمانہ میں قانون کی تعلیم اُردو میں تھی، اتفاق سے ایک طالب العلم کے والد کے اصرار سے ان کو قانون کی اردو کتابیں پڑھانی شروع کیں، نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی محنت میں وہ خود قانون داں ہو گئے اور امتحان دے کر وکالت شروع کر دی اور اس کے لئے اورئی ضلع جالون کو اپنے لئے منتخب کیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فروغ دیا، اہل علم اور اہل تقویٰ کی صحبت میں رہے، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خط کے ذریعہ بیعت کی، تمام عمر دیانت، عزت اور نیکنامی کے ساتھ بسر کر کے ۱۳۲۶ھ میں وفات پائی، "مغفور" وفات کا مادۂ تاریخ ہے۔

خواجہ صاحب کی ولادت ۱۶ر شعبان ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۲ر جون ۱۸۸۴ء کو اورئی میں ہوئی، تعلیم گو انگریزی کی دی گئی، مگر تربیت خالص دینی اور مشرقی رہی، اعلیٰ انگریزی تعلیم کے لئے علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے اور بی اے کا امتحان پاس کر کے ایل ایل بی کی تیاری کے لئے الہ آباد آئے۔

چونکہ گھر کا ماحول مذہبی تھا، اس لئے مذہبی کتابوں سے دلچسپی بچپن سے رہی اور پھر چونکہ ان کے والد کو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق تھا، اس لئے فطرۃً ان کی کشش اُن کے خلیفۂ وقت حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات کی طرف ہوئی، اب جو الہ آباد آئے تو قسمت نے تصنیفات سے صاحب

تصنیفات تک پہنچا دیا ۱۳۲۶ھ کا واقعہ ہے کہ اتفاق سے مولانا الہ آباد آئے ہوئے تھے، ان کے وعظ کا اشتہار ہوا، جس کو دیکھ کر خواجہ صاحب بیتابانہ اُس مسجد میں پہنچ گئے جہاں حضرت کا قیام تھا، دیکھا کہ حضرت محو خواب ہیں، کچھ ہی دیر کے بعد ظہر کی اذان ہوئی، مولانا اٹھے تو اس شان سے کہ کُرتے کا گریبان کھلا تھا، زلفیں پریشان تھیں اور آہستہ آہستہ وضو کے لئے باہر نکل رہے تھے، شاعری خواجہ کی فطرت تھی، اس موقع پر اشرف السوانح میں کیا شعر لکھا ہے۔

قبا وا کردہ و کاکل پریشاں کردہ می آید

بہ بیں ایں بے سر و ساماں چہ ساماں کردہ می آید

سلام کیا، بڑھ کر مصافحہ کیا، تعارف کرایا، اور بیعت کی درخواست کی، جو قبول ہوئی، یہ اوّل دن ہے اور حضرت والا کی وفات کا دن آخری دن ہے کہ اپنے شیخ کے پاؤں سے لپٹے، تو پھر الگ نہیں ہوئے، باہر رہے تو بھی دل شیخ کے پاس ہی رکھا اور جب موقع ملا تو حاضری کے لئے دوڑ پڑے، شیخ سے اس محبت اور عقیدت کی مثال جو اُن کو اپنے شیخ سے تھی اس زمانہ میں کم ملے گی۔

خواجہ صاحب نے قانون چھوڑ کر پہلے آبکاری میں نوکری کی، مگر والد مرحوم کے حکم سے اس سے مستعفی ہو گئے اور تحصیلداری کے لئے کوشش کی، تحصیلدار تو نہیں ہوئے مگر ڈپٹی کلکٹر ہو گئے، سات برس اس عہدہ پر رہے مگر یہ عہدہ ان کی افتاد طبیعت کے خلاف تھا، پھر خلاف شرع مقدمات کے فیصلہ سے اُن کے دل کو الجھن ہوتی تھی، اس لئے کوشش کر کے اپنا تبادلہ تنخواہ کی کمی پر تعلیمات میں کرالیا۔ پہلے مکاتب اسلامیہ میں ڈپٹی انسپکٹر ہوئے، پھر انسپکٹر ہوئے، پھر انگریزی اسکولوں کے انسپکٹر ہوئے اور اسی عہدہ سے پنشن پا کر ریٹائر ہوئے ڈپٹی کلکٹری ہی کے زمانے میں وہ حج سے فارغ ہو چکے تھے۔

خواجہ صاحب گوبچپن ہی سے نیک تھے، علی گڑھ کالج میں بھی داڑھی رکھ کر داخل ہوئے اور بسلامت واپس آئے اور بیعت کے بعد تو ان کا تقویٰ اچھے اچھے مولویوں کو شرماتا تھا، پوری سرکاری ملازمت میں اور دوروں میں کبھی کسی سے کوئی چیز بے قیمت نہیں قبول کی، یہاں تک کہ مٹی کے گھڑے وغیرہ کی بھی قیمت ادا کر دیتے تھے۔

ملازمت کے زمانہ میں ایک دفعہ ایک لڑکا ساتھ تھا جس کی عمر گو ۱۲ برس کی تھی مگر دیکھنے میں چھوٹا معلوم ہوتا تھا، اہل کار کا اصرار تھا کہ اس کا ٹکٹ نصف چل جائے گا، مگر انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا اور ٹکٹ پورا لیا، اہل دنیا ان کی اس "معصومیت" پر ہنستے رہے اور وہ خوش تھے کہ میں بحمداللہ خیانت کے جرم سے پاک رہا، ہم میں سے کتنے آدمی ہیں، جو اس معمولی سے معیار تقویٰ پر پورے اتر سکتے ہیں۔

انہوں نے انگریزی کپڑے کبھی نہیں پہنے، ڈپٹی کلکٹری اور انسپکٹری میں بھی اپنی وضع نہیں بدلی، عام طور سے یا سپید چوگوشیہ ٹوپی، یا میرٹھی کام کی ٹوپی اور لمبا کرتا اور اُونچا شرعی پائجامہ اور باہر نکلنے پر اچکن، جاڑوں میں سر پر صندلی صافہ اُن کے گورے چہرے پر بہت زیب دیتا تھا۔

انگریزی طور و طریق سے اُن کو دلی نفرت تھی، ایک دفعہ دہلی میں اُن کے نئے طرز کے ایک دوست نے اُن کو کھانے پر مجبور کیا، ناچار قبول کر لیا، انہوں نے اپنے ہی قسم کے اور احباب کو بھی بلایا، کھانا میز پر چُنا تھا، چھُری اور کانٹے بھی ترتیب سے لگے ہوئے تھے، خواجہ صاحب ٹہلتے رہے، جب لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو خواجہ صاحب مرحوم آگے بڑھے اور جلدی سے اپنی پلیٹ اٹھا کر اس میں چمچہ سے کھانا نکال کر فرش زمین پر بیٹھ گئے، یہ دیکھ کر میزبان صاحب شرمائے اور فوراً صاف فرش بچھایا گیا اور سب نے زمین پر بیٹھ کر بآرام مشرقی طرز سے کھایا، بظاہر یہ ایک سختی معلوم ہوتی ہے، مگر جس کے دل کے اندر اسلام کی اور سنت کی پیروی

عادتِ ثانیہ کے طور پر بیٹھ گئی ہو، اس کو اس کے خلاف کرنے میں کتنی اندرونی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

عام طور پر لوگ کہا کرتے ہیں کہ اسلام ان معمولی معمولی باتوں میں نہیں رکھا ہے، مگر تجربہ شاہد ہے کہ انہی معمولی باتوں میں تسامح اور چشم پوشی بڑھ کر بڑی باتیں بن جاتی ہیں۔

سرِ چشمہ شاید گرفتن بہ میل
چو پُر شد نہ شاید گرفتن بہ پیل

ایک دفعہ وہ شاہدرہ سہارنپور ریلوے پر جو ہنوز کمپنی ہے میرے سامنے بیٹھنے لگے تو اپنے اسباب کو غور سے دیکھا کہ ریلوے کی اجازت سے زیادہ تو نہیں ہے پھر فرمایا میں اس ریل میں خاص طور سے دیکھ لیتا ہوں، گورنمنٹ ریلوے میں تو خیر کچھ تاویل بھی چل جاتی ہے۔

ان کا دوسرا وصف خاکساری اور تواضع ہے، اس بلند منصبی کے ساتھ کبھی ان میں ایک منٹ کے لئے بھی تشخص پسندی نہیں آتی، چپراسیوں کو بھی کھانے میں ساتھ بٹھا لیتے تھے، بازار سے چیز خرید کر اپنے ہاتھ سے اٹھا کر لانے میں تامل نہ تھا۔ تھانہ بھون کے قیام کے زمانہ میں کھانا یا کوئی کھانے کی چیز بے تامل رومال یا دسترخوان میں لپیٹ کر لے آتے تھے، ایک دفعہ میرے لئے اپنی قیام گاہ سے قالین، جانماز اٹھائی، بے تکلف اپنے بغل میں دبا کر خانقاہ لے آئے، وہ اس قسم کے کام جس کو لوگ اپنے لئے توہین اور شرم کی بات سمجھتے ہیں اس بے تکلفی سے انجام دیتے تھے کہ چہرہ پر میل تک نہ آتا تھا، اس سے زیادہ یہ کہ وہ انسپکٹر آف اسکولس ہیں، ساتھ میں متعدد ماسٹر اور اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر ہیں اور وہ چلتے ہوئے خود بازار سے کوئی مٹھائی، یا کھانے کی کوئی چیز خریدتے ہیں اور ان کو کھلاتے ہیں اور خود کھاتے ہیں۔

وہ لوگ جو کوئی بڑی سرکاری نوکری پاکر انگریزی طریق معاشرت، اختیار کر لیتے اور معذوری ظاہر کرتے ہیں کہ اُس کے بغیر اُونچے سرکاری حلقوں میں عزت نہیں ہوتی اور ماتحتوں پر رعب نہیں پڑتا، یہ معذرت محض دل کے تقاضے پر بہانے کا پردہ ہوتی ہے، خواجہ صاحب فرماتے تھے کہ میرے لئے تو یہ سادہ اسلامی شکل وصورت تحقیر کے بجائے عزت کا سامان بن گئی ہے۔ انگریز افسر بھی دیکھ کر عزت کرتے ہیں۔ دیانت دار سمجھتے ہیں اور ہمیشہ میرے کام کو پسند کیا، سرکار نے بے وجہ خان بہادر بنایا، ترقی پر ترقی دی اور کسی موقع پر بھی میری ڈاڑھی اور کرتا میری کسی ترقی میں حائل نہیں ہوا۔

اُن کا تیسرا وصف اُن کی محبت ہے، چھوٹے بڑے ہر ایک سے محبت، ہم ذوق دوستوں سے محبت، اپنے برادرانِ طریقت سے محبت اور اپنے شیخ سے تو وہ محبت جس کا درجہ عشق سے بھی زیادہ اونچا تھا، نوکری کے زمانہ میں دور دور شہروں سے بھی اگر اس قدر بھی آمدورفت کے بعد اُن کو موقع مل سکتا کہ وہ ایک نظر دیکھ لیتے، تو آتے اور ایک نظر دیکھ لیتے اور چلے جاتے اور اگر ایک دو روز قیام کا موقع ملتا تو کیا کہنا، ملازمت کے زمانہ میں نصف تنخواہ پر مہینوں کی چھٹی لے کر آتے اور خانقاہ میں خانقاہی طرز پر بسر کر کے ذکر و اشغال میں مصروف رہتے اور مجلس میں شیخ کے ملفوظات سے لطف اٹھاتے اور استفادۂ باطنی کرتے، ملازمت کے بعد تو گویا وہیں رہ پڑے تھے، خانقاہ کے اوپر مغربی سمت میں ایک کمرہ اپنے لئے خاص کر لیا تھا۔

ایک دفعہ میرے سامنے ابھی دو سال ہوئے، تھانہ بھون میں بیمار ہوئے، قصبہ میں ملیریا اور ٹائیفائڈ کی شدت تھی، خواجہ صاحب بھی بیمار پڑے، میں نے عرض کی کہ دودھ کے سوا کوئی اور غذا نہ کھائیے کہ غذا ہی کی بے احتیاطی سے بخار بگڑ کر سمی ہو جاتا ہے، انہوں نے درخواست منظور کی، بخار کچھ کم ہوا تو گھر جانے کا ارادہ کیا، صبح کے

وقت حضرت والا خلاف معمول خانقاہ تشریف لے آئے، اپنے لئے کھچڑی تیار کرائی تھی، وہ آئی، خواجہ صاحب رخصت ہونے گئے، واپس آئے تو میں نے پوچھا کچھ کھا تو نہیں لیا، فرمایا، میں نے حضرت کے ساتھ کھچڑی کھالی، وہ انشاء اللہ مضر نہ ہوگی، ایسی برکت کی چیز کہاں ملتی ہے، چنانچہ واقعی ان کو مضر نہیں ہوئی، عین رخصت کے وقت میں نے دیکھا کہ خواجہ صاحب بچوں کی طرح دو زانو ہو کر حضرت کے زانو پر سر رکھ کر رو رو کر کہہ رہے تھے کہ حضرت میرے حسن خاتمہ کی دعا فرمائیں اور حضرت تسلی دے رہے تھے۔

اپنے شیخ کا ایک ایک ملفوظ، ایک ایک حکم، ایک ایک نصیحت اُن کو یاد تھی اور اس پر عمل کرتے تھے، خواجہ صاحب بولتے بہت تھے، اُس کے لئے اُن سے بڑے بڑے مجاہدے کرائے گئے، ایک ایک مہینہ کے لئے اُن کو بولنا منع کر دیا گیا اور اس پر انہوں نے عمل کیا، مگر جس دن یہ صوم سکوت ٹوٹتا، اسی دن ساری کسر پوری کر لی، مجلس میں اس پر وہ ہر روز ٹوکے جاتے تھے اور خاموشی سے شیخ کے زجر و تنبیہ کو سُن لیتے تھے، مگر وہ مجبور سے تھے، پھر وہ بول پڑتے تھے، میں نے عرض کی کہ خواجہ صاحب یہ گناہ قصداً کرتے ہیں، تاکہ

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

فرمایا نہیں بھائی میں بیوقوف دیہاتی ہوں۔

حضرت کو بھی اُن سے بدرجۂ غایت انس تھا، رضا اور غضب ہر حال میں وہ اُن پر توجہ فرماتے تھے، وہ ذرا نظروں سے ہٹے، فوراً پوچھا، خواجہ صاحب نہیں ہیں، تنہائیوں میں، خلوتوں میں، جلوتوں میں ہر جگہ وہ ساتھ تھے، اکثر رات کو بھی وہ حضرت والا کی خدمت کے لئے حضرت کی خوابگاہ کے پاس ہی سوتے تھے، حضرت کے مرض الموت میں بھی وہ خدمت گزاری میں مصروف رہے، اُن کے والہانہ انداز کا ایک

نقشہ یہ ہے کہ حضرت کی وفات جو عین اس وقت ہوئی جب خدام نمازِ عشاء کیلئے گئے ہوئے تھے، واپسی میں وفات کی اطلاع ملی، خواجہ صاحب پہنچے تو بے اختیار شیخ کی پیشانی کو یہ کہہ کر بوسہ دیا" واہ رے میرے شیخ! ایک شان سے زندگی گزار دی" ان کو جب بعد کو معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جبینِ مبارک کو وفات کے بعد آکر بوسہ دیا تھا، تو اس توافق اور بیساختگی کی پیروی سے اُن کو بڑی طمانیت ہوئی۔

وہ اپنے شیخ کے قدیم خلفاء میں سے تھے، وہ ــــــــ میں خلافت سے ممتاز ہوئے، متعدد سعادت منداُن سے متعلق تھے، جن کی اصلاح و تربیت کا فرض وہ انجام دیتے تھے، حضرت والا کی وفات کے بعد حضرت والا کے خدام میں ان کی ہستی بڑی محبوب تھی، وہ محبوب کے محبوب سمجھے جاتے تھے، افسوس کہ محبت کی یہ یادگار بھی مٹ گئی، شیخ کے ذکر و اذکار اور اُن کے ملفوظات اور اپنے اشعار سے کوئی مجلس خالی نہیں ہوتی تھی، اسی ضمن میں وہ اپنے دردِ دل کے اظہار اور لوگوں پر اثر ڈالنے والی نگاہ سے وہ بھی غافل نہیں رہتے تھے۔

شاعرِ مجذوب: خواجہ صاحب فطری شاعر تھے، شاعری میں کسی سے تلمذ نہ تھا، وہ صرف تلمیذ الرحمان تھے، اول تو شاعری کا سنجیدہ فطری مذاق اور ذوقِ سلیم اور اس پر تصوف کی چاشنی اور اس میں بھی جگ بیتی نہیں، بلکہ اپنی کہانی، سب مل ملا کر ان کی شاعری اپنے زمانہ کی شاعری کا بے مثال نمونہ تھی، زیادہ تر غزل کہتے تھے۔ غزل کی زبان کے ساتھ خیالات کی لطافت عجیب چیز تھی،

غالباً وہ بچپن سے شعر کہا کرتے تھے، اپنے حال میں ایک جگہ لکھا ہے کہ انگریزی تعلیم کے زمانہ میں اُن کے والد مرحوم اُن کے پڑھنے کے لئے اپنے پاس بٹھاتے تھے اور یہ مناجاتیہ اشعار کی تصنیف میں مصروف رہتے تھے اور فرماتے ہیں کہ الٰہی مناجاتوں

کی بدولت پاس ہوتا چلا گیا۔

خواجہ صاحب پورے شاعر تھے، جب وہ اپنا شعر سنانے پر آتے تھے تو ایک غزل، دو غزل بلکہ بیسیوں غزل سنا ڈالتے تھے، اس کی ان کو کچھ پروا نہیں ہوتی تھی کہ کون سن رہا ہے اور کون داد دے رہا ہے، وہ اپنے اشعار سے آپ لطف اندوز ہوتے تھے اور جھومتے تھے، اہل ادب نے لکھا ہے کہ خطابت اور شاعری میں فرق یہ ہے کہ خطیب کی نظر اپنے اوپر نہیں بلکہ سامعین پر ہوتی ہے اور شاعر کو سامع سے نہیں بلکہ صرف اپنے سے بحث ہوتی ہے، وہ آپ ہی کہتا اور آپ ہی سنتا ہے، وہ اپنی شراب سے آپ مست اور اپنی بانسری پر آپ جھومتا ہے، شاعری کی یہ تعریف پوری طرح اُن پر صادق آتی تھی۔

لکھنؤ کے قیام کے زمانہ میں اکثر شعراء سے دنگل رہے، بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوئے اور ہر جگہ ان کا کلام دوسرے شعراء کی رسائی کے خیال سے بہت اونچا رہتا تھا، وہ اپنی غزل خاص لَے میں پڑھتے تھے، جب وہ پڑھتے تھے تو ایک عالم بندھ جاتا تھا، پُرگو بھی بہت تھے، ایک ایک غزل سو سو شعر کی کہہ ڈالی، حافظہ بھی عجیب تھا، جو کچھ کہا تھا، حافظہ کے خزانے میں تھا، جب اپنی خاص صحبتوں میں شعر پڑھتے تھے، تو ایسے شعروں کے معنی بھی بتاتے جاتے تھے اور اپنی خاص شاعرانہ اصطلاحوں کو بھی بیان کر دیتے تھے، مثلاً دورِ شراب اور گردشِ ایام سے مراد تسبیح، میخانہ سے مراد شیخ کی خانقاہ، مطرب، پیرِ مُغاں، پیرِ میکدہ سے مراد شیخ، ان کے اکثر اشعار حالیہ تھے، یعنی اپنے حال اور اپنی کیفیت کو شاعری کے پردہ میں ظاہر کرتے تھے، اسی طرح تصوف کے مقامات و منازل کو بھی غزل کے رنگ میں بیان کر دیتے تھے۔

مجذوب تخلص بھی شاید شیخ ہی کا بخشا ہوا ہے، پہلے حسن تخلص کرتے تھے۔ حضرت مجذوب کی نسبت اپنے شیخ سے ویسی معلوم ہوتی ہے، جیسی امیر خسرو اور حسن

کی شیخ سلطان الاولیاء رحمۃ اللہ سے، شیخ نے بطور معالجہ کے کبھی کبھی اُن کو شعر کہنے سے بھی روک دیا تھا، مگر وہ اُن کے شعروں کو بہت پسند فرماتے تھے، اُن کے ایک شعر کے متعلق اُن سے فرمایا، خواجہ صاحب اگر میں بادشاہ ہوتا تو آپ کو اس شعر پر ایک لاکھ روپیہ دیتا، مرض الموت میں بھی حضرت والا نے اس شعر کو پڑھا تھا، شعر یہ تھا۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا، اب تو خلوت ہوگئی

صوفیہ کی اصطلاح میں جب تک ہر غیر سے قلبی انقطاع محبت نہ ہو جاتے وصال الٰہی ممکن نہیں۔

محبت کی ردیف میں اُن کی لاجواب غزل یہ ہے:۔

یہ ہوتا ہے رخصت غلامِ محبت — سلامِ محبت، سلامِ محبت
میرے سامنے لو نہ نامِ محبت — چھلک جائیگا ہائے جامِ محبت
سنبھل کر ذرا تیز گامِ محبت — مقامِ ادب ہے مقامِ محبت
ارے اِک نظر اس طرف بھی خدارا — بپاسِ مروت، بنامِ محبت
زباں سے وہ کچھ ہی کہے جائیں مجھ کو — نگاہ دے رہی ہے، پیامِ محبت
چڑھیں دار پر یا چڑھیں طور پر ہم — رسائی سے بالا ہے بامِ محبت
ازل ابتدا ہے، ابد انتہا ہے — نہ صبحِ محبت نہ شامِ محبت
نکلنے کی کوشش میں دونے پھنسو گے — یہ اے حضرتِ دل ہے دامِ محبت
بچا کر کہاں ہائے لیجاؤں دل کو — بچھا ہے دو عالم میں دامِ محبت
خدا تجھ کو مجذوب رکھے سلامت — تجھی سے ہے دنیا میں نامِ محبت

ہنسیں بھی وہ ہنس بھی دو ہاں ہاں چلو بس رُوٹھ چکے

اب ہنسے اب ہنسے، وہ دیکھو ہنسی آتی ہے
اللہ اللہ ترے آتے ہی ہجوم اشکوں کا
حسرتِ دید بھی مشکل سے نکل پائی ہے،

دم یہاں اکھڑا ہوا ہے، نزع کا ہنگام ہے
کیا کہی ہے لو خدا حافظ ہمیں اب کام ہے
دم رکا سمجھو اگر دم بھر بھی یہ ساغر رکا
میرا دورِ زندگی ہے یہ جو میرا جام ہے
یہ معانی یہ حقائق یہ روانی یہ اثر!!
شاعری تیری ہے اے مجذوب یا الہام ہے

ہر چیز میں عکسِ رُخِ زیبا نظر آیا
عالم مجھے سب جلوہ ہی جلوہ نظر آیا
جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا
صد شکر کہ آپہنچا لبِ گورِ جنازہ
لو بحرِ محبت کا کنارا نظر آیا
کھولے ہوئے آغوش بڑھا اس سے میں ملنے
اتنا تھا تصور کہ میں سمجھا نظر آیا
جو دُور لگا ہوں سے سرِ عرشِ بریں ہے
وہ نور سرِ گنبدِ خضرا نظر آیا
مجذوب کبھی سوز کبھی ساز ہے تجھ میں
تو میر کبھی اور کبھی سودا نظر آیا

تصانیف: خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نظم ونثر میں اپنی کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، ایک نظم مسٹر اور مُلا کا مناظرہ ہے، جس میں قدیم وجدید خیالات کی آویزش کی تصویر کشی ہے، ذکر وضرب پر ایک دو نظمیں ہیں، افسوس ہے کہ اُن کا دیوان نہ مرتب ہے اور نہ چھپا، اُن کی بعض غزلیں رسالوں میں چھپی ہیں، معارف

میں بھی کبھی چھپی ہیں، اُن کو نہ نام ونمود کی خواہش تھی اور نہ طبع واشاعت کا اہتمام، خدا کرے کہ وہ ضائع نہ ہوں اور چھپ کر کبھی اہلِ شوق کے ہاتھوں میں پہنچیں۔

اُن کی سب سے بڑی یادگار اشرف السوانح کی تین جلدیں ہیں، جو بظاہر تو اپنے شیخ کے احوال وسوانح ہیں، مگر درحقیقت اُس میں شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے جمیع اصول تعلیم وہدایات ونصائح ووصایا کو اس ترتیب سے جمع کیا ہے کہ وہ سلوک کی بہترین کتاب ہوگئی ہے، اشرف السوانح کا چوتھا حصہ جو شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے آخری حالات اور وفات پر مشتمل ہے، شیخ کی وفات کے بعد بڑے سوز وگداز سے انہوں نے لکھا تھا، وہ ہنوز مسودہ ہے، اُن کی دوسری یادگار اپنے شیخ کے ملفوظات کی تالیف ہے، جو حسن العزیز کے نام سے شائع ہے اور فن کا نادر مجموعہ ہے، اللہ تعالیٰ ان خدمات کے صلہ میں خواجہ صاحب کو مقامِ اعلیٰ نصیب فرمائے۔

سانحۂ وفات: حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی مفارقت کا جو صدمہ اُن کے دل پر تھا، وہ ظاہر ہے کہ اگر وہ ایک ایسے حکیم شیخ کے خالص تربیت یافتہ نہ ہوتے تو عجب نہیں کہ وہ مجذوب سے مجنون ہوجاتے، شیخ کی وفات کے بعد سے اُن کے اندر دو جذبے قوی پیدا ہوگئے تھے، ایک یہ کہ شیخ کے علم اور تعلیم کو جس طرح ممکن ہو پھیلایا جائے اور دعوت الی اللہ دی جائے، دوسرا یہ کہ حضرت شیخ کے اکابر خدام سے مل مل کر طلب کی پیاس کو بجھایا جائے، چنانچہ اس ایک سال کے اندر انہوں نے اپنے وطن میں بہت کم قیام کیا، لکھنؤ، کانپور، ہردوئی، جونپور، اعظم گڈھ، بہرائچ وغیرہ شہروں میں پھر پھر اکر اخوانِ طریقت دوستوں سے ملا کئے، اسی سلسلہ میں ۱۶ر جون ۴۴ء کو مولانا محمد حسن صاحب امرتسری (خلیفہ مجاز حضرت شیخ رحمہ اللہ) کی ہمرہی میں تھانہ بھون سے چند احبابِ طریقت کے ساتھ امرتسر گئے، وہاں جاکر دوسرے ہی روز استفراغ اور بخار شدید میں مبتلا ہوگئے، علاج سے طبیعت درست ہوگئی، مگر نقاہت بہت ہی

زیادہ پیدا ہوگئی تھی، ۵ اگست کو وہاں سے ایک صاحب کے ہمراہ اورنی اپنے وطن تشریف لائے، یہاں پہنچ کر بخار اور حوالی قلب میں درد کی تکلیف شروع ہوگئی، جو آخر وقت تک رہی، بخار کم ہوتا گیا، مگر دفعۃً ۱۶ اگست ۴۲ء کو پھر تمام تکالیف عود کر آئیں اور درد سینہ میں شدت پیدا ہوگئی، ۱۶، اور ۱۷ کی درمیانی شب میں بہت کرب رہا، استغراغ کی زیادتی اور پریشانی کے ساتھ رات بسر کی۔ صبح کچھ طبیعت ٹھیک تھی، مگر تکالیف موجود تھیں، سول سرجن اور ڈاکٹر آئے۔ انہوں نے قوت کے لئے انجکشن لگایا اور کہا کہ آپ کی حالت اچھی ہے، اس پر فرمایا، کہ یہ سب کچھ ہے، مگر میں جا رہا ہوں، پھر اس کے بعد جہاں انجکشن لگا تھا۔ اس ہاتھ سے بغرض طہارت اسپرٹ کو دھونے کے لئے پانی منگوایا اور باوجود اصرار کے خود ہی اپنے ہاتھ سے دھونا چاہا، دھو چکے تھے، اور ابھی ہاتھ سے پانی سُوت رہے تھے کہ حالت دفعۃً غیر ہوگئی، چت لیٹ گئے اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں، تجہیز و تکفین اور تدفین اسی شہر اورنی میں عمل میں آئی، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ماشاء اللہ ان کی قبر پر نور سا برستا معلوم ہوتا ہے۔

نہ مجذوب سا کوئی دنیا میں دیکھا
تمامِ جنون و تمامِ محبت

مولانا فضل الرحمٰن صاحب ندوی کیرانوی

علمائے ندوہ کی برادری میں یہ خبر بڑی افسوس کے ساتھ سُنی جائے گی کہ اُن کے سب سے پُرانے رفیق اور دوست مولانا حافظ فضل الرحمٰن صاحب ندوی امام وخطیب جامع مسجد خانقاہ مجددیہ سرہند نے چند ماہ کی علالت کے بعد بمرض استسقاء بمقام مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ بتاریخ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۴ء بروز جمعہ ۷ بجکر ۴۳ منٹ شام کے وقت اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، اُن کی عمر غالباً ۶۵ برس کے اندر ہوگی، کیرانہ ضلع مظفر نگر اُن کا اصلی وطن تھا، مگر بچپن سے وہ لکھنؤ آئے اور دارالعلوم ندوہ میں داخل ہوکر متوسطات تک کی تعلیم پائی اور فکر معاش سے مجبور ہوکر مدرسہ ہی میں صرف ونحو کی مدرسی کی خدمت قبول کرلی، وہ استاذنا جناب مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی مدرس اعلیٰ دارالعلوم کے محبوب شاگردوں میں تھے، صرف ونحو اور ریاضیات سے بڑی دلچسپی اور مہارت رکھتے تھے، انتظامی سلیقہ بھی اچھا تھا جن لوگوں کو مولانا شبلی مرحوم کے زمانہ کے ندوہ اور الندوہ سے تعلق رہا ہے ان کو مکتبۃ المعین کی بھی یاد ہوگی، مرحوم اس مکتبہ کے مہتمم اوّل تھے، لکھنؤ میں عربی کی مصری مطبوعات کی تجارت کا آغاز انہی نے کیا اور اب موجودہ شبلی بکڈپو اسی کی یادگار ہے۔

مرحوم نے عین جوانی میں انابت الی اللہ کی توفیق پائی اور مدرسہ کی نوکری چھوڑ کر مولانا عین القضاۃ صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ سے نقشبندی مجددی طریقہ میں بیعت کی اور انہی کے مدرسۂ فرقانیہ میں مدرس بھی ہوگئے اور پھر انہی کے ہو رہے،

انہی کے زمانہ میں حج سے بھی فراغت پائی، ان کی وفات کے بعد لکھنؤ سے سرہند جاکر خانقاہ مجددیہ کی جامع مسجد میں خطابت وامامت قبول کی آخر میں اس کا معاوضہ چھوڑ کر جستہ للہ اس کام کو انجام دیتے رہے اور متوکلانہ زندگی بسر کرتے تھے، اس سلسلہ میں سارے متوسلین جو افغان سے گجرات تک پھیلے ہیں اُن سے اچھی طرح واقف تھے اور مداح تھے، قناعت پسند زہد پیشہ، بھر بذلہ سنج، ہمیشہ بہار اور شادان وفرحاں رہتے تھے، دوستوں کی دوستی میں بیحد پائدار اور مخلص تھے، قیام ندوہ کے زمانہ میں مولانا شبلی مرحوم کے اکثر حسابات کی رقمیں انہی کے پاس رہتی تھیں اور اسی سلسلہ سے مکاتیب میں کہیں کہیں نام بھی ہوگا۔

مرحوم نے اپنے دو بچوں میں سے بڑے کو جن کا نام مولوی محبوب الرحمٰن ہے، ابتدائی تعلیم ہندوستان میں دلاکر مدرسۂ صولیتہ مکہ معظمہ میں بھیج دیا، جہاں وہ کئی سال رہ کر علوم درسی سے فراغت پاکر مزید تکمیل کی غرض سے جامع ازہر مصر چلے گئے، وہاں دو سال رہ کر قدیم وجدید علوم فلسفۂ وتاریخ وادب ودینیات کی تعلیم پائی اور دو سال ہوئے کہ شام وعراق ہوکر ہندوستان واپس آئے اور اس وقت سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کو صبر وثبات عطا فرمائے اور اپنے باپ کا حقیقی جانشین بنائے۔

اکتوبر ۱۹۳۴ء

چودھری خوشی محمد ناظر مرحوم

کشمیر جنت نظیر کا ایک پھول یکم اکتوبر ۱۹۴۴ء کی رات کو مرجھا کر گر گیا یعنی چودھری خوشی محمد ناظر نے اس تاریخ کو بعارضۂ فالج وفات پائی۔

آج کل کے نئے نرالے ادیب، نئے ادب کے نقیب یہ سمجھتے ہیں کہ وہی اپنے زمانہ کے نئے نرالے ہیں، حالانکہ نیا اور پرانا ہونا ہمیشہ اسی طرح ہوتا آیا ہے جس طرح جوان اور بوڑھا ہونا، اب اگر کوئی آج کا جوان یہ سمجھے کہ دنیا میں وہی پہلی مرتبہ جوان ہوا ہے تو وہ کیسا احمق ہے، اسی طرح آج کے نئے ادیب و شاعر جو ادب کو زندگی سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں، اگر وہ یہ سمجھیں کہ وہی پہلی دفعہ یہ راگ الاپ رہے ہیں تو اُن کے اس خیال کو حماقت کہتے ہوئے تو ڈرتا ہوں، مگر پھر کیا کہوں۔

آج جس مرحوم کی یاد کے مزار پر دو آنسو بہانا چاہتا ہوں وہ کبھی اپنے دور میں نیا اور نرالا شاعر تھا اردو ادب کے تجدیدی دَور میں بیسویں صدی کا پہلا سال ۱۹۰۱ء اس حیثیت سے یادگار ہے کہ شیخ عبدالقادر کے مخزن کا جلوس انگریزی و عربی خوانوں کے جلو میں اسی سال سے نکلا تھا، اسی رسالہ نے اقبالؔ کے نام کو اچھالا، خوشی محمد ناظر کو پبلک میں پیش کیا، اسی میں ابوالکلام کا پہلا مضمون اخبار چھپا، حسرت موہانی نے شعر و ادب پر دادِ سخن پہلے اسی میں دی، خود راقم الحروف کا پہلا مضمون ''وقت'' اسی میں شائع ہوا اور اس زمانہ کے کتنے بوڑھے ادیب و شاعر سب سے پہلے اسی کے صفحات پر ظاہر ہوتے۔

ناظر کا وطن پنجاب میں لائلپور کے ضلع میں چک جھمرا ایک گاؤں تھا، ابتدائی اور ثانوی تعلیم دیہات کے سرکاری مدرسہ میں پائی، مگر ساتھ ہی اپنے گاؤں کے فارسی مکتب میں پڑھتے رہے اور اس لئے بچپن ہی سے شاعری اور وہ بھی فارسی شاعری سے دل کو لگاؤ پیدا ہوا، انہوں نے اپنی پہلی نظم ۱۸۸۱ء میں حضرت پیران پیر شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مدح میں لکھی، جس کا پہلا مصرعہ یہ تھا۔

بلبل طبعم بہ باغ وصف تو پرواز کرد

جس کو اُن کے استاذ اولین مولوی انوارالدین صاحب انور نے یوں بدل دیا۔

بلبلِ طبعم بہ باغِ وصفِ تو رنگین نواست

اس کے بعد اسی زمانہ میں چند فارسی غزلیں بھی کہیں، جب وہ مڈل میں پہنچے تو مولوی محمد حسین صاحب آزاد کی آب حیات اور بعض اردو دیوان ان کی نظر سے گزرے، جس سے اُن کو اردو میں غزل کہنے کی تحریک ہوئی، ان کی پہلی غزل کا مطلع یہ تھا،

کیا ان دنوں نگاہ ستمگر ہے تیز تیز
تیر نظر کی چوٹ دلوں پر ہے تیز تیز

کالج کی تعلیم کے لئے یہ غالباً ۱۸۹۵ء کے پس وپیش زمانہ میں علی گڑھ آئے یہ وہ وقت تھا، جب مولانا شبلی وہاں فارسی عربی کے استاذ اور وہاں کے شعر وسخن کی محفل کے صدر نشین تھے اور مولانا حالی بھی اکثر آکر وہاں قیام فرمایا کرتے تھے، ناظر کو گو اُن سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا، مگر اُن کی شاعری کو مناسبت مولانا حالی سے ہوئی اور انہی سے اصلاح لی، کالج میں اس وقت پروفیسر آرنلڈ کی تحریک سے نیچرل شاعری پر طبع آزمائی کی خاص تحریک تھی، چنانچہ ناظر نے یہاں "اخوت اور چہار موسم" کے نام سے دو نظمیں کہیں اور دونوں پر انعام پایا، اس کے بعد کالج کے یونین اور ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں نظمیں پڑھتے رہے اور داد پاتے رہے، علی گڑھ سے واپسی کے

بعد پنجاب میں حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے۔

اُن کی خوش نصیبی کہ اُن کی قسمت میں کشمیر کا خطہ آیا، ریاست کشمیر کی سرکاری خدمت پر مامور ہوئے اور لداخ کے گورنر اور منسٹر بندوبست و مال ہو کر بڑا حصہ کشمیر میں گزارا، یہاں کی فرح بخش آب و ہوا اور قدرتی مناظر نے ان کو اپنی شاعری کے لئے بہترین مواقع فراہم کئے، چند اصحاب ذوق دوستوں کے شمول میں مفرح القلوب نام ایک چھوٹی سی مجلس ترتیب دی، جو کشمیر کے مختلف باغوں میں جمع ہوتی، جس میں شعر و سخن کے ترانے بلند ہوتے، یہ مجلس سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۰۶ء تک قائم رہی، یہی زمانہ مخزن کے عروج اور ناظر کے فروغ کا ہے، یہی زمانہ ہے جس میں ناظر نے اپنی وہ مشہور نظم لکھی جس کا نام "جوگی" ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ چھوٹی سی نظم ناظر کا شاہکار ہے، جسکو پڑھے ہوئے گو چالیس برس سے زیادہ ہو چکے، مگر اس کا سماں اب تک آنکھوں میں ہے، مطلع تھا۔

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا

یہ نظم اس زمانہ میں ہر صاحب ذوق کی زبان پر تھی اور جس طرح مولانا حالی نے اپنے مسدس کا پیوند جو چند سال کے بعد جوڑا وہ اصل سے میل نہ کھا سکا، اسی طرح حق یہ ہے کہ ناظر نے اپنی اس نظم کا ایک تتمہ تیس برس کے بعد جو لکھا وہ اصل سے بے میل ہی رہا، مرحوم کی دوسری نظم کشمیر کے ایک مرقع کی تصویر ہے، جو مناظر کشمیر کے متعلق ان کی پہلی نظم ہے، اسی کا مطلع ہے۔

اللہ اللہ ہے کیا حسنِ چمن پانی میں	سبزۂ لالہ وگل، سرو و چمن پانی میں
کیسے کیسے ہیں دل افروز نظارے اسمیں	کوہ پانی میں، چمن پانی میں، بن پانی میں

یہ پوری نظم اسی طرح پانی میں کی مشکل ردیف کے باوجود نہایت سہل و رواں ہے۔

دوسری نظم دریائے تلودری ہے اور حقیقت یہ ہے کہ منظر کشی کی شاعری کا کامیاب نمونہ ہے۔

کیا آب وتاب تجھ میں نہر تلودری ہے
پربت کی تو ہے دیلوی یا قاف کی پری ہے

سر سید اور حالی کے مرثیے بھی لکھے، مطائبات اور غزلیں بھی، مگر مناظر قدرت کی تصویر کشی میں اُن کے قلم کی جولانی اُردو میں بے مثال ہے، ماشاء اللہ ان کا دل یادِ حق سے بھی زندہ تھا، عشقِ الٰہی اور عشقِ نبوی سے بھی خالی نہ تھے۔

ترے در پہ خالقِ ذوالمنن جو میری جبین نیاز ہو
مجھے بیکسی پہ غرور ہو، مجھے بے نوائی پہ ناز ہو،
میری یاس کی شبِ تار میں مرے غم کے گرد وغبار میں
ترا لطف چارہ نواز ہو، ترا نور جلوہ طراز ہو
مرا روز جلوہ فروز ہو، ترے رُخ کے نورِ جمال سے
مری شب کی محفلِ اُنس میں تری بوئے زلف دراز ہو

میری اُن کی پہلی ملاقات یاد نہیں کب ہوئی، اور کہاں ہوئی، تاہم یہ یاد ہے کہ مولانا شبلی مرحوم کے تعلق سے محبت اور شفقت سے پیش آئے اور آخری ملاقات ابھی چند سال ہوئے حمایت اسلام لاہور کے جلسہ سالانہ میں ہوئی، لمبا قد، چھریرا بدن، بدن پَرلوٹ، سر پر پنجابی صافہ، داڑھی فرنچ کٹ، مونچھیں بڑی، مزاج میں کسی قدر کم سخنی اور کم آمیزی، بڑھاپے کا اثر نمایاں۔

ان کی نظموں کا مجموعہ "نغمۂ فردوس" کے نام سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا، اس کے مقدمہ کے طور پر کچھ اپنے حالات بھی لکھے تھے، مگر وہ حصہ چھپنے سے رہ گیا، شاید اب کسی کو توفیق ہو، اُن کی عمر انتقال کے وقت ستر سے کم نہ ہوگی۔

اللہ تعالیٰ اس نغمۂ فردوس کے مصنف کو فردوسِ بریں میں جگہ دے، ان کی نظمیں اُن کے مومن دل کی پوری شہادت دیتی ہیں، غالباً سلسلۂ چشت سے دل کا تعلق تھا چنانچہ کہتے ہیں:۔

مرا حَسْبِیَ اللہ حصار ہو، میرا لَا تَخَفْ پہ قرار ہو
ہو مرا مقام بلند تر، جو کمند فتنہ دراز ہو
تجھے ناظرؔ اتنی ہو فکر کیوں، غم و اضطراب کا ذکر کیوں
ترے فکر کار میں رات دن جو ترا غریب نواز ہو

مرنے والے کے دو چار شعر اور سن لیجئے:

ہم پرستارِ خدا ہیں، ہم خدا کے ساتھ ہیں
ہر گھڑی، ہر لحظہ اور ہر دم خدا کیساتھ ہیں
سازِ فطرت ہے ہمارا عشق سے رنگیں نوا
نغمہ ہائے دل کے زیر و بم خدا کے ساتھ ہیں
ایک پیمانہ سے سب کو کر دیا مستِ الست
عہد و پیمانِ ازل محکم خدا کے ساتھ ہیں
پرتوِ مہر ازل میں ہست و بود اپنی ہے گم
ہم مثالِ قطرۂ شبنم خدا کے ساتھ ہیں،
دشتِ حرماں میں ہے نامحرانِ کوئے دوست
اور حریمِ عشق کے محرم خدا کے ساتھ ہیں
سرنگوں قعرِ مذلت میں ہے باطل پرست
اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کے پرچم خدا کے ساتھ ہیں
شش جہت میں ساری وسائے ہے نورِ لم یزل
صد ہزاراں عرصۂ عالم خدا کے ساتھ ہیں
چپکے چپکے کان میں یہ کہہ رہا ہے دل، کہ ہم
لِیْ مَعَ اللہ ہر نفس ہر دم خدا کیساتھ ہیں
ذرہ ہو خورشید تاباں سے بھلا کیونکر خدا
ہم خدا کے ساتھ تھے اور ہم خدا کیساتھ ہیں

منزلِ ہستی پہ ناظرؔ کاروانِ عشق کے
سب نشاط و عیش و رنج و غم خدا کیساتھ ہیں

اللہ تعالیٰ خدا کی معیت کے اس مشتاق کو آخرت میں اپنے صالحوں کی معیت نصیب فرمائے۔

ضیاء الحسن علوی مرحوم

افسوس کہ میرے رفیق قدیم اور صدیق حمیم مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی نے ایک مختصر علالت کے بعد ۱۴ جون ۱۹۲۵ء کو الہ آباد میں جہاں وہ عربی مدرسوں کے انسپکٹر اور مشرقی امتحانوں کے رجسٹرار تھے، ستاون برس کی عمر میں وفات پائی، اس حادثہ کی اطلاع مجھے ۱۸ جون کو لکھنؤ میں اسی مدرسہ میں ملی جہاں میں اور مرحوم مل کر ایک جان دو قالب ہوتے تھے، افسوس کہ ایک قالب خالی ہوگیا اور دوسرا نیم جان موجود ہے، مرحوم مجھ سے عمر میں تقریباً پانچ برس چھوٹے (گو تعلیم کے درجہ میں وہ ایک سال بڑے تھے) اس لئے بظاہر امید یہی تھی کہ انہی کو میری جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑے گا، مگر تقدیر یہی تھی کہ مجھے اُن کے فراق کا غم سہنا پڑے، اس لئے امید غلط ثابت ہوئی اور تقدیر کا فرمان نافذ ہو کر رہا۔

اکنوں چہ تواں کرد کہ تقدیر چنیں بود

مرحوم کاکوری ضلع لکھنؤ کے مشہور علوی خاندان کے چشم و چراغ تھے، دار العلوم ندوۃ العلماء کے حامیوں بلکہ بانیوں میں رؤسا کا جو طبقہ شامل تھا، ان میں منشی محمد اطہر علی صاحب مرحوم کا نام بہت جلی ہے، یہ خاندان قطب وقت حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ارادت مند و معتقد تھا، جو ندوہ کی تحریک کے روحانی مرکز و مدار تھے، اس لئے جب ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۸ء میں لکھنؤ میں ندوہ کا دار العلوم کھلا تو منشی صاحب مرحوم نے اس درسگاہ کو اپنے سب سے چھوٹے بچے اور ایک ننھے بھتیجے

کو نذر کیا، یہی ننھا بھتیجا مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی تھے، دارالعلوم کے طلبہ کے داخلے میں ان کا نمبر شاید دوسرا تیسرا تھا، عربی کی پوری تعلیم یہیں حاصل کی اور یہیں سے فراغت پائی۔

یوں تو دارالعلوم کے سارے اساتذۂ وقت مولانا حفیظ اللہ صاحب، مولانا عبدالشکور صاحب (ایڈیٹر النجم) اور مفتی عبداللطیف صاحب سب ہی سے تعلیم پائی تھی، مگر جس کی تعلیم نے اُن کے لوحِ دل میں علم وفن کے ذوق کا نقشِ اولین بنایا، وہ دارالعلوم کے صدر مدرس مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی تھے، وہ ادب اور معقولات کے امام تھے، اور یہی دونوں فن مرحوم کی گھٹی میں پڑے اور عمر بھر انہی سے اُن کو ذوق رہا۔

۱۹۰۴ء میں مولانا شبلی مرحوم حیدرآباد سے جب لکھنؤ دارالعلوم میں پہلے پہل آئے تو جو طلبہ اُن کے حلقہ میں پہلے بیٹھے، اُن میں سب سے پہلا نام مولوی ضیاء الحسن مرحوم کا ہے، چنانچہ مولانا کی مردم شناس نگاہ نے اُن کے ذوق اور استعداد کو تاڑ لیا، مولانا کے حیدرآباد واپس چلے جانے کے بعد مرحوم نے جو سب سے پہلا خط اُن کو لکھا، اس کا جواب مکاتیبِ شبلی کی دوسری جلد میں موجود ہے، خط[1] کے آخر میں ہے۔

> میں چاہتا ہوں کہ چند روز تک آپ کا اور میرا ساتھ رہتا تاکہ میں ادب اور فلسفہ کی بعض کتابیں آپ کو پڑھاتا اور مضمون نگاری کی بھی تعلیم دیتا، دیکھئے کب خدا موقع لاتا ہے۔ (شبلی ۴ جنوری ۱۹۰۴ء)

اس کے بعد جون ۱۹۰۵ء میں ندوہ تشریف لے گئے اور جس موقع کا انتظار تھا، وہ جلد مل گیا، مرحوم کے بعد اس طلب میں اُن کا دوسرا رفیق سفر راقم الحروف تھا، ہم دونوں نے حضرت الاستاذ کے سامنے زانوئے ادب تہ کئے اور علم کلام، معقولات اور اعجاز القرآن کے اسباق شروع ہوئے، مرحوم مجھ سے زیادہ دلیر اور بے تکلف تھے،

---

[1] مکاتیبِ شبلی کی دوسری جلد میں بسلسلۂ تلامذہ اُن کے خطوط شامل ہیں۔

وہ پرائیویٹ صحبتوں میں بھی شریک ہوتے تھے اور ہر روز علم کا نیا فیض حاصل کرتے تھے، اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد ندوہ ہی میں مولانا کے پاس مقیم تھے، مولانا حمید الدین صاحب مصنف نظام القرآن بھی آیا کرتے تھے اور ہفتوں ندوہ میں رہا کرتے تھے، مولانا عبداللہ عمادی ایڈیٹر البیان بھی لکھنؤ میں مقیم اور اکثر صحبتوں میں شریک ہوتے تھے، خواجہ غلام الثقلین بھی آتے رہتے تھے، مرحوم ان لوگوں کے ساتھ بے تکلف ملتے جلتے تھے اور اس خوانِ ادب سے بہرہ ور ہوتے تھے۔

مرحوم کو جدید علوم کے حصول کی طرف میلان مرزا ہادی صاحب رسوا، (سابق عربی پروفیسر کرسچین کالج لکھنؤ) کی صحبتوں اور ملاقاتوں سے ہوا، وہ عربی کے عالم، انگریزی کے گریجویٹ اور جدید فلسفہ اور ریاضیات کے ماہر تھے، آخر میں دارالترجمہ عثمانیہ سے متعلق ہو کر فلسفہ کی متعدد کتابیں اردو میں ترجمہ کیں، مولانا شبلی نے ایک دفعہ اُن کو مدرسہ میں ہم چند طلبہ کو جدید فلسفہ پڑھانے کے لئے مقرر کیا تھا، مگر وہ بڑے لاأبالی تھے، چند سبق سے زیادہ کا معاملہ اُن سے نہ چل سکا۔

بہرحال مرحوم نے ۱۹۰۵ء میں عربی تعلیم سے فراغت پائی اور ۱۹۰۶ء کے مشہور جلسۂ دستار بندی میں میرے ساتھ ہی اُن کی بھی دستار بندی ہوئی، اس جلسہ میں انہوں نے اعجاز القرآن کے موضوع پر ایک عالمانہ تقریر کی تھی، جو بعد میں مرتب ہو کر الندوہ میں شائع ہوئی اور مدح و تعریف کی مستحق ہوئی۔

مرحوم کو اردو ادب کا ذوق فطرۃً تھا، گھر کا ماحول مشاہیر نظم و نثر کی اُن کے ہاں آمد و رفت، پیارے صاحب رشید اور مرزا رسوا جیسے نظم و نثر کے ادیبوں سے اُن کے مراسم تھے اور پھر بچپن سے لکھنؤ کی سکونت، ان سب کا یہ اثر تھا کہ وہ اردو روزمرہ کے جان دادہ تھے، شعر بھی کہتے تھے، مگر صرف اپنے لئے، علمی مضامین تو حضرت الاستاذ مرحوم کی پیروی میں لکھتے تھے، مگر عام انداز تحریر شوخ و شگفتہ روزمرہ کی

بول چال کا تھا۔

مرحوم کا پہلا مضمون "صحت اور عمر کی درازی" ہے جو المقتطف مصر کے ایک مضمون کا ترجمہ تھا اور رسالہ الندوہ ۱۹۰۵ء میں چھپا، اس کے بعد دوسرے مضامین لکھے، جو الندوہ ہی میں چھپا کئے، اُن کا ایک ابتدائی ادبی مضمون اردوئے معلّٰی علی گڑھ میں چھپا، خواجہ غلام الثقلین ان دنوں دارالعلوم کے پاس ہی ایک مکان میں رہتے تھے اور اسلامی کانفرنس علی گڑھ کے صیغہ اصلاح و تمدّن کے سکریٹری تھے اور اس تعلق سے وہ عصر جدید نام ایک رسالہ نکالا کرتے تھے، خواجہ صاحب کے تقاضے اور اصرار سے اس میں بہت سے اصلاحی مضمون لکھے اور وہ چھپے۔

مرحوم نے عربی سے فراغت پا کر انگریزی کی طرف توجہ کی جس کا آغاز لکھنؤ میں ہو چکا تھا، مگر انجام علی گڑھ میں ہوا، ۱۹۰۹ء میں وہاں سے میٹرک پاس کیا، حضرت الاستاذ نے مبارک باد لکھی۔

"مبارک، تمہارے پاس ہونے سے بیحد خوشی ہوئی اور تمہاری نسبت حسن ظن بڑھ گیا .... اب تم ضرور کالج میں پڑھو گے، الندوہ میں تم پر نوٹ دوں گا"

۱۹۰۹ء میں وہ کالج میں داخل ہوئے اور ۶ برس میں ایم اے تک تعلیم پائی، اس زمانہ میں عربی کے پروفیسر یوسف ہارویز نام ایک جرمن فاضل تھے، جنہوں نے طبقات ابن سعد کے بعض اجزا کی تصحیح کی اور جو علی گڑھ میں ۱۹۱۴ء کی گزشتہ جنگ عظیم کے شروع تک رہے اور اس کے آغاز ہی میں قید ہو کر بعد میں جرمنی واپس چلے گئے تھے، مرحوم کالج میں پہنچ کر اُن کے حلقہ میں داخل ہوئے اور اُن پر ایسے چھا گئے کہ اُن کے جزو کل پر حاوی ہو گئے، اُن سے مستشرقین کے معلومات حاصل کئے، کچھ جرمن زبان اور کچھ عبرانی زبان کے سبق پڑھے، مولانا شبلی اور پروفیسر ہارویز

کے درمیان ربط وضبط کا واسطہ مرحوم ہی تھے۔

۱۹۱۶ء میں غالباً انہوں نے ایم اے پاس کیا، اس وقت یو پی کی گورنمنٹ عربی مدارس کی نگرانی کے لئے ایک انسپکٹر کے تقرر پر غور کر رہی تھی، مرحوم سے بڑھ کر اس کام کے لئے دوسرا موزوں نہیں ہوسکتا تھا، وہ ایک طرف ٹھیٹھ مولوی اور دوسری طرف ممتاز گریجویٹ تھے، چنانچہ ۱۹۱۷ء میں وہ عربی مدرسوں کے انسپکٹر مقرر ہوئے اور اسی عہدہ پر اخیر تک قائم رہے، ابھی اسی جولائی میں وہ قید ملازمت سے چھوٹنے والے تھے کہ اس سے چند روز پہلے قیدِ حیات ہی سے آزاد ہو گئے۔

مرحوم نے عربی نصاب اور اردو، فارسی اور عربی کے سرکاری امتحانات کی اصلاح اور ترقی میں بہت بڑا کام کیا ہے، جب وہ اس عہدہ پر فائز ہوئے تھے تو نام کے سوا اس صیغہ میں کچھ اور نہ تھا، لیکن انہوں نے چند برس کے اندر اپنی محنت، لیاقت اخلاق اور محبت سے چالیس پینتالیس مدرسوں کو اپنا ہمنوا بنایا اور اصلاح نصاب کا وہ خاکہ جو استاذ مرحوم صرف ندوہ کی حد تک کھینچ سکتے تھے اُن کے لائق شاگرد کے ہاتھوں وہ پورے صوبہ کے دائرہ میں وسیع ہو گیا۔

مرحوم کو کتابوں کا بہت شوق تھا، وہ خود بھی ہر قسم کی علمی کتابیں عربی اور انگریزی کی خریداری کرتے تھے، اُن کا مطالعہ برابر جاری رہتا تھا اور اہل علم دوستوں سے مسائل علمیہ پر مباحثہ کرتے تھے۔

اُن کی قلمی یادگار وہ چند ابتدائی مضامین ہیں، جو الندوہ میں چھپے، یا اسلامی جنگی جہازوں پر اُن کا وہ مضمون ہے جو ۱۹۱۰ء کے قریب علی گڑھ منتھلی میگزین میں چھپا اور حضرت الاستاذ کی پسند سے انعام کا مستحق ہوا، اسی طرح علم جدید کے اصلاحی مضامین بھی ہیں، جو کبھی ان کے نام سے اور کبھی بے نام چھپے، آخر میں ان کا طویل مضمون "جو یاد ایام" کے عنوان سے جدید الندوہ میں ۱۹۴۱ء کے آٹھ نو نمبروں میں شائع ہوا تھا، ذکر کے قابل

ہے، یہ گویا اُن کی آپ بیتی ہے، جس میں جگ بیتی کے بہت سے دلچسپ مناظر شامل ہیں، اس مضمون میں لکھنؤ کی زبان کا مزہ اور چٹخارہ ایسا تھا کہ سب اہل ذوق نے اس کو بیحد پسند کیا، افسوس کہ یہ کہانی ناتمام رہی۔

اُن کو ادب سے فطری ذوق تھا، الف لیلۃ جو عربی داستان سرائی کی بیمثال کتاب سمجھی جاتی ہے، اُس کے اردو ترجمہ کی امنگ اُن کے دل میں ایک مدت سے تھی، چنانچہ انہوں نے ایک زمانہ سے اس کام کو شروع کر رکھا تھا، اس ترجمہ میں اس کا بھی خاص اہتمام تھا کہ عربی شعروں کا ترجمہ اُردو ہی شعروں میں ہو، معلوم نہیں یہ چیز کہاں تک پہنچی، سبعہ معلقہ میں سے امراء القیس کے قصیدہ کا ترجمہ اردو نظم میں کیا تھا۔

وہ دارالمصنفین کے رکن تھے اور استاد مرحوم کی نسبت سے اس سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے، ان کی فرمائش سے ہمارے فاضل رفیق مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے امام رازی کی سوانح عمری اور اُن کے فلسفہ پر تبصرہ کا کام انجام دیا، میں نے مناسب سمجھا کہ اس پر مرحوم سے ایک مقدمہ لکھوایا جائے جس میں امام رازی کے فلسفہ کو یورپ کے فلسفیوں کی نگاہ سے دیکھا جائے اور موازنہ کیا جائے، افسوس کہ ان کی موت سے یہ کام بھی ناتمام رہ گیا۔

مرحوم کا بچپن مذہبی وصوفیانہ ماحول میں گزرا تھا، اس لئے با ایں ہمہ ان پر یہ اثر غالب تھا، طالب علمی ہی میں حضرت مولانا شاہ ابو احمد صاحب مجددی بھوپالی (مرید شاہ عبدالغنی صاحب مجددی مہاجر) سے لکھنؤ میں بیعت کی تھی، جو اس وقت اتفاق سے لکھنؤ آگئے تھے اور میں نے بھی ملا مبین کی مسجد میں ان کی زیارت کی اور بھوپال میں تو کئی دفعہ حاضری کا اتفاق ہوا، چونکہ میرے بڑے بھائی صاحب مرحوم بھی انہی سے بیعت تھے اور خلافت سے ممتاز تھے، اس لئے مرحوم ضیاء الحسن سے میری محبت کی نسبت میں اس نئے رشتے سے اور مضبوطی پیدا ہوگئی، حضرت شاہ صاحب کی وفات

کے بعد مرحوم نے حضرت شاہ نجم الدین صاحب فتحپوری سے تعلق پیدا کیا، جن سے وہ بچپن سے واقف تھے، کیونکہ دارالعلوم ندوہ کا افتتاح انہی کے مبارک ہاتھوں سے ہوا تھا، اُن کی وفات کے بعد ایک اور بزرگ کی طرف انہوں نے رجوع کیا، جو غالباً کہیں آگرہ کے قریب کے تھے، مولانا شاہ ابوالخیر صاحب مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی کبھی کبھی حاضری دی ہے، ذکر و فکر و اشغال میں بھی مصروف رہتے تھے اور اُن کے برکات دوستوں میں کبھی کبھی بیان کرتے تھے۔

افسوس کہ میرے تعلیمی عہد محبت کا یہ نخل بار آور عمر کی ستاون بہاریں دیکھ کر اب ہمیشہ کے لئے مرجھا گیا، حضرت الاستاذ نے بھی عمر اتنی ہی پائی تھی، ستاون برس کی عمر کے حساب سے ۱۸۸۸ء یا ۱۸۸۹ء کی پیدائش ظاہر ہے۔

وَكُنَّا كَنَدْمَانَىْ جَذِيمَةَ حِقْبَةً   مِنَ الدَّهْرِ حَتّٰى قِيلَ لَنْ يَتَصَدَّعَا

ہم دونوں ایک مدت تک بادشاہ جذیمہ کے دو مصاحبوں کی طرح ایک ساتھ رہے یہاں تک کہ کہا گیا کہ اب یہ الگ نہ ہوں گے۔

فَلَمَّا تَفَرَّقْنَا كَأَنِّي وَمَالِكًا   بِطُولِ اِجْتِمَاعٍ لَمْ نَبِتْ لَيْلَةً مَعًا

پھر جب ہم الگ ہو گئے ہیں تو میں نے اور مالک نے طول اجتماع کے ہوتے ہوئے بھی گویا ہم نے ایک رات بھی ایک ساتھ نہیں گزاری۔

مرحوم کی دو شادیاں ہوئی تھیں، پہلی بیوی سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی، دونوں بالغ ہیں، لڑکے کا نام حسن ہے جو اس سال بی۔ اے، بی۔ ٹی ہوئے ہیں اور ادبی ذوق میں اپنے باپ کی یادگار ہیں، دوسری بیوی سے چند بچے ہیں اور سب چھوٹے اور کم سن۔

اللہ تعالیٰ مرنے والے کی قبر پر رحمت کے پھول برسائے۔

درویش شاعر

جلیل القدر نواب فصاحت جنگ جلیل رحمہ اللہ تعالیٰ

یکم صفر ۱۳۶۵ھ مطابق ۷ر جنوری ۱۹۴۶ء کو مشہور شاعر استاد حضرت جلیل نے پچاسی برس کی عمر میں حیدر آباد دکن میں داعی اجل کو لبیک کہا، اللہ تعالیٰ اس درویش شاعر کو اپنی داد رحمت سے شاد فرمائے۔

اللہ اللہ! زمانہ کی نیرنگیاں کیا کیا انقلاب دکھاتی ہیں، بچہ جوان، جوان بوڑھا، اور بوڑھا راہِ عدم کا مسافر ہوتا ہے، انگریزی کی بیسویں صدی کا پہلا سال تھا جب میری عمر ۱۶، ۱۷ برس کی ہوگی کہ میں دار العلوم ندوہ لکھنؤ میں داخل ہوا، شعر و سخن کا چسکا تکتی بیت بازی کے سبب سے پہلے سے تھا، اب لکھنؤ آیا، جہاں کے ذرہ ذرہ کے خمیر میں شعر و سخن کا عنصر ہے، مدرسہ میں بھی اس وقت طالب علم مشاعرے کرتے تھے اور غزلیں پڑھتے تھے، تجمل شاہجہاں پوری، سید ظہور احمد ناجل شاہجہاں پوری (جو بعد کو وحشی شاہجہانپوری ہو گئے تھے) دانا سہسرامی (حکیم رکن الدین دانا ندوی) مصطفےٰ ملیح آبادی صدیق حسن، اثر مانکپوری، شرر بہادی (مولوی عبد الغفور شرر) اور یہ خاکسار اس میں پوری دلچسپی لیتے تھے، یہ وہ زمانہ تھا، جب امیر و داغ کے زمزمول سے ہندوستان پر شور تھا اور خاکسار کا میلان امیر مرحوم کی طرف تھا اور اُن کا دیوان مراۃ الغیب پیش نظر رہتا تھا۔

صدیق حسن صاحب اثر مانکپوری حضرت جلیل کے فرزند تھے اور ان سے اور مجھ سے شعر و انشاء کی دلچسپی کے رشتہ سے یارانہ تھا، اس تعلق میں اُن کے والد ماجد کی

حضرت امیر مرحوم کے ساتھ شاگردی کی نسبت نے محبت کی گرہ کو اور زیادہ استوار بنا دیا تھا، مولوی صدیق حسن صاحب (حال وظیفہ یاب سرکار نظام) کے پاس اُن کے والد کی غزلوں کا سفینہ تھا، میں اس کو اکثر دیکھتا اور اس کے اچھے اشعار یاد کرتا، چنانچہ اُن کی ایک غزل کے یہ چند شعر اسی وقت سے یاد ہیں۔

کھول کر جوڑا نکلنا اس ہوا میں قہر ہے،
منہ تمہارا چوم لے زلفِ پریشاں تو سہی
گیسو و رخ کا اگر دو دن یہی عالم رہا
یار کا کلمہ پڑھیں ہندو مسلماں تو سہی
شعر کیا رنگین کہے ہیں وصفِ لب میں جلیل
خون تھوکے رشک سے لعلِ بدخشاں تو سہی

دربارِ امیری سے مزید وابستگی کا باعث یہ تھا کہ مدرسہ میں ہمارے استاد و مہتمم شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس سے پہلے جنرل اعظم الدین خاں کے زمانۂ تولیت میں رامپور کے مدرسۂ عالیہ میں مدرس اول رہے تھے اور ان سے امیر مینائی مرحوم اور ان کے تلامذہ اور فرزندانِ عزیز اختر مینائی وغیرہ سے تعلقات تھے۔ امیر اللغات کی مجلسِ شوریٰ کے وہ ایک ممبر تھے، ہمارے اوقاتِ درس میں کبھی کبھی ان کے تذکرے بھی آتے تھے اور ہم لوگ اُن کو بڑے شوق سے سنتے تھے، یہ گوناگوں اسباب تھے جن کی بنا پر اختر مینائی مرحوم اور حضرت جلیل سے شاعرانہ عقیدت تھی اور اس وقت ان سطروں کے لکھنے میں بھی یہ نسبتیں اثر انداز ہیں۔

حضرت جلیل کا پورا نام جلیل حسن تھا، مانکپور ضلع پرتاب گڑھ کے رہنے والے تھے، حفظِ قرآن سے مشرف، فارسی کی اعلیٰ استعداد اور عربی کی تھوڑی واقفیت تھی، لیکن شعر و سخن کے اصول و فروع اور لغت اردو کی تحقیق میں یدِطولیٰ رکھتے تھے اور

یہ فیض ان کو اپنے استاد حضرت امیر مینائی سے پہنچا، جوانی تھی، کہ استاذ کے قدموں سے آ کر لگے، استاد نے بھی جوہر قابل پاکر پوری تربیت کی، امیر اللغات کی ترتیب کا کام انجام پارہا تھا، جو ۱۸۸۴ء سے شروع تھا، استاد نے اس کام کا سر رشتہ شاگرد کے سپرد کیا، پہلی جلد الف ممدودہ کی شائع ہوئی اور دوسری جلدوں کے مسودے تیار ہونے لگے تھے کہ رامپور میں ریاستی انقلاب کا دور آیا، اتفاقِ وقت کہ اسی زمانہ میں حضور نواب میر محبوب علی خاں نظام سابق کشور دکن ہندوستان آئے، اس سفر میں داغ بھی ہمرکاب تھے، داغ پہلے رامپور میں رہ چکے تھے اور امیر مرحوم سے اُن کا دوستانہ تھا، اس بناپر داغ کے سلسلہ سے امیر مرحوم نے حضور نظام کی خدمت میں باریابی پائی اور حضور نظام نے اُن کو دکن آنے کا ایما فرمایا، چنانچہ کچھ دنوں کے بعد اس بڑھاپے میں ۱۳۱۸ھ، ۱۹۰۰ء میں وہ دکن کو سدھارے، دکن کو کیا سدھارے، اپنے اصلی وطن کو سدھارے، یعنی دکن پہنچے، ایک مہینہ اور کچھ دن ہوئے تھے کہ وہاں وفات پائی اور مشہور عام شعر بالکل صادق آیا۔

دو چیز آدمی را کشد زور زور
یکے آب ودانہ دگر خاک گور

آب ودانہ تو میسر نہ آیا، خاکِ گور میسر آئی، شاہ خاموش کے احاطۂ مزار میں اس شعر وسخن کے مرقد پر عمر میں دو دفعہ حاضری میسر آئی، دعائے مغفرت کے پھول نچھاور کئے، اس سفر میں شاگردوں میں حضرت جلیل اور صاحبزادوں میں سے حضرت اختر مینائی ساتھ تھے اس غربت اور مسافرت کے عہد میں مہاراجہ کشن پرشاد نے جو شعر وسخن کے شائق اور علوم مشرقی کے بڑے قدردان تھے، امیر کے ان دونوں عزیزوں کی بڑی قدر کی اور ان کو فوراً اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا، اس وقت سے ان دونوں صاحبوں نے حیدرآباد کو اپنا وطن بنالیا اور تقریباً پانچ چھ برس تک صرف مہاراجہ کی سرپرستی میں زندگی بسر کرتے رہے، اس زمانہ میں ایک گلدستہ اور ایک نثر کا ماہوار رسالہ دبدبۂ آصفی کے نام سے ان

کے اہتمام میں نکلنے لگا، حضرت جلیل نے اسی زمانہ میں "تذکیر وتانیث" پر ایک محققانہ کتاب لکھی، جس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر وتانیث کا فیصلہ درج کیا، پھر اردو کے فنِ عروض پر ایک رسالہ لکھا، جس میں اردو کے مستعمل اوزان وبحور کی تشریح کی، اس کے بعد اور بھی کتابیں لکھیں، جن کا ذکر آگے آئے گا۔

۱۹۰۵ء میں استاد داغ نے جو حضور نواب میر محبوب علی خاں آصف سادس کے استاد تھے، وفات پائی، تو اعلیٰ حضرت کی نگاہ انتخاب حضرت جلیل پر پڑی اور ان سے مشورۂ کلام فرمانے لگے، ۱۹۱۱ء میں جب حضور میر عثمان علی خاں بہادر تخت نشین ہوئے تو وہ مزید قدردانیوں سے سرفراز ہوئے اور اب وہ وقت آیا جو اس ماہر وکامل الفن کی قدرشناسی کے لئے مقدر تھا، چنانچہ اس وقت سے مرحوم نے اپنی رحلت تک پورے چھتیس برس اس شاہ عالی جاہ کے ظل عاطفت میں بکمال اطمینان وفارغ البالی بسر کئے اور بہت سے القاب وانعامات سے سرفراز ہوتے رہے۔

خاکسار کو سب سے پہلی دفعہ مارچ ۱۹۱۱ء میں نواب عماد الملک مرحوم کے کتب خانہ کو ندوہ میں لانے کے سلسلہ سے حضرت الاستاذ مرحوم کے حسب ایما حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا، وہ عقیدت جو حضرت جلیل سے مجھے تھی، کشاں کشاں ان کے آستانہ تک لے گئی، بڑی محبت اور شفقت سے ملے، اس کے بعد جب کبھی حیدرآباد جانا ہوا انکے ہاں ضرور حاضری دی، پرانی وضعداری اور استقامت کی یہ مثال آج تعجب سے سنی جائے گی کہ ان سے پہلی ملاقات جس مکان، مکان کے جس سائبان اور سائبان کی جس سمت میں جس کرسی پر، جس ہیئت کذائی سے ہوئی تھی، اخیر ملاقات بھی اسی مکان میں اسی سائبان میں، اسی کرسی پر اور اسی صورت میں ہوئی۔ میانہ قد، دبلا بدن، رنگ گندمی، قریب سانولا، داڑھی میں سیاہ خضاب، آنکھوں میں سرمہ، ہاتھوں میں تسبیح، ابھی آخری زمانہ کی حاضری کے موقع پر جو جنوری ۱۹۴۵ء میں ہوئی، دیدار نہ ہوسکا، ایسے

بیمار تھے کہ ذی فراش تھے، نقل وحرکت کی ممانعت تھی، یہی علالت کم وبیش قائم رہی اور مرض الموت ثابت ہوئی، محلہ سلطانپورہ کے جس کرایہ کے مکان میں رختِ اقامت ڈالا، اخیر تک اُسی میں گزار دیا۔

مرحوم نہایت دیندار، تہجد گزار، تسبیح خواں، ذکر الٰہی میں تر زبان، متین، سنجیدہ، کم سخن، متواضع، خاکسار اور بڑے پابند وضع تھے، پنج وقتہ نماز باجماعت کا اہتمام تھا، عشقِ رسول میں سرمست تھے، مرحوم کے یہ اوصاف جوانی ہی سے تھے، چنانچہ حضرت امیر ایک خط میں جو مکتوبات امیر میں چھپا ہوا ہے لکھتے ہیں۔

"مجھے محبی جلیل سے سخت انفعال ہے اور اُن کی کامیابی کا نہایت خیال ہے، آدمی یہ ایسے اچھے ہیں کہ جہاں ہوں وہاں اسلامی برکات پھیلیں، میں ان کی علیحدگی کو اپنی بدقسمتی جانتا ہوں مگر بمجبوری گوارا کرتا ہوں"

یہ مجبورانہ علیحدگی بغرض طلب معاش یوں پوری ہوئی کہ استاد وشاگرد ایک قدر شناس کی تلاش میں راہی دکن ہوئے اور استاد شاگرد کو چھوڑ کر قضا وقدر کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود اس دار المحن سے علیحدہ ہو گیا اور یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔

قبر ہی وادیٔ غربت میں بنے گی اک دن
اور کوئی نظر آتی نہیں گھر کی صورت (امیر)

تقدیر نے کہا شاگرد اسی وادیِ غربت کو اپنا گھر بنائے گا اور یہاں اس کی ظاہری وباطنی ترقی کا ایوان رفیع تعمیر پائے گا۔

حضرت جلیل نے ۱۹۰۰ء سے لے کر ۶ جنوری ۱۹۴۶ء تک ادھیڑ عمر سے زندگی کے اخیر لمحہ تک حیدر آباد میں گزارا اور اس کو اپنا ایسا وطن بنایا جس کو مرنے کے بعد بھی نہ چھوڑا کہ وہیں آسودۂ خاک ہیں۔

مرحوم نے اپنے بعد بہت سے فرزندانِ معنوی وظاہری یادگار چھوڑے، فرزندانِ

ظاہری میں بہت سی لائق اور برسرِ روزگار و باعزاز اولادیں اور اولادوں کی اولادیں ہیں اور فرزندان معنوی ان کی منظوم و منثور حسبِ ذیل تصنیفات ہیں :

۱۔ تاجِ سخن	(دیوان اوّل غزلیات)
۲۔ جانِ سخن	(دیوان دوم غزلیات)
۳۔ معراجِ سخن	(نعتیہ دیوان)
۴۔ سرتاجِ سخن	(مجموعۂ قصائد)
۵۔ گلِ صد برگ	(سَو رباعیوں کا مجموعہ)
۶۔ عطرِ سخن	(مثنوی)

چند کتب و رسائل نثر میں بھی ہیں۔

۷۔ سوانح امیر مینائی۔

۸۔ تعلیم الصلوٰۃ

۹۔ معیارِ اُردو	(محاورات)
۱۰۔ تذکیر و تانیث	(اُردو الفاظ کی تذکیر و تانیث میں)
۱۱۔ اُردو کا عروض	(اُردو شعر کے مستعمل اوزان)
۱۲۔ روحِ سخن	(تیسرا دیوان جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے)

حضرت جلیلؔ کو دنیا نے جانشینِ امیر کہہ کر پکارا، یہ جانشینی حقیقت میں پوری پوری تھی، ظاہری و باطنی دونوں اوصاف کے لحاظ سے وہ جانشین تھے، جو زہد و تقویٰ، پابندی دین اور ذکر و فکر و مراقبہ اور خدارسی استاد میں تھی، وہ شاگرد کو ملی تھی، اسی طرح شاعری کے جو اوصاف اور خصوصیات امیرؔ میں تھے، وہی جلیل میں تھے بلکہ امیرؔ میں قدیم و جدید کے جو دو رنگ تھے وہی جلیلؔ میں تھے، مرآۃ الغیب کا پُرانا رنگ اور صنم خانۂ عشق کا نیا رنگ؛ جلیل کے قدیم و جدید کلام میں نمایاں ہیں، استاد کا اتنا صحیح تتبّع امیرؔ کے تلامذہ میں کم کسی کو نصیب ہوا۔

جلیلؔ کی شاعری کے خاص خصوصیات کلام کی فصاحت، زبان کی صحت، محاورات کی پیروی، بندش کی چستی، فن کے اصول و فروع کی پوری پابندی اور جملہ کلام کا حشو وزوائد سے یکسر پاک ہونا ہے، جس کا اندازہ اُن کے ہر شعر سے ہوتا ہے۔

موجِ ہوا احباب کو سنگِ گراں ہوئی　　لیتے ہی سانس شیشۂ دل چور چور تھا

ہائے اس عالم آشنا کی نظر　　ہر نظر میں جہاں ہے گویا

ہجومِ اشک میں ملتا نہیں دل　　مرا یوسف ہے گم اس کارواں میں

خم تو ہے ساقیا شراب نہیں　　آسماں ہے اور آفتاب نہیں

ہمراہ ساتھیوں کے ہمارا یہ حال ہے　　جیسے غبار راہ پسِ کارواں چلے
بحرِ جہاں کی سیر بھی ہونا ضرور ہے　　آہستہ اپنی کشتیِ عمرِ رواں چلے

ہے آباد میرے تخیل کی دنیا　　حسین آرہے ہیں حسین جارہے ہیں

جلیلؔ آساں نہیں آباد کرنا گھر محبّت کا　　یہ اُن کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

مار ڈالا مسکرا کر ناز سے　　ہاں مری جاں پھر اسی انداز سے

فغاں میں درد، دعا میں اثر نہیں آتا　　جو تم نہیں ہو تو کوئی ادھر نہیں آتا

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں　　　وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

عاشقانہ کلام کے ساتھ ساتھ صوفیانہ رنگ بھی اُن کے کلام میں فراوانی کے ساتھ موجود ہے۔

کر چکی ہے آپ سے باہر مجھے اس کی تلاش　　　یہ سفر اپنا سفر اندر وطن ہو جائے گا

حرم کیا میکدہ کیا میں اسے گھر گھر پکار آیا　　　یہی اب جی میں آتا ہے کہ دستک دوں در دل پر

ہستی ہے عدم مری نظر میں　　　سوجھی ہے یہ ایک عمر بھر میں

جانتے ہیں تجھے ہم روزِ ازل سے لیکن　　　یہ نہیں جانتے کیونکر تجھے ہم جانتے ہیں

راہِ طلب میں ایسا وارفتہ کون ہوگا　　　منزل پہ ہم پہنچکر منزل کو ڈھونڈھتے ہیں

کریم کے جو کرم کا ظہور ہوتا ہے　　　خطا سے پہلے ہی عفو قصور ہوتا ہے

حُبِّ نبوی کا ظہور اُن کے نعتیہ کلام سے ہوتا ہے، اُن کی ایک نعتیہ غزل جو ابھی حیدر آباد کے ایک اخبار میں نظر سے گذری، درج ذیل ہے۔

لب پہ جس دم مرے نام شہِ بطحا آیا
عمر رفتہ پلٹ آئی کہ مسیحا آیا
فرش پر بارشِ انوار تھی معراج کی رات
عرش پہ دھوم تھی ماہِ شبِ اسریٰ آیا

جس قدر وادیٔ غربت میں چبھے تھے کانٹے
پھول سب ہو گئے جس وقت مدینا آیا
یا نبیؐ کہہ کے جو کشتی کا اٹھایا لنگر
وجد موجوں نے کیا جوش میں دریا آیا
ہو گئی بے خودیٔ شوق میں طے راہِ دراز
آنکھ کھولی تو نظر گنبدِ خضرا آیا
صرف حُبِّ نبوی حشر میں کام آئی جلیل
طاعتیں آئیں نہ زھد آیا نہ تقوے آیا

آج شاعر بہت ہیں، مگر استاد کم ہیں، جو فن کے مسائل پر کامل عبور رکھتے ہوں، جو تمام اصنافِ سخن پر برابر کی قدرت رکھتے ہوں، جو لفظوں کے ہاتھوں میں نہ ہوں بلکہ لفظ اُن کے ہاتھ میں ہوں، جن کے کلام سے زبان کے الفاظ، محاورات اور امثال کی تصدیق ہو، جن کا دیوان زبان کے سکوں کی ٹکسال ہو، حضرت جلیلؔ اس دور کے جو میرؔ و مرزاؔ سے شروع ہوا تھا، بظاہر خاتم معلوم ہوتے ہیں، اب نیا زمانہ ہے، نئی شاعری ہے، نیا ذوق ہے اور نئے خیالات ہیں، پرانے قاعدے توڑے جا رہے ہیں، پرانے اصول مٹ رہے ہیں، تشبیہوں اور استعاروں تک میں بے اصولی آ رہی ہے، اور زبان میں کمی بیشی ہو رہی ہے اور بحور کے دریا میں بھی تلاطم ہے، ہنرور شاعر اور ہنرور بادشاہ میں بھی تلازم عہدِ عباسیہ سے شروع ہوا تھا، اس کو بھی حضرت جلیل اور میر عثمان علی خاں پر اب تمام سمجھیے۔

کرنول علاقہ مدراس کے

ایک عالم دین کی وفات

احاطۂ مدراس کا وہ خطہ جس کو اب آندھرا کہنے لگے ہیں اور جو مدراس اور حیدرآباد دکن کے بیچ میں واقعہ ہے، وہ بھی کبھی اسلام کی قوت کا مرکز تھا، اس میں کرنول نام مشہور مقام ہے، جہاں پہلے ایک نوابی قائم تھی، وہ مٹ چکی ہے اور اس کا یادگار... خاندان حیدرآباد دکن منتقل ہوگیا ہے، وہاں کی اسلامی طاقت کے زوال سے وہاں کے مسلمانوں کی علمی و دینی کیفیت بھی زوال کے قریب پہنچ چکی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندہ کو مامور فرمایا، اُن کا نام مولانا حاجی محمد عمر صاحب تھا، اُن کے علم وفضل اور نیکی و تقویٰ کے سبب سے حاکم و محکوم دونوں طبقوں میں اُن کو ہر دلعزیزی حاصل تھی، حکومت نے شمس العلماء کے لقب سے ملقب کیا تھا اور عام مسلمانوں نے بھی ان کی دینی قیادت اور رہبری کو قبول کیا، موصوف نے اسّی برس کی عمر پائی اور یہ پوری عمر علوم دینی کی تعلیم و تدریس میں بسر کر کے گزشتہ ۲۰؍ جولائی سنہ ۱۹۴۶ء کو وفات پائی۔ اُن کی وفات سے اس علاقہ میں علوم قدیمہ کا خاتمہ ہوگیا، مرحوم مولانا احمد حسن صاحب کانپوری رحمہ اللہ کے ارشد تلامذہ میں تھے اور جس جلسہ میں ندوہ کی ابتدا کی تحریک کی گئی، اسی میں اُن کی دستاربندی ہوئی تھی، سنہ ۱۳۱۱ھ میں کانپور سے فارغ ہوکر واپسی کے بعد کرنول میں قیام کیا اور آخر تک وہیں قیام پذیر رہے، وہاں ایک چھوٹے سے مدرسہ کا انتظام جس کی ماہوار آمدنی پندرہ بیس روپے سے زیادہ نہ تھی، اپنے ہاتھ میں لیا، اللہ تعالیٰ نے اُن کے کام میں برکت دی، مرحوم کے مساعی کی بدولت

آج اس کے املاک وعمارات تقریباً تین لاکھ کے مساوی ہیں، آندھرا اور مدراس علاقہ کے اردو فارسی اور عربی اساتذہ میں تقریباً تین ربع بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سے فیض تلمذ رکھتے ہیں، کانپور میں حضرت مولانا تھانوی سے مثنوی پڑھی تھی اور ان کے سلسلۂ ارادت میں شامل تھے، مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی سے بھی فیض پایا اور مسلسلات وغیرہ کی اجازت لی تھی، افسوس ہے کہ وہ گنجینۂ علم مفقود ہوگیا، رنج اس بات کا ہے کہ یہ جگہ کچھ ایسی خالی ہوئی ہے کہ اب اُس کے پُر ہونے کے آثار نہیں، اسلاف کی زندگی کا نمونہ تھے، باوجود ہر طرح کے آرام کے ہمیشہ خود اختیاری فقر کی زندگی پسند کی اور دنیاوی املاک میں سے نہ زمین چھوڑی، نہ مکان اور نہ نقد، ہمیشہ یہی آرزو رہی کہ دنیا سے ایسے روانہ ہوں کہ ترکہ کا حساب نہ دینا پڑے، وہی بعینہ پیش آیا، رحمہ اللہ۔

ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد سے واقف تھے اور اصلاحِ نصاب کے مسئلہ سے متفق تھے، اسی لئے انہوں نے اپنے مدرسہ میں بہت سی اصلاحات جاری کیں اور مدرسہ کو پرانے علوم کے ساتھ نئے طرز وطریق سے آشنا کیا، مرحوم نے اپنا لائق جانشین چھوڑا، افضل العلماء ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب پرنسپل محمڈن کالج مدراس کو مرحوم نے پہلے عربی علوم پڑھا کر عالم بنایا، پھر افضل العلماء کا عربی کا امتحان مدراس یونیورسٹی سے دلا کر انگریزی پڑھائی اور ان کو ایم۔ اے کرایا، فراغت کے بعد وہ محمڈن کالج مدراس میں پہلے استاد مقرر ہوئے، پھر چند سال ہوئے کہ لندن جا کر علم تفسیر پر ریسرچ کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی اور اب وہ محمڈن کالج مدراس کے پرنسپل ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اپنے باپ سے علم وعمل دونوں کی برکت حاصل کی ہے۔

مرحوم سے مجھ سے سفر میں کئی مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا،

بڑے نیک وصالح اور متقی بزرگ تھے، وعظ بھی فرمایا کرتے تھے، سادہ بیان تھا، تکلف وتصنع سے تمامتر بری تھے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی نوازشوں سے سرفراز فرمائے اور جس مدرسہ کو انہوں نے اپنی یادگار چھوڑا ہے، وہ اُن کی جسمانی یادگار کے زیرسایہ قائم وباقی رہے۔

حکیم حبیبُ الرّحمٰن مرحوم ڈھاکہ

ڈھاکہ کے متعدد دوستوں کے خطوط سے یہ معلوم کرکے بڑا افسوس ہوا کہ بنگال کے جادو نگار ادیب اور نادرۂ روزگار طبیب شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن نے یکم ربیع الثانی ۱۳۶۶ھ کی شب میں ضغطۂ دم (بلڈ پریشر) بیماری میں سنہ قمری سے ۶۸ اور شمسی سے ۶۶ برس کی عمر میں دفعۃً وفات پائی، مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی اپنے والا نامہ میں لکھتے ہیں۔

"آپ کو وفیات لکھنے میں ملکہ ہے، ایک اور وفات نامہ معارف میں لکھ دیجئے، آپ کے اور میرے مخلص دوست حکیم حبیب الرحمٰن صاحب کا یکم ربیع الثانی ۱۳۶۶ھ مطابق ۲۳، فروری ۱۹۴۷ء کی شب میں دفعۃً بلڈ پریشر بڑھ جانے سے انتقال ہوگیا، انا للہ،

مرحوم حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ابتدائی صرف ونحو کے شاگرد اور بڑے عاشق تھے، علامہ شبلی کے دوستوں میں تھے، مسلم لیگ کی جب بنیاد ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں رکھی گئی اور نواب سر سلیم اللہ خان اُس کے صدر ہوئے، تو مرحوم جوائنٹ سکریٹری ہوئے تھے، علم طب حکیم عبد المجید خان صاحب سے حاصل کیا اور اس میں کمال کا درجہ پایا۔ بنگال میں اس وقت اُن کے درجہ کا کوئی طبیب نہیں سنا گیا، ڈھاکہ میں طبیہ کالج قائم کیا اور بڑی ہمت سے اس کو چلاتے رہے، گورنمنٹ نے شفاء الملک کا خطاب دیا، جس کو (لیگ کی تحریک کی بناء پر) ستمبر میں واپس کردیا۔

ان کے اس کالج سے بہت سے اطباء پیدا ہوئے اور اب بھی

سلسلۂ درس جاری رہے "

مولانا شبلی مرحوم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے سلسلہ میں ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ تشریف لے گئے تھے، وہاں سے دو دوستوں کے نام ہم لوگوں کے لئے تحفہ میں اپنے ساتھ لائے، ایک کا نام مرزا محمد فقیر صاحب اور دوسرے کا حکیم حبیب الرحمٰن، مولانا مرحوم کے بعد ان کی دوستی و محبت کا سلسلہ اس حقیر راقم الحروف کی طرف منتقل ہوا مرزا صاحب کا مدتوں سے پتہ نہیں، خدا جانے وہ جیتے بھی ہیں یا نہیں، حکیم صاحب مرحوم نے اخیر تک دوستی نباہی، اُن کے اخلاق کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جن دوستوں سے ان کی دوستی رہی، اس کو وہ اخیر تک بکمال احتیاط و اہتمام نباہتے رہے۔

خط وکتابت کی معرفت تو مولانا شبلی مرحوم کے عہد سے شروع ہو چکی تھی، مگر ملاقاتِ جسمانی کی نوبت ۱۹۳۰ء کے آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر پٹنہ میں آئی، اس کے بعد وہ بارہا ڈھاکہ بلاتے اور اس کے لئے ڈھاکہ یونیورسٹی کے تعلق سے نئی نئی تقریبیں پیدا کرتے رہے، مگر جانا اور ملنا نصیب نہ ہوا۔

مرحوم نسباً فاروقی اور وطناً یاغستانی علاقہ یوسف زئی کے باشندے تھے، ان کے والد اخوند محمد شاہ صاحب مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں تھے، لکھنؤ سے ڈھاکہ اپنے ماموں محمد نعمان صاحب مرحوم کے یہاں آئے اور یہیں شادی کرکے بس گئے اور اس تقریب سے سرحد ہند کی یہ دولت بنگال کی قسمت میں آئی۔

حکیم صاحب مرحوم کی تعلیم جیسا کہ حسن معصومی صاحب (لکچرار فلسفۂ اسلام ڈھاکہ یونیورسٹی) نے مجھے لکھا ہے آگرہ اور بہار میں ہوئی، مگر جیسا کہ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے ڈھاکہ سے لکھا ہے کہ اُن کی تعلیم کا بڑا زمانہ کانپور میں گزرا، کچھ درسیات اپنے والد سے حاصل کئے، ابتدائی صرف ونحو کے کچھ اسباق جیسا کہ پہلے گزرا، حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھے، جب حضرت والا رحمۃ اللہ کانپور میں درس دے رہے تھے، جس کا خاتمہ ۱۳۱۵ھ میں ہوا

اور زیادہ تر تعلیم مولانا محمد اسحاق صاحب بردوانی سے حاصل کی، معقول مولانا احمد حسن صاحب کانپوری اور مولانا عبدالوہاب صاحب بہاری سے پڑھی، جب وہ کانپور میں مدرس تھے۔ حدیث مولانا مفتی لطف اللہ صاحب علی گڑھی اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے ایک شاگرد سے حاصل کی اور اجازت لی، طب حکیم عبدالمجید خاں صاحب دہلوی المتوفی سنہ ۱۹۰۱ء سے پڑھی اور اس میں کمال کا درجہ حاصل کیا، سنہ ۱۹۰۴ء میں وہ تعلیم سے فارغ ہو کر ڈھاکہ لوٹے اور طبیب کی حیثیت سے اپنی زندگی شروع کی، مرحوم کی تعلیم تمام تر پرانے طرز کی ہوئی تھی، مگر فطرت کے خزانہ سے وہ ایک ذہین اور لطیف دماغ اپنے ساتھ لائے تھے، اپنے اسی فکری ذوق کی مدد سے تاریخ و ادب کی کتابیں پڑھیں اور طب کے بعد جن فنون سے اُن کو ذوق رہا وہ بھی تاریخ وادب تھے اور اسی سلسلہ سے وہ مولانا شبلی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، چنانچہ سنہ ۱۹۰۶ء اُن کی زندگی کے لئے بڑی اہمیت کا سال ہے، اسی سال مولانا شبلی سے ملاقات ہوئی، باتوں باتوں میں انہوں نے مولانا شبلی نعمانی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ حاجی خلیفہ کی کشف الظنون کی طرح ہندوستان کے ہر صوبہ کی تصنیفات پر ایک محققانہ کتاب لکھی جائے، مولانا نے ان کے اس خیال کی تحسین کی اور بنگال کا حصّہ اُن کے سپرد کیا، حکیم صاحب مرحوم کے اکثر خطوں میں اُن کی اس تصنیف کے تذکرے ہوا کرتے تھے، بنگال سے متعلق "ثلاثۂ غسالہ" کے نام سے ایک کتاب اُن کے زیر قلم تھی، "ثلاثۂ غسالہ" کا نام انہوں نے حافظ شیرازی کی اس غزل سے لیا تھا، جس کو حافظ نے سلطان بنگالہ کے نام لکھ کر بھیجا تھا۔

زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اسی غزل کا ایک ٹکڑا ہے "ثلاثۂ غسالہ می رود" الفاروق اور حیات سقراط اُن کی طالبعلمی کے سلسلے ہیں، اُن کی دوسری تصنیفات کے نام مساجد ڈھاکہ، ڈھاکہ اب سے پچاس برس پہلے، شعرائے ڈھاکہ وغیرہ ہیں، آخری تصنیف آسودگانِ ڈھاکہ ہے، جو ابھی سنہ ۱۹۴۶ء کے اخیر میں چھپ کر شائع ہوئی، جس میں بزرگانِ ڈھاکہ کے مزارات کی تحقیق

اور تذکرے ہیں، اس کے بعد آسودگانِ ڈھاکہ کا مصنف خود ڈھاکہ کی خاک میں آسودہ ہوگیا۔

اُن کی ادبی تاریخ کا آغاز بھی ۱۹۰۶ء سے ہوتا ہے، اس سال انہوں نے ڈھاکہ سے المشرق کے نام سے ہفتہ وار رسالہ نکالا، پھر جادو کے نام سے ایک اور ادبی و علمی رسالہ جاری کیا، معارف کے ابتدائی پرچوں میں بھی اُن کے بعض مضامین چھپے ہیں۔

مرحوم کے قلم میں بڑی لطافت تھی، محمد حسین آزاد کی نقالی کسی سے نہ ہوسکی، لیکن تھوڑی بہت اگر کسی سے ہوئی تو عجیب بات ہے کہ وہ بنگال ہی کے جادوگرانِ ادب سے ہوسکی، اُن میں پہلا نام نصیر حسین خیال (کلکتہ) کا اور دوسرا حکیم حبیب الرحمٰن (ڈھاکہ) کا ہے، افسوس ہے کہ اُن کی طبی مصروفیتوں نے اُن کے ادبی کارناموں کو اُبھرنے کا موقع نہیں دیا اور ان کی یہ قوتِ انشار پردازی پوری طرح ظاہر نہ ہوسکی۔

اُن کو اردو ادب اور بنگال کی تاریخ سے خاص ذوق تھا اور تاریخ کے تعلق سے قدیم سکوں کے جمع کرنے کا شوق تھا، چنانچہ اُن کے جمع کردہ سکوں کا پہلا ذخیرہ اس وقت ڈھاکہ کے عجائب خانۂ آثار قدیمہ میں ہے، جس کا تاریخ وار کیٹلاگ بھی چھپ کر شائع ہوچکا ہے، اس کے بعد جو سرمایہ اُن کے پاس جمع ہوا اس کو دارالمصنفین کے نام منتقل کرنے کا بارہا ارادہ انہوں نے کیا، مگر یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔

مرحوم طبیب اور حاذق طبیب تھے، قیافہ اور نباضی میں کمال رکھتے تھے، صورت دیکھ کر اور صرف حال سُن کر مرض بتا دیتے تھے، حضرت حکیم الاُمت کی علالت کا حال مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی سے سُن کر مرض کی تشخیص کی اور دوا تجویز کی، جب تھانہ بھون سے خطرناک حالت کی اطلاع آئی تو کہا کہ اب دوا بیکار ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وقت آخر آپہنچا اور آخر جیسا انہوں نے کہا ویسا ہی ہوا۔

مرحوم کی حذاقت کا ایک واقعہ مجھ سے متعلق ہے، کئی سال کی بات ہے میں نے ریڈیو پر ایک تقریر کی، مرحوم نے ڈھاکہ سے لکھا، میں نے ریڈیو پر آپ کی آواز سُنی جو

جو آپ کے ضعفِ قلب کا اعلان کر رہی تھی، اس کی خبر جلد لیں، چنانچہ چند ہی روز کے بعد مجھے اسی قسم کے سخت مرض کا سانحہ پیش آیا، جس سے اللہ تعالیٰ نے جانبری فرمائی۔

مگر آہ! وہ مسیحا نفس جو دوسروں کو موت کے پنجہ سے چھڑایا کرتا تھا، آخر ایک وہ دن بھی آیا، جب وہ خود اس کے پنجہ میں گرفتار ہوا، مرحوم کو کئی مہینوں سے اس آنے والے حادثہ کا خیال تھا، جنوری ۱۹۴۷ء میں بعض دوستوں سے کہہ چکے تھے کہ میں جب جاؤں گا دفعۃً جاؤں گا، جس دن یہ حادثہ پیش آیا، متعدد مریضوں کو جا کر دیکھا، مغرب کے بعد نشستگاہ میں بیٹھ کر دوستوں سے باتیں کیں، ہنستے بھی رہے ہنساتے بھی رہے اور اسی سلسلہ میں فرمایا کہ آج مولانا عثمانی ڈھاکہ میں نہیں، اس کی فکر ہے، ان کو اپنی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوچ کا وقت قریب ہے، اس لئے کچھ وصیتیں بھی کر چکے تھے، جن میں ایک یہ تھی کہ میری نماز مولانا ظفر احمد تھانوی پڑھائیں گے اور اگر وہ نہ ہوں تو پیر جی عبد الوہاب مہتمم مدرسہ اشرف العلوم پڑھائیں چنانچہ تقدیر یہی تھی کہ مولانا عثمانی اس دن کہیں باہر تھے، تین بجے شب کو قلب کا دورہ پڑا، ڈاکٹر کے لئے آدمی گیا، جیسے ہی اس نے چوکھٹ پر قدم رکھا ہے، مسافر عالم بالا کے سفر پر روانہ ہو گیا، آناً فاناً خبر شہر میں پھیل گئی، صبح کو تجہیز و تکفین عمل میں آئی جنازہ میں اتنا مجمع تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ڈھاکہ میں شاید ہی کسی کے جنازہ میں ایسا مجمع ہوا ہو، حسب وصیت پیر جی عبد الوہاب نے نماز پڑھائی، جو لال باغ کی شاہی مسجد میں ہوئی اور ڈھاکہ کے ایک بزرگ کے احاطۂ مزار میں سپرد خاک ہوئے۔

مرحوم کے سانحۂ وفات پر شہر میں کہرام ہے، عام و خاص سب ہی متاثر ہیں۔ اہل قلم طبقہ پر مرحوم کی وفات کا جو اثر ہوا، وہ ان عربی مرثیوں سے ظاہر ہے جو ڈھاکہ کے دو بزرگوں نے لکھ کر بھیجے ہیں۔

حبیبی! دوستوں نے تمہارے لئے مرثیے لکھے، احباب نے تمہارے فراق میں آہ جگرسوز کھینچی، جاننے والوں نے تمہارے اوصاف گنائے، ماننے والوں نے تمہارے احسانات یاد کئے، مگر تم اس دنیا میں ہو جہاں اس دنیا کی مدح وستائش کی حکایتیں نہیں پہنچتیں، مغفرت کی دعائیں تمہارے لئے ہیں، غفور ورحیم اُن کو قبول فرمائے۔

اپریل ۱۹۴۷ء

حضرت مولانا

شاہ محی الدّین پھلواروی امیر شریعت بہار

پھلواری پٹنہ سے چند میل پچھم ایک مردم خیز قصبہ ہے، جو صدیوں سے اس صوبہ کا علمی اور مذہبی مرکز ہے، یہاں خانقاہ مجیبی قائم ہے، جہاں ظاہر و باطن اور علم و عمل دونوں کے سرچشمے آکر ملتے ہیں، اس خانقاہ کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ شروع سے اب تک اس کے سجادہ نشین علم شریعت و طریقت دونوں کے جامع رہے ہیں، یعنی ہر صاحب سجادہ صوفی صافی ہونے کے ساتھ عالم دین بھی ہوتے آئے ہیں، دستار فضیلت اور خرقۂ مشیخت دونوں یہاں ایک جسم پر آراستہ رہے ہیں اور اب دو پشتوں سے یہاں کے صاحب سجادہ صوبہ کے امیر شریعت بھی ہو رہے ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے ملفوظات میں اس خاندان کے معاصر شیخ کا تذکرہ مدح کے ساتھ آیا ہے، مولانا شاہ اسمٰعیل شہید نے اپنے سفر بہار و بنگال میں اس خانقاہ میں بھی قدم رنجہ فرمایا۔

سجادہ نشین حال حضرت مولانا شاہ محی الدین رحمہ اللہ خلف حضرت مولانا شاہ بدر الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے چند سال کے اضمحلال طبع اور تسلسل علالت کے بعد ۲۹ جمادی الاولی ۱۳۶۶ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۹۴۷ء کی صبح کو ستر سال کی عمر میں اس دار فانی کو الوداع کہا اور زمانۂ قدیم کی ایسی یادگار مٹ گئی جس کی زیارت سے بزرگوں کی بہت سی نشانیاں ایک ذات میں نظر آتی تھیں۔

مجھ ہیچمدان کو مرحوم سے گوناگوں تعلقات حاصل تھے، میرے والد مرحوم نے

اُن کے والد مرحوم کے ساتھ اُن کے نانا حضرت شاہ علی حبیب صاحب قدس سرہ سے فیض ارادت اور تکمیل باطن حاصل کی تھی میرے والد مرحوم کی پیدائش ۱۲۵۷ھ میں ہوئی تھی اور اخذ و فیض و استفادہ جوانی میں شروع کیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ اس واقعہ پر اسّی برس گزر چکے ہیں، میرے بڑے بھائی مرحوم کی تعلیم کی تکمیل اور دستار بندی شاہ محی الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ماموں مولانا شاہ عین الحق صاحب مرحوم کیساتھ اسی خانقاہ پھلواری ہی میں ہوئی، میری عمر جب تیرہ چودہ برس کی تھی، غالباً ۱۸۹۹ء میں والد مرحوم کے حسب الحکم بغرض تعلیم اسی خانقاہ میں طالب العلم رہا، اس وقت شاہ محی الدین صاحب کی آخری کتابیں مولانا عبدالرحمان صاحب سے ہو رہی تھیں، یہ مولانا عبدالرحمان صاحب، ناصر گنج ضلع آرہ کے باشندہ اور مولانا عبدالعزیز صاحب امروہوی کے شاگرد تھے، جو مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی کے مشہور شاگرد اور ممتاز مدرس تھے، اس وقت میری عربی کی ابتدائی کتابیں تھیں، مجھے خانقاہ میں خاص حضرت شاہ صاحب مرحوم کے قریب قیام کی اور ایک ساتھ طعام کی اور زیر درس کتابوں میں شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی، مجھے اس نسبت پر فخر اور انہیں اس پر مسرت تھی، انہیں جب دیکھتا تھا، عہد اول یاد آجاتا تھا اور ان کو بھی خوشی ہوتی تھی، افسوس کہ اس بزرگانہ تبسم کا منظر اب ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے پنہاں ہوگیا۔

مرحوم کی پیدائش کا سال ۱۲۹۶ھ ہے، ابتدائی کتابیں اپنے والد بزرگوار امیر شریعت اول مولانا شاہ بدرالدین صاحب قدس سرہٗ سے پڑھیں، بقیہ درسیات مولانا عبداللہ صاحب رامپوری سے حاصل کیں اور تحصیل فراغ جیسا کہ ابھی گزرا ۱۳۱۸ھ میں مولانا عبدالرحمان صاحب سے حاصل ہوئی، طب کی تعلیم بھی پھلواری ہی کے ایک قیام پر بزرگ مولوی حکیم وارث حسن صاحب سے حاصل کی، مگر عملاً کبھی مطب

نہیں کیا، سجادہ نشینی سے پہلے تک درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۴ء میں اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد وہ سجادہ نشین اور صوبہ بہار کے امیر شریعت ثانی ہوئے اور اس وقت سے اخیر وقت تک وہ ہدایت خلق اور اپنے متبعین اور معتقدین کے تزکیہ و تصفیہ و تعلیم طریقت اور اپنے نقطۂ نظر سے بہار کے مسلمانوں کی قومی خدمت میں مصروف رہے، ۱۳۴۴ھ میں حج وزیارت کیلئے حجاز و عراق و شام کا سفر کیا اور لوگوں کو اپنے برکات سے مستفید کیا اور ان ملکوں کے بعض بزرگوں سے استفادہ کیا۔

وہ حد درجہ شریف، نیک، صلح پسند، متواضع اور صورت اور سیرت، لباس، ہر چیز میں نمونۂ سلف تھے، مذاقِ حال سے بھی آشنا تھے، تقریر و تحریر پر قدرت رکھتے تھے۔ متعدد مجالس میں شرکت فرمائی، قومی اجتماعات میں تقریریں کیں، مساجد میں وعظ و پند سنائے، تحریک خلافت کے زمانہ سے سیاسیات میں بھی شرکت کی، خلافت کانفرنس منعقدہ آرہ اور جمعیۃ العلماء بہار کے اجلاس منعقدہ دربھنگہ کی صدارت کی، وقتاً فوقتاً اُن کے سیاسی خیالات اور امیر شریعت کی حیثیت سے اُن کے فرامین بھی شائع ہوا کرتے تھے۔

اب اُن کی وفات سے مسلمانانِ بہار ایک بڑی نعمت سے محروم ہو گئے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جانے والے کو اپنی نوازشِ بے پایاں سے اور رہ جانے والوں کو اپنی نصرت بیکراں سے سرفراز فرمائے۔

آہ! مولانا عمادی

حیدرآباد دکن کے اخبار البلاغ سے یہ معلوم کر کے سخت صدمہ ہوا کہ ہمارے قدیم دوست مولانا عبداللہ العمادی نے حیدرآباد میں جہاں انہوں نے سکونت اختیار کرلی تھی، ۱۱ شوال ۱۳۶۶ھ کو داعیِ اجل کو لبیک کہا، اُن کی عمر اس وقت ستر برس کے قریب ہوگی مرحوم اُردو، فارسی اور عربی کے مستند ادیب اور مورخ تھے اور تقریباً ہر علم وفن سے آشنا تھے۔

مرحوم کا وطن ضلع جونپور میں امرتھوا نام ایک موضع تھا اور عماد الدین نام کے کسی بزرگ کے خاندان سے نسبی نسبت رکھتے تھے اور اسی تعلق سے اپنے کو عمادی لکھتے تھے، اصلی نام عبداللہ کا فارسی ترجمہ "خدا بندہ" بھی لکھا ہے، جو سب سے پہلے نومسلم تاتاری سلطان کا نام تھا، مگر شہرت عام عبداللہ عمادی کے نام سے تھی۔

غالباً ابتدائی تعلیم کے بعد ہی یہ لکھنؤ آ گئے تھے اور مولانا عبدالعلی آسی مدراسی کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی، مولانا عبدالعلی کا اصل وطن گو مدراس تھا، مگر جب سے تعلیم کے لئے لکھنؤ آئے، یہیں کے ہو کے رہ گئے، یہیں فرنگی محل میں مولانا عبدالحیٔ صاحب فرنگی محل سے تعلیم پائی، ادب، شعر اور تاریخ گوئی میں ملکہ رکھتے تھے، اکثر کتابوں کے آخر میں جو اُن کے مطبع میں چھپیں اُن کی تاریخیں آپ کو مل سکتی ہیں، اُن کی صحبت میں مولانا عمادی صاحب کو بھی زیادہ تر شعر وسخن اور ادب وتاریخ کا فائدہ پہنچا مولانا عبدالعلی ایک زمانہ میں رامپور میں مدرس تھے، وہاں بھی وہ اُن کے ساتھ رہے پھر جب وہ لکھنؤ آئے تو وہ بھی اُن کے ساتھ یہاں آئے اور یہیں اُن کے مُرغ شہرت نے برو بال پیدا کئے۔

مولانا آسی نے لکھنؤ میں محمود نگر کے محلہ میں سکونت اختیار کی اور اصح المطابع کے نام سے ایک مطبع قائم کیا، بعد کو اس کا نام اُن کے صاحبزادہ قاری عبدالولی مرحوم نے آسی پریس رکھ دیا تھا، اس مطبع میں عربی کی بہت سی کتابیں چھپ کر شائع ہوئیں، مولانا آسی کو کتابوں کی تصحیح میں بڑی مہارت اور دقتِ نظر حاصل تھی، عربی متوسطات کے طالب علموں کو بھی وہ باجرت تصحیح کے کام پر رکھ لیتے تھے اور مولانا کی صحبت میں وہ کچھ نہ کچھ بن جاتے تھے، مولانا عمادی بھی انہی خوش قسمت طالب علموں میں تھے اور اپنی خداداد استعداد سے اس صحبت سے بہرۂ وافر حاصل کیا۔

مرحوم کسی درسگاہ کے باقاعدہ طالب علم نہ تھے اور نہ علوم مروجہ کی درس وتدریس کی حیثیت سے تکمیل کی تھی، مگر موہبتِ الٰہی رسمی طریقۂ تعلیم پر موقوف نہیں، اس کا فیض عام اور بقدر استعداد تام ہے، کتب بینی کے شائق تھے اور خصوصیت کے ساتھ اُردو، فارسی اور عربی کی نظم ونثر کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ان تینوں زبانوں میں ان کی شاعری اور انشاء پردازی کی قوت حاصل تھی اور ان زبانوں کے ہزاروں شعر اُن کے خزانۂ دماغ میں محفوظ تھے اور عربی وفارسی لغات پر بھی عبور رکھتے تھے۔

مرحوم مجھ سے فرماتے تھے کہ وہ عربی کی الف لیلہ سمجھتے نہیں تھے، مگر پھر بھی وہ اس کو دیکھا کرتے اور جو کچھ سمجھ جاتے اس پر خوش ہوتے، اور جو نہ سمجھتے اُس کو لغت سے حل کرتے، یا شاید مولانا آسی سے دریافت کر لیتے اور اس طرح ان کو عربی انشاء پردازی کا ذوق پیدا ہوا اور عربی میں مضمون نویسی کی قدرت حاصل کی، جو اس زمانہ میں غیر معمولی بات تھی۔

اسی سلسلہ میں بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں مولانا آسی کی رہبری اور ان کی اڈیٹری میں البیان نام ایک اُردو عربی ماہانہ رسالہ مطبع اصح المطابع لکھنؤ سے نکلنے لگا، اس کے ہر صفحہ میں دو کالم ہوتے تھے، ایک میں عربی اور دوسری میں اس کا اُردو

ترجمہ ہوتا تھا اور آخر میں چند صفحے عربی ممالک کی خبروں اور اردو مضمونوں کے ہوتے تھے، اس رسالہ کا مبادلہ مصر و شام ڈیونس کے عربی اخباروں سے ہوتا تھا، یہ اخبارات اُن کے ہاں آتے تھے اور وہ اُن کو پڑھا کرتے تھے اور اُس کے بدولت جدید عربی کے نئے نئے الفاظ سے اُن کو پوری واقفیت ہوتی رہتی تھی اور وہ اُن کو اُردو میں رواج دینے کی کوشش کرتے تھے، چنانچہ اُن کے بعض الفاظ رواج پا گئے۔

اس زمانہ میں ہمارے استاد مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی، مدرس اول دار العلوم ندوہ لکھنؤ میں مقیم تھے، مرحوم اُن کی خدمت میں آیا جایا کرتے تھے، یہ تو معلوم نہیں کہ اُن سے پڑھا تھا یا نہیں، مگر وہ اُن کے صحبت یافتہ ضرور تھے، مولانا چریا کوٹی ۱۹۰۵ء تک لکھنؤ رہے تھے، اس کے بعد ہی اسی سال جب اُن کے شاگرد رشید مولانا شبلی مرحوم دار العلوم میں معتمد ہو کر آئے تو مولانا عمادی اُن کی صحبتوں میں آنے جانے لگے اور یہی زمانہ مرحوم سے میرے آغاز ملاقات کا تھا جو بحمد اللہ اُس وقت سے شروع ہو کر اخیر وقت تک قائم رہا۔

ندوہ کا علمی پرچہ الندوہ جو پہلے دفتر ندوہ کے شاہجہاں پور سے ہونے کے سبب سے شاہجہاں پور سے نکلتا اور آگرہ میں چھپتا تھا، مولانا شبلی کے قیام لکھنؤ کے بعد سے لکھنؤ سے نکلنے لگا اور اصح المطابع میں چھپنے لگا اور مولانا عمادی کی آمد و رفت اس تعلق سے زیادہ ہونے لگی، ۱۹۰۶ء میں مولانا شبلی نے اس کی سب اڈیٹری کا کام مولانا ابوالکلام کے سپرد کیا، چند ماہ کے بعد جب وہ وکیل امرتسر میں چلے گئے تو مولانا نے مرحوم کو اُن کی جگہ الندوہ کا سب اڈیٹر بنایا، اس زمانہ میں انہوں نے جابر بن حیان مشہور عرب کیمیادان اور ابن خلدون پر چند علمی مضمون لکھے، مگر مرحوم کو کتابوں کے حوالے دینے کی عادت نہ تھی، اس سے مولانا شبلی کو اُن کے حوالوں پر اعتماد نہیں ہوتا تھا، چنانچہ چند ہی ماہ کے بعد یہ خدمت خاکسار کو دی گئی، اس کے بعد اس بنا پر کہ ماہ بماہ پرچہ کا اہتمام مجھ سے نہ

ہو سکا پھر یہ خدمت عمادی صاحب کے سپرد کی گئی، اُس کے بعد پھر یہ خدمت ہمارے دوست مولانا عبد السلام صاحب ندوی کو اور کبھی مجھ کو ملتی رہی اور پھر اس کا خاتمہ ہوا۔

غالباً ۱۹۰۸ء کے وسط سے یا ۱۹۰۹ء کے شروع میں مولانا ابوالکلام اپنے والد ماجد کے مرض الموت کے سبب سے اپنے والد کے اصرار سے وکیل امرتسر کی ادارت چھوڑ کر کلکتہ گئے تو وکیل کے مالک غلام محمد صاحب مرحوم نے مولانا عمادی کو اُن کی جگہ بلایا اور وہ کئی سال اس تعلق سے امرتسر میں رہے اور وہاں انہوں نے سرسید کے "تہذیب الاخلاق" کو پھر زندہ کیا اور کئی نمبر اُس کے نکالے اور اس کی طرف سے بعض اپنے رسائل اور دوسروں کی کتابوں کی با اجازت اشاعت کی اور سرسید کے بعض رسالوں کو دوبارہ چھاپا، مرحوم نے وہاں جو رسالے لکھے ان میں سے عرب قدیم اور صناع العرب کے نام اس وقت یاد ہیں، ان کے امرتسر چلے جانے کے بعد البیان کی ادارت میرے حصہ میں آئی اور تقریباً سال بھر اس کو میں چلاتا رہا۔

۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام کی ادارت میں جب کلکتہ کے افق سے ہلال (الہلال) نمودار ہوا تو چند ماہ کے بعد میں الہلال کی ادارت میں شامل ہوا اور میرے کچھ ہی دنوں کے بعد مولانا عمادی بھی وہیں آگئے اور چند مہینوں تک ہم اور وہ دونوں ایک ہی ساتھ ایک جگہ الہلال کے دفتر میں رہے اور کام کیا کئے، اس زمانہ میں الہلال میں انہوں نے جو مضمون لکھے، ان میں اسوۂ نوح، اسوۂ ابراہیمی اور کشف ساق تین عنوان یاد ہیں۔

چند ہی مہینوں کے بعد ہم دونوں الگ ہو گئے، وہ زمیندار لاہور میں چلے گئے، اور میں حضرت الاستاذ علامہ شبلی کے حسب الحکم دکن کالج پونا چلا گیا، نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۲۸ھ میں جب مولانا شبلی کی اور دسمبر ۱۹۱۴ء مطابق محرم ۱۳۲۸ھ میں مولانا حالی کی وفات ہوئی ہے تو مولانا عمادی زمیندار میں تھے اور اسی اخبار میں

ان دونوں مرحومین پر پُراثر مضمون لکھے اور مولانا شبلی مرحوم کی وفات کے سلسلہ سے انہی کے تعلق کے سلسلہ سے میرے چند مسلسل مضمون نکلے، پھر زمانہ کا انقلاب دیکھئے کہ حیدرآباد دکن میں جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں کے لئے دارالترجمہ قائم ہوا اور زمیندار کے اڈیٹر ظفر علی خاں اعلیٰ حضرت حضور نظام میر عثمان علی خاں کے ایام شاہزادگی کے سابقہ معرفت کے سبب سے جب دکن آئے، تو مولانا عمادی کے حیدرآباد آنے کا وہ ذریعہ بن گئے، ظفر علی خاں تو سیاسی شورشوں کے طوفان میں بہ گئے، مگر مولانا عمادی اپنے فضل وکمال اور مرنجاں مرنج طبیعت کے سبب سے اپنی جگہ جمے رہے اور ایسے جمے کہ مر کر ہٹے۔

دارالترجمہ میں وہ اپنے لغات دانی اور جدید عربی مصطلحات علمی کی واقفیت کے سبب سے بہت کارآمد ثابت ہوئے، وہ دارالترجمہ کی دو جماعتوں میں سے اس جماعت میں تھے، جو اُردو میں عربی مصطلحات کے رواج کے لئے کوشاں تھی، میں نے سُنا ہے کہ ان کی کثرتِ لغات کے سبب سے اعلیٰ حضرت حضور نظام نے اُن کو کبھی قاموس کہہ دیا تھا اور خیال تھا کہ ان کو قاموسِ جنگ کا خطاب نہ مل جائے۔

وہ دارالترجمہ میں وضع اصطلاحات کے علاوہ مترجم بھی رہے، اُن کے قلم سے متعدد عربی تاریخوں کے ترجمے اردو میں دارالترجمہ سے شائع ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں تاریخ طبری، طبقات ابن سعد اور تاریخ یعقوبی کے ترجمے انہوں نے غالباً کئے ہیں، مترجم کے علاوہ وہ دارالترجمہ کے ناظر مذہبی بھی رہے، یعنی دارالترجمہ کی مترجمہ اور مؤلفہ کتابوں پر اس حیثیت سے نظر ڈالتے تھے کہ ان میں مذہبی معتقدات اور مذہب کے خلاف کوئی بات تو نہیں اور غالباً اسی خدمت کے بعد اُن کو پنشن ملی، مگر اس پنشن کے بعد بھی انہوں نے حیدرآباد کو نہیں چھوڑا، بلکہ وہیں توطن اختیار کرلیا، اور ان کے فرزند اور بعض عزیز حیدرآباد کی ملازمتوں پر سرفراز کئے گئے اور اب بھی ہیں۔

مرحوم حیدر آباد کی علمی مجلسوں اور محفلوں کے جزء ہو گئے تھے، دائرۃ المعارف اور کتب خانہ آصفیہ جو مملکت دکن کے دو اہم اور عظیم الشان علمی مرکز ہیں، وہ ان دونوں کے مشیر اور رکن رکین تھے۔

مرحوم نہایت خلیق اور ملنسار تھے اور اپنے ہر ملنے والے کی اتنی تعظیم و تکریم کرتے تھے کہ بسا اوقات اس بیچارہ کو یہ غلط فہمی ہو جاتی تھی کہ وہی مخاطب سے ہر حیثیت میں بڑا ہے، لیکن اس باب میں وہ اپنی سادہ فطرت کے ساتھ تکلف کو بھی کام میں لاتے تھے، اس لئے حقیقت مشتبہ ہو جاتی تھی، اُن کو شواذ اور نوادر مسائل سے بھی دلچسپی تھی اور اس لئے وہ کبھی کبھی بطور بحث کسی شاذ رائے کو ثابت کرنے کے لئے بڑا زور لگاتے تھے، لطائف و ظرائف کا ذخیرہ بھی اُن کے پاس کم نہ تھا، کسی بات کو وہ غلط بھی جانتے ہوں مگر "کیا خوب!" وہ اس طرح کہتے تھے کہ سننے والا یہ سمجھتا تھا کہ وہ اس کی تحسین کر رہے ہیں۔

عزیز پروری اُن کی خصوصیت تھی، ایک دفعہ وہ کلکتہ سے اپنے وطن جا رہے تھے اور بہت سے روپیوں کی ضرورت ظاہر کر رہے تھے، میں نے پوچھا اتنے روپے کیا ہوں گے، فرمایا جب گھر جاتا ہوں تو غریب اعزہ آتے ہیں، اُن کی مدد کرنے کو جی چاہتا ہے، ہر ایک کو اس کے حسب حیثیت کچھ دیتا ہوں، حیدر آباد جب میرا جانا ہوتا۔ مرحوم باصرار مدعو کرتے اور ماحضر پیش فرماتے اور طعام و کلام دونوں سے بہرہ اندوز کرتے۔

مرحوم مشرقی تعلیم کے اُن نمونوں میں سے تھے، جن کے مٹنے کے بعد ان کی جگہ ہمیشہ خالی رہے گی، جب وہ کلکتہ سے وطن کو جا رہے تھے تو میں نے کلکتہ میں اپنی تنہائی محسوس کر کے اُن کو ایک خط میں اپنا ہی ایک عربی شعر لکھ کر بھیجا تھا۔

لو انی علمت ما تجسمت بعدہ　　　منحت الفظا ران تمید برکبہا

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ اُن کے بعد مجھے کیا تکلیف ہوگی

تو میں ریل کو روک دیتا کہ وہ اپنے سواروں کو لے کر اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے لیکن اب اس رفیق قدیم کو وہ سفر پیش آیا جس کو شاعرانہ طور پر بھی روکا نہیں جا سکتا، اور جس سفر پر سب کو ایک دن روانہ ہونا ہے اور جہاں کی رفاقت کا حق رفیق اعلیٰ کے سوا کوئی رفیق و عزیز بھی ادا نہیں کر سکتا اور جس سفر کا زادِ سفر عمل کے سوا کچھ نہیں۔ فرحمہ اللہ تعالیٰ۔

۲۶ رشوال ۱۳۶۶ھ بھوپال

ماتم گسار برامکہ کا ماتم

مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری نے جو البرامکہ کے مصنف کی حیثیت سے مشہور تھے، بچاسی برس کی عمر میں ۱۸ فروری ۱۹۴۸ء کو بمقام بھوپال اپنی نواسی کے گھر میں ۳ بجے رات کو یکایک انتقال کیا، وہ کچھ دنوں سے بیمار تھے، اُن کے داماد اُن کو علاج کی خاطر دلی لے گئے تھے اور غرض یہ تھی کہ اُن کے بعض پچھلے مسودات وہاں چھپ جائیں، کہ دلی میں ہنگامہ ہوا، اور لوگوں میں بھگدڑ مچی، مولوی صاحب موصوف کو اُن کے عزیز ہوائی جہاز سے بھوپال لائے، جہاں ایک زمانہ سے مختلف خدمتوں کے تعلق سے اُن کا قیام تھا،

مرحوم سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ دارالعلوم ندوہ کے احاطہ کے اندر اس وقت ہوئی جب علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے سبب سے ملک کے اکابر اور مشاہیر لکھنؤ آئے تھے، البرامکہ میں کم سنی میں پڑھ چکا تھا، مصنف سے واقف تھا۔ سلیمان صاحب پھلواروی اس زمانہ میں دارالعلوم میں قیام فرما تھے، مشتاقوں کا اُن کے پاس ہجوم تھا، انہی میں مولوی عبدالرزاق صاحب تھے، شاہ صاحب نے اُن کی طرف اشارہ کرکے مذاقاً فرمایا کہ یہ برامکہ صاحب ہیں، اس تعارف سے مجھے خوشی ہوئی۔

اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں جب حضرت الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالےٰ حیدرآباد سے قطع تعلق کرکے دارالعلوم میں معتمد ہوکر آئے، تو مرحوم کی آمد و رفت بکثرت ہونے لگی، یہ وہ زمانہ تھا جب مرحوم نظام الملک سلجوقی لکھ رہے تھے اور

اسی سلسلہ سے اپنے مسودات مولانا کو دکھانے لاتے تھے اور ان سے مشورہ لینا چاہتے تھے۔

مرحوم کی علمی استعداد اسی قدر تھی کہ وہ فارسی اچھی طرح جانتے تھے اور عربی سے مانوس تھے اور عبارت سے مطلب سمجھ لیتے تھے، البرامکہ لکھتے وقت اس سے بھی کم واقفیت تھی، اس زمانہ میں ندوہ کا دفتر کانپور میں تھا اور اسی تعلق سے مولوی سید عبدالحیؒ صاحب ناظم ندوۃ العلماء جو بہت اچھے ادیب تھے، کانپور میں رہتے تھے اور منشی عبدالرزاق صاحب جیسا کہ وہ اس وقت کہلاتے تھے البرامکہ لکھ رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے اُن کو فطری مذاق بخشا تھا اور حیات سعدی والمامون وغیرہ سے اُردو میں سوانح نگاری کی ایک طرح پڑ چکی تھی، مرحوم عربی تاریخی اور ادبی کتابوں کو لفظ لفظ دیکھتے تھے اور جہاں برامکہ یا برمکی کا لفظ دیکھتے، نشان لگا دیتے تھے اور بعد کو اس کا مطلب سمجھ کر اس کو اردو میں لکھ دیتے، عربی اشعار کے سارے ترجمے جیسا کہ سنا مولانا سید عبدالحیؒ صاحب کے کئے ہوئے ہیں اور پورا مسودہ حضرۃ الاستاذ کی نظر سے گزارا گیا تھا اور شاید اسی جذبہ کے تحت مصنف نے بڑے ادب کے ساتھ مولانا کے نام اس کو منسوب کیا تھا، اور یہ شعر لکھا تھا۔

مسندِ علم از وجودت منبعِ آداب باد
آستانت قبلۂ جانِ اولی الالباب باد

کانپور میں اس وقت جدید عربی مذاق کا مرکز منشی رحمت اللہ صاحب رعد مالک نامی پریس کانپور کا مطبع تھا، جہاں سے منشی صاحب پہلے ایک مصوّر رسالہ نکالتے تھے اور پھر نامی جنتری نکالنے لگے تھے، منشی عبدالرزاق صاحب اُس وقت جیسا کہ یاد آتا ہے کانپور میونسپلٹی میں ملازم تھے اور وہیں رحمت اللہ رعد اور مولوی عبدالرزاق صاحب میں دوستانہ اتحاد پیدا ہوا، منشی رحمت اللہ رعدؔ صاحب کو سرسید کی تعلیمی تحریک سے دلچسپی اور سرسید کے نورتن سے ادبی لگاؤ تھا، اس تعلق سے مولوی عبدالرزاق بھی

اسی مرکز سے وابستہ ہوئے اور تاریخ کی دلچسپی کے سبب سے خاص طور سے مولانا شبلی سے اُن کو زیادہ اُنس ہوا، مولانا نے "سلسلۂ فرماں روایانِ اسلام" کی بنیاد ڈالی تھی اور المامون لکھ چکے تھے اور الفاروق کا غلغلہ تھا، اس مناسبت سے مولوی عبدالرزاق صاحب کے ذہن میں "سلسلۂ وزرائے اسلام" لکھنے کا خیال آیا اور سب سے پہلے ۱۸۹۷ء میں البرامکہ اور اس کے پندرہ برس بعد ۱۹۱۲ء میں نظام الملک سلجوقی لکھی، اور ملک میں بہت مقبول ہوئی' البرامکہ خصوصیت سے زیادہ مقبول ہوئی اور بہت پڑھی گئی اور کئی دفعہ چھاپی گئی، اخیر اڈیشن ابھی چند سال ہوئے، مرحوم نے نظرِ ثانی کے بعد مع جدید اضافوں کے شائع کیا تھا، ان دو تصنیفات کے علاوہ انہوں نے مضامین بھی لکھے ہیں، مرزا فرحت شیرازی کی کتاب آثارِ عجم سے لے کر ایرانی یادگاروں پر کچھ ان کے مضامین معارف علی گڑھ میں نکلے تھے، زردشت، جاماسپ اور بزرجمہر وغیرہ کی حکایات اور امیروں کے پرانے افسانوں سے بھی اُن کو دلچسپی تھی۔

مرحوم کی پچاسی سال کی عمر کے لحاظ سے ۱۸۶۲ء میں پیدائش ہوئی ہوگی اور اُن کے ہوش کا زمانہ سرسید اور اُن کے رفقاء کی جدوجہد کا دور تھا، وہ علی گڑھ جا کر مولانا شبلی کے یہاں بھی مقیم ہوتے تھے اور خود مولانا بھی ندوہ کے تعلق سے کانپور آتے جاتے رہتے تھے، اس لئے اس دَور کے اکابر اور مشاہیرِ فن سے اُن کی شناسائی تھی، اسی تعلق سے میں نے اُن سے خواہش کی تھی کہ اپنے زمانہ کے دیکھے ہوئے بزرگوں اور ان کی محفلوں کے مشاہدات یک جا کر دیں، چنانچہ اس زمانہ میں جب سر راس مسعود بھوپال میں وزیرِ تعلیم ہو کر آئے، انہوں نے اپنے مشاہدات کو قلمبند کیا اور وہ سلسلہ کسی مقامی پرچہ چھپتا رہا بعد میں اُن مطبوعہ اوراق کو میرے پاس بھیجا کہ میں انہیں مطبع معارف سے شائع کر دوں، مگر یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا، کاغذ کی نایابی سے وہ ہمارے ہاں نہ چھپ سکا اور مؤلف کو واپس کر دیا گیا، سنا ہے کہ وہ حیدر آباد دکن سے چھپ کر شائع ہوا۔

نظام الملک کی قدر دانی نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے پوری کی، ریاست آصفیہ کی طرف سے اُس کے بہت سے نسخے خریدے گئے اور شاید مصنّف بھی انعام سے سرفراز ہوئے، اسی سلسلہ میں حیدرآباد کے ارادہ سے وہ بھوپال وارد ہوئے اور سرکار عالیہ نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ سے ملے، انہوں نے ازرہِ قدردانی اپنی ریاست میں تحصیلداری کے عہدہ پر مقرر کر دیا، یہ واقعہ ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء کا ہوگا، جب کسی ضرورت سے میرا یہاں آنا ہوا تو سابق نواب ولی عہد بہادر کی ڈیوڑھی سے اُن کو وابستہ پایا، اور اُن کی فرمائش سے وہ اس زمانہ میں اُن کے والد نواب احمد علی خاں کی سوانح عمری اور افغان جلال آباد (ضلع مظفر نگر) کی تاریخ قلمبند کر رہے تھے، میں نے مبارکباد دی کہ کیا عجب آپ بھی کسی زمانہ میں یہاں کے نظام الملک بن جائیں، مگر ولیعہد بہادر نے ۱۹۲۴ء میں وفات پائی اور سرکار عالیہ نے اُن کو تاریخ اسلام لکھنے پر مقرر فرمایا، یہ اس کو ایک مدت تک انجام دیتے رہے، مگر پھر بساط ایسی اُلٹی کہ گوشہ نشین سے ہوگئے، اس کے بعد سر راس مسعود نے اپنی وزارت تعلیم کے عہد میں جب تالیف و ترجمہ کا ایک سرکاری ادارہ قائم کیا تو مرحوم اس کے اسٹاف میں داخل ہوئے اور تاریخ بھوپال وغیرہ کی طرح ڈالی، مگر سر راس مسعود کا زمانہ جلد ختم ہوگیا اور ۱۹۳۵ء میں انتقال کر گئے، تو یہ ارادہ بھی خوابِ پریشان ہو کر رہ گیا۔

وہ ادھر ضعفِ عمر کے سبب سے کمزور بھی ہوگئے تھے، تاہم کچھ نہ کچھ لکھتے پڑھتے رہتے تھے، اخیر تصنیفات تاریخ اسلام وغیرہ کے مسودات اُن کے وارثوں کے پاس ہیں اور عجب نہیں کہ وہ اُن کو شائع کریں۔

مرحوم چونکہ یوپی سے بھوپال آگئے تھے اور وہاں کے علمی و ادبی حلقوں سے الگ ہوگئے تھے، اس لئے لوگ اُن کی زندگی ہی میں بھول چکے تھے اور انہیں خود بھی یہ خیال تھا کہ لوگ انہیں مردہ سمجھ چکے ہوں گے، اس لئے مجھ سے دو دفعہ

غالباً یہ خواہش کی کہ میں اُن کی زندگی کی خوشخبری لوگوں کو پہنچا دوں، چنانچہ معارف کے شذرات میں اُن کی یہ تحریریں ہوں گی۔

مولانا شبلی مرحوم کے دوسرے دوستوں کے ساتھ میں جو ادب ملحوظ رکھتا تھا، وہی اُن کے ساتھ رکھتا تھا اور وہ بھی مجھے اپنے عزیزوں میں شمار کرتے تھے۔ آج اس مساوات کے زمانہ میں ہمارے نوجوان خوردی و بزرگی کے ان آداب کو شاید نہ سمجھ سکیں۔

۱۸ فروری ۱۹۴۸ء کی دوپہر کو دفتر دار القضاء میں ٹیلیفون سے مجھے کسی نے مطلع کیا کہ رات مولوی عبدالرزاق صاحب نے انتقال کیا، ۲ بجے نماز جنازہ ہوگی اور امن شاہ کے تکیہ میں مدفون ہوں گے، لیکن افسوس کہ جب میں قبرستان میں پہنچا تو ان کے احباب اور اعزہ اُن کو دفن کر کے واپس جا چکے تھے اور اس وقت ان کی قبر کو مزدور پتھر سے گھیر رہے تھے، دعائے مغفرت پڑھی اور اُن کے عزیز کے گھر جا کر جہاں انہوں نے وفات پائی تھی فرض تعزیت ادا کیا۔

مرحوم بلند بالا، خوش خلق اور متواضع تھے، ہر حال میں وہ اپنے علمی کاموں میں منہمک رہتے تھے، اب زمانہ کے حالات میں جو انقلاب ہو رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ایسے شائقین و خدمت گزارانِ علم و ادب کی توقع بہت کم کی جا سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

مارچ ۱۹۴۸ء

مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری

مہینوں سے اخبار نہیں پڑھتا کہ اُن کو پڑھ کر ایک ایسے شخص کو جو ملک میں ہر طرح امن وامان اور مہر ومحبت کا طالب ہو دلی صدمہ پہنچتا ہے، اسی لئے مولانا کی وفات کی خبر ان کے صاحبزادوں کے خطوط سے ہوئی، میں نے اُن کے صاحبزادوں کو لکھا کہ مرحوم کے کچھ ابتدائی تعلیمی حالات مجھے لکھ کر بھیجیں۔

لیکن اُن کا پھر کوئی جواب نہیں آیا، البتہ اخبارات کے چند تراشے ملے، جن میں وفات کی خبر کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

مرحوم کا وطن صوبہ بہار میں شہر داناپور متصل پٹنہ تھا، مگر وہ ایک عرصہ سے کلکتہ میں طبیب کی حیثیت سے مقیم تھے اور گویا اب وہی اُن کا گھر ہو گیا تھا، مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ انہوں نے تعلیم وتربیت کن اساتذہ سے حاصل کی، مگر گفتگو اور تحریر سے پتہ چلتا تھا کہ ان کو علوم دینیہ میں پوری دسترس حاصل تھی، پھر کلکتہ میں رہ کر اور سیاسی جلسوں میں شرکت کے سبب سے وہ زمانہ کی ضروریات اور عصری خیالات وافکار سے پوری طرح آگاہ تھے اور ان علماء میں تھے جو قدیم علوم واعتقادات فقہ کو جدید خیالات وافکار سے تطبیق دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔

میری ان کی پہلی جان پہچان اس وقت ہوئی جب میں ۱۹۱۳ء میں الہلال کلکتہ کی ادارت میں شرکت کے لئے کلکتہ پہنچا اور اس تقریب سے کئی مہینہ کلکتہ رہنے کا اتفاق ہوا تو مختلف جلسوں میں اُن سے گفتگو، بات چیت اور میل جول کی نوبت آئی، پھر ۱۹۱۷ء یا ۱۹۱۸ء میں مجلس علمائے بنگالہ کی صدر کی حیثیت سے جب میرا کلکتہ

جانا ہوا اور یہ وہ وقت تھا جب اسی کے ساتھ لیگ اور کانگریس کے سالانہ اجلاس بھی وہاں ہو رہے تھے اور ہندو اور مسلمان تمام ملک کے نمائندے وہاں جمع تھے اور بیت المقدس کی انگریزی فتح کا حادثہ تازہ تھا اور طبائع میں بڑا ہیجان تھا، مرحوم سے ملنے کا موقع ہاتھ آیا اور خیال آتا ہے کہ اُن کی قیامگاہ پر بھی جانے کا اتفاق ہوا جو چونا گلی میں تھی اور جہاں مرحوم نے وفات پائی۔

۱۹۱۶ء میں ہندوستان میں ایک مسئلہ زیر بحث تھا اور وہ یہ کہ پنجاب کی ایک مسلمان عورت نے جو اپنے شوہر کے مظالم اور عدم نفقہ سے تنگ آچکی تھی، اس سے چھٹکارے کے لئے علماء سے استفسار کیا تھا، مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی نے حنفیہ کے مسلک کے مطابق اس کو جواب دیا کہ اسلام میں اُس کے لئے کوئی مخلص نہیں، اس پر آریہ اخباروں نے اسلام کو اُس کی تنگ دامانی کا طعنہ دیا، اس کو پڑھ کر مولانا ابوالکلام نے بعض فقہائے تابعین اور ائمہ فقہ کے مسلک کے مطابق مولانا ٹونکی کے فتووں کی تردید کی اور لکھا کہ تین ماہ کے انتظار کے بعد بھی اگر شوہر اپنی بیوی کے نان و نفقہ کا انتظام نہ کرے اور بیوی مطالبہ کرے تو قاضی زوجین میں تفریق کرسکتا ہے، مولانا داناپوری نے مولانا ابوالکلام کے فتویٰ کی تغلیط کی اور کلکتہ کے اخبارات میں ایک مفصل مضمون اس کے جواب میں لکھا، یہ معارف کی اشاعت کا پہلا سال تھا، خاکسار نے ان تینوں صاحبوں کے فتووں پر ایک محاکمہ لکھا، جو معارف کی پہلی جلد میں "زوجہ غیر منفق علیہا" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اور جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ نہ تو مطلقاً مولانا ابوالکلام کا فتویٰ صحیح ہے اور نہ مولانا عبدالرؤف صاحب کا اور نہ تو مولانا ابوالکلام کی وسعت صحیح ہے اور نہ مولانا داناپوری کی تنگی، بلکہ یہ سب فتوے الگ الگ مختص حالات سے مخصوص ہیں، کسی کہنے والے نے مجھ سے نقل کیا کہ مولانا داناپوری نے میرے اس مضمون کو پڑھ کر فرمایا کہ ہاں! یہ مضمون ایک

پڑھے لکھے شخص کا ہے۔

پھر مرحوم سے جمعیۃ العلمائے کلکتہ کے اجلاس کے موقع پر ملاقات ہوئی اور آخری ملاقات آٹھ دس برس ہوئے اس وقت ہوئی جب مسلم تعلیمی کانفرنس علی گڑھ کا اجلاس کلکتہ میں ہوا جس میں کمال یار جنگ تعلیمی تحقیقاتی کمیٹی مقرر ہوئی تھی، یہ وقت ملکی سیاسیات کے ایک نئے پہلو کا تھا۔

مرحوم سیاسیات میں جمعیۃ العلماء کے ساتھ تھے اور اس کے بعض جلسوں کی صدارت بھی کر چکے تھے، لیکن آخر میں اس سے الگ ہو کر مسلم لیگ میں منسلک ہو گئے تھے اور جمعیۃ علمائے اسلام میں داخل ہو گئے تھے اور اس حیثیت سے وہ بنگال کی اسلامی سیاست پر بہت اثر انداز تھے۔

مرحوم علوم دینیہ کے علاوہ زمانۂ حال کے حالات وخیالات سے بھی پوری باخبر تھے، جس کا ثبوت اُن کے وہ مختلف خطبات ہیں جو انہوں نے مختلف مجلسوں میں پڑھے اُن کا جمعیۃ العلماء کا خطبۂ صدارت اُن کی سیاسی بصیرت کا آئینہ ہے، چند سال ہوئے جامعہ ملیہ دہلی میں اسلام کے سیاسی ومعاشی اور دوسرے عصری مشکلات پر جو خطبہ ارشاد فرمایا اہل بصیرت نے اس کی بے حد قدر کی ان کی زندگی کا سب سے آخری کارنامہ ابھی چند ماہ ہوئے مشرقی بنگال کے ایک مذہبی وتبلیغی جلسہ میں ان کا حکیمانہ خطبہ ہے، جس میں پاکستان کی سیاسی حیثیت اور سیاسی مجبوریوں کی بنا پر اصولِ خلافت کی بنیاد پر حکومت کی تاسیس کی معذوریوں کا بیان تھا، یہ خطبہ بھی اُن کی سیاسی فہم وتدبر کا نمونہ ہے۔

مرحوم ایک ممتاز طبیب، ایک مشہور عالم، ایک خوش بیان خطیب اور ایک مفکر ہونے کے ساتھ مصنف بھی تھے، چنانچہ ان کی تصنیفات میں سب سے اہم کتاب اصح التیر ہے، جو افسوس ہے کہ اُن کی وفات سے ناتمام رہی۔

مولانا اونچا سنتے تھے، اس لئے ہمیشہ ایک آلہ ساتھ رکھتے تھے، جس کو لگا کر دوسروں کی بات سنتے تھے تاہم اُن سے ملنے جلنے والوں کا بڑا حلقہ تھا، اور کلکتہ میں اُن کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اہل علم اور اہل سیاست دونوں میں اُنکا خیر مقدم تھا، وہ متواضع، سادہ مزاج اور خلیق تھے۔ چھوٹے بڑے سب سے یکساں ملتے تھے۔

مرحوم کی عمر اس وقت ۷۴ سال کی تھی، جس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۸۷۴ء میں اُن کی ولادت ہوئی ہوگی، ۱۹، فروری ۱۹۴۸ء کی صبح کو جمعرات کے دن ۸ بجے کے قریب اُن کی علالت کی ابتدا ہوئی، فرمایا کہ بخار معلوم ہوتا ہے، تھوڑی دیر کے بعد جاڑا معلوم ہوا، دن بھر کچھ بخار رہا، مغرب کی نماز تک کوئی خاص بات نہ تھی، ساڑھے سات بجے شام سے حالت بگڑی، یہاں تک کہ رات کو ایک بجے داعی اجل کو لبیک کہا، مرحوم کی وفات سے کلکتہ کی سرزمین علم وعرفان کے نور سے محروم ہوگئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو روشن کرے۔

مئی ۱۹۴۸ء

یعقوب بخش راغب قادری بدایونی

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی (لکچرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے خط سے یہ معلوم کرکے دل کو بڑا رنج ہوا کہ میرے پرانے دوست مولوی یعقوب بخش صاحب راغب بدایونی نے ۲۱ فروری ۱۹۴۸ء کو علیگڑھ میں جہاں وہ دینیات کے استاد تھے، اچانک قلب کی حرکت بند ہوجانے سے وفات پائی، جنازہ علی گڑھ سے بدایوں لیجایا گیا اور درگاہ قادریہ میں وہ سپرد خاک ہوئے، عمر غالباً ساٹھ برس کے قریب ہوگی۔

مرحوم بدایوں کے ایک نامور اور صاحب علم گھرانے سے تھے، اُن کے پرنانا مولوی علی بخش صاحب صدر الصدور تھے، جن سے سرسید کے تحریری مناظرے ہوئے ہیں کیا عجیب بات ہے کہ اس کا پرناتی جس کا پرنانا سرسید سے ایسا مذہبی اختلاف رکھتا تھا جس میں کفر واسلام تک کا تفرقہ تھا وہ سرسید کی تعلیم گاہ میں دینیات کا مدرس ہوکر رہا۔

مرحوم سے میرے تعلقات بڑے پُرانے تھے، اُن کا آغاز شعر وسخن سے ہوا، مرحوم اُردو کے اچھے شاعر تھے، انہوں نے اپنا کلام مجھے میری رائے معلوم کرنے کو بھیجا، میں نے اس کی بڑی داد دی اور اس طرح مکاتبت کا سلسلہ جاری ہوا پھر تحریکِ خلافت کے زمانہ میں محبِ عزیز (جن کا نام اب بھی محبت کے ساتھ زبان پر آتا ہے) مولانا عبدالماجد صاحب مرحوم بدایونی کے توسط سے معرفت اور شناسائی کا تعلق دوستی سے بدل گیا، ملاقات کا اتفاق بدایوں کے ایک جلسۂ خلافت کے سلسلہ میں ہوا، جس میں مولوی عبدالماجد صاحب بدایونی مجھے صدر بنا کر لے گئے تھے اور کئی روز

اُن کے مکان پر ٹھہرنا پڑا۔

مرحوم عربی کے بڑے عالم، ادب ولغت کے فاضل اور ہیئت ونجوم کے استاد تھے، عربی میں قصیدے بہت لکھے اور بہت اچھے لکھے، بدایوں کے سلسلۂ قادریہ میں حبِ رسول کی بنا پر سیادت سے بے انتہا شیفتگی ہوتی ہے، اس سلسلہ میں مرحوم کو مجھ "بدنام کنندۂ نکونامے چند" سے بھی محبت کی عقیدت تھی، چنانچہ اپنے عربی قصیدوں کو میری طرف نسبت دے کر میری عزت بڑھائی۔

ہیئت ونجوم سے اُن کو خاص ذوق تھا، اُن کے گھر میں بزرگوں کا اندوختہ بڑا اچھا کتب خانہ تھا، جس میں بعض نادر قلمی کتابیں تھیں، انھیں میں محقق طوسی اور دوسرے قدیم مسلمان علمائے ہیئت کے قدیم رسالے تھے، مرحوم نے اپنے ذوق سے ان کو پڑھ کر اور صحیح کر کے الانجم الطوالع کے نام سے شائع کیا، سر شاہ سلیمان مرحوم کے اشارہ سے علامہ بیرونی کی قانون مسعودی کے کچھ اجزاء کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔

مرحوم نے درس نظامیہ کے اسباق مولانا رفاقت اللہ اور مولانا فضل احمد بدایونی سے پڑھے تھے، تبرکاً چند سبق مولانا عبدالمقتدر بدایونی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی پڑھے حدیث میں اُن کا سلسلۂ تلمذ مولانا سید یونس علی صاحب المتوفی ۱۳۵۹ھ بدایونی کے شاگرد مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی کے واسطے سے خاندان ولی اللّٰہی تک اور معقول میں مولانا محب احمد صاحب بدایونی المتوفی ۱۳۳۹ھ کے توسط سے خانوادۂ خیرآباد تک منتہی ہوتا ہے، اردو شاعری میں شیخ احمد علی شوق لکھنوی کے شاگرد تھے اور بیعت سلسلۂ قادریہ میں مولانا عبدالقادر صاحب بدایونی رحمۃ اللہ تعالیٰ سے حاصل کی تھی، عقیدہ میں سنت حنفی سنّی قادری تھے، تاہم اس سختی میں لچک اتنی تھی کہ مجھ جیسے نرم وگرم سے بھی نباہ کر لیتے تھے۔

پہلے گھر ہی پر بدایوں میں پڑھنے پڑھانے کا شغل رکھتے تھے، ۱۹۲۸ء میں مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں مقرر ہو کر علی گڑھ منتقل ہو گئے تھے۔

مرحوم کی دوستی کا ایک نادر تحفہ یہ تھا کہ جب اُن کا جی چاہتا، بدایوں کے کے پیڑے ڈاک سے اعظم گڑھ بھیجتے اور اس کے معاوضہ میں صرف ایک تشکر کا ہدیہ کافی سمجھتے، اُن کا سب سے آخیر خط مجھے بھوپال میں ملا، جس میں اپنے ہونہار صاحبزادہ کا تعارف مجھ سے کرایا تھا، اللہ ان صاحبزادہ کو علم دنیا کے ساتھ علم دین کا حصہ بھی عنایت کریں اور اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر قائم رکھیں۔

مئی سنہ ۱۹۴۸ء

مولانا ثناء اللہ امرتسری

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر جو قیامت گزری، اس کی تاریخ قیامت تک ناقابل فراموش رہے گی، مسلمانوں کے لئے یہ سانحہ کتنا حسرتناک ہے کہ اب امرتسر سے لے کر دلّی کے کناروں تک ساری مسجدیں بےچراغ خانقاہیں سُونی، مدرسے بے نشان اور کتب خانے ویران ہوگئے، اسی حادثہ میں مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری کے صاحبزادہ عطاء اللہ سناہے بحالت نماز شہید ہوئے، اُن کا کتب خانہ لُٹ گیا اور وہ خود مع خاندان بہزار خرابی گوجرانوالہ پہنچے اور اب خبر آئی ہے کہ انہوں نے ۱۶ر مارچ ۱۹۴۸ء کو بعارضۂ فالج وفات پائی، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔

مولانا ہندوستان کے مشاہیر علماء میں تھے، فن مناظرہ کے امام تھے، خوش بیان مقرر تھے، متعدد تصانیف کے مصنف تھے، مذہباً اہل حدیث تھے اور اخبار اہلحدیث کے اڈیٹر تھے، قومی سیاسیات کی مجلسوں میں کبھی کبھی شریک ہوتے تھے۔

مرحوم سے مجھے نیاز اپنی طالب علمی ہی سے تھا، وہ سال میں ایک دو دفعہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں آتے جاتے لکھنو آتے تھے اور دارالعلوم ندوہ میں تشریف لاکر احباب سے ملتے تھے، اسی سلسلہ میں مجھے بھی نیاز حاصل ہوا، ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مرحوم مدرسہ میں تشریف لائے، میں درس میں تھا، ان کو آتا دیکھ کر اُن کی طرف لپکا، مگر مرحوم نے میرے بجائے سبقت استاذی شمس العلماء

مولانا حفیظ اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف کی اور حدیث کا یہ ٹکڑا پڑھا۔
کَبِّرِ الکُبَرَ یعنی بڑے کو بڑائی دو۔

مرحوم ندوہ کے رکن بھی اکثر رہے، بلکہ خود اُن کے بقول ندوہ کانپور میں اُن کی دستار بندی ہی کے جلسہ میں پیدا ہوا، مرحوم نے ابتدائی تعلیم کے بعد کچھ دنوں مدرسہ دیوبند میں پڑھا، پھر وہ کانپور آکر مدرسہ فیض عام میں داخل ہوئے اور یہیں ۱۳۱۴ھ میں فراغت پائی۔

یہ زمانہ وہ تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے دعووں سے پنجاب میں فتنہ پیدا ہوگیا تھا، انہوں نے مرزا کے خلاف صف آرائی کی اور اس وقت سے لے کر آخر دم تک اس تحریک اور اس کے امام کی تردید میں پوری قوت صرف کر دی، یہاں تک کہ طرفین میں مباہلہ ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صادق کے سامنے کاذب نے وفات پائی۔

یہ پُرانے قصے ہیں جن کو دُہرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔

موجودہ سیاسی تحریکات سے پہلے جب شہروں میں اسلامی انجمنیں قائم تھیں، اور مسلمانوں اور قادیانیوں اور آریوں اور عیسائیوں میں مناظرے ہوا کرتے تھے، تو مرحوم مسلمانوں کی طرف سے عموماً نمائندہ ہوتے تھے اور اس سلسلہ سے وہ ہمالیہ سے لیکر خلیج بنگال تک دواں اور رواں رہتے تھے۔

اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جس نے بھی زبان کھولی اور قلم اٹھایا۔ اس کے حملے کو روکنے کے لئے اُن کا قلم شمشیر بے نیام ہوتا تھا اور اسی مجاہدانہ خدمت میں انہوں نے عمر بسر کر دی۔ فجزاہ اللہ عن الاسلام خیر الجزاء۔

وہ مصنف بھی تھے، مخالفین اسلام کے اعتراضوں کے جواب میں اُن کے اکثر رسالے ہیں، اُن کی تصنیفات میں دو تفسیریں خاص ذکر کے قابل ہیں، تفسیر ثنائی

اُردو میں اور تفسیر القرآن بالقرآن عربی میں، مرحوم کو خود بھی یہ تفسیریں پسند تھیں، مرحوم چونکہ مناظر تھے، اس لئے پہلی تفسیر میں آیات صفات کے باب میں سلفی عقائد کے بجائے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی پیروی میں تاویل کی راہ اختیار کی تھی، اس سے امرتسر کے غزنوی علمائے اہلحدیث نے اُن کی بشدت مخالفت کی، ۱۹۲۶ء میں جب حج کی تقریب سے خاکسار اور مرحوم اور دیگر علمائے اہلحدیث کا حجاز جانا ہوا، تو یہ نزاع سلطان ابن سعود کے سامنے بھی پیش ہوا اور سلطان نے کوشش کرکے فریقین میں صلح کرادی، مرحوم مجھ سے فرماتے تھے کہ افسوس ہے کہ نجد کے علماء حضرت شاہ ولی اللہ کی قدر و قیمت سے واقف نہیں اور مجھ سے چاہتے تھے کہ میں اس باب میں سلطان سے کچھ عرض کروں۔

مرحوم کبھی کبھی قومی جلسوں میں بھی شرکت کرتے تھے، ۱۹۱۲ء میں ندوہ کی تحریک اصلاح کے سلسلہ میں جب حکیم اجمل خاں مرحوم کی دعوت پر دہلی میں ایک عظیم الشان اجلاس ہوا، جس میں سارے ہندوستان کے مسلمان نمائندے شریک تھے، تو مولانا شبلی کی تحریک پر مرحوم ہی صدر مجلس قرار پائے تھے، ۱۹۱۹ء میں جب تحریک خلافت کا پہلا ابتدائی جلسہ لکھنؤ میں ہوا، جس میں سارے ملک کے اکابر اور مشاہیر جمع تھے، اس میں بھی مرحوم شریک تھے، ۱۹۲۵ء کی جمعیۃ العلماء کے اجلاس کلکتہ میں جس میں اس خاکسار کی صدارت تھی مرحوم موجود تھے اور خاص طور سے اس لئے آئے تھے کہ جمعیۃ کے اس اجلاس میں دارالحرب میں سود کے مسئلہ پر بحث کرنے والے تھے، حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ اور دوسرے علمائے دیوبند بھی تشریف فرما تھے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر حضرات علماء دیوبند حنفیہ کے مشہور مسلک لاربوا بین الحربي والمسلم فی دار الحرب پر متفق ہوں تو میں بھی تائید کروں گا، مگر علماء میں نجی گفتگو ہوکر رہ گئی، کھلے اجلاس میں کوئی بحث نہیں ہوئی۔

مرحوم ۱۹۲۶ء میں حجاز کے موتمر اسلامی میں نمائندہ اہلحدیث کی حیثیت سے شریک تھے اور عربی میں ایک دو مختصر تقریریں بھی اپنے طرز کی موتمر میں کی تھیں، مدینہ منورہ بھی حاضر ہوئے تھے، کہتے تھے کہ جو اہلحدیث یہاں نہ آئے وہ محبت سے خالی ہے (اُن کا اصل فقرہ اس وقت پوری طرح یاد نہیں)۔

مرحوم کو ایک دفعہ مجھ سے شکایت بھی پیدا ہوئی، اُس کی صورت یہ ہوئی کہ دس پندرہ برس ہوئے، مرحوم اوران کے حنفی حریف مولانا عبدالعزیز صاحب خطیب گوجرانوالہ مصنف اطراف بخاری کے درمیان حدیث وَإِذَا قَرَءَ الْإِمَامُ فَأَنْصِتُوْا کے صحیح مسلم میں موجود ہونے یا نہ ہونے پر اخبارات میں تحریری مناظرہ ہو رہا تھا، فریقین نے اس باب میں مجھے حکم مانا، میں نے مولانا مرحوم سے کچھ پوچھے بغیر صرف دونوں کی تحریروں کو دیکھ کر فیصلہ مرحوم کے خلاف اور مولانا عبدالعزیز صاحب کے موافق کیا۔ جس پر مرحوم نے مجھے لکھا حتی یسمع من الاٰخر کی بنا پر طرف ثانی کا بیان سُنے بغیر آپ نے فیصلہ کیسے کر دیا، مگر اُن کی یہ شکایت محض مناظرانہ تھی، ورنہ اس کے بعد بھی ان کی شفقت میرے حال پر ویسی ہی رہی، ڈاکٹر اقبالؔ کی وفات کے بعد جب میرا لاہور جانا ہوا اور اُن کو خبر ہوئی تو مجھے پیغام بھیجا کہ واپسی میں ان سے ملے بغیر نہ جاؤں، چنانچہ واپسی میں امرتسر اترا اور اُن کے پاس دو دن ٹھہرا اور بہت سی باتیں ہوئیں، جن میں سے ایک جیسا کہ خیال آتا ہے اہلحدیث کے انتشار اور پراگندگی کی گفتگو تھی، میں مرحوم کو لکھتا رہتا تھا کہ آپ آمین اور رفع یدین وغیرہ مسائل فقہ پر جن کا ہر پہلو جائز اور ثابت ہے، مناظرانہ تحریروں میں وقت ضائع نہ کریں، مگر وہ اُن کی اہمیت پر بھی مصر تھے۔

اُن کی عمر میرے خیال میں اسّی ۸۰ سے کچھ متجاوز ہوگی، ابھی چند سال ہوتے وہ گر پڑے تھے، جس سے کولھے کی ہڈی پر چوٹ لگی تھی، جس کے سبب سے وہ چلنے

پھرنے سے معذور ہو گئے تھے، پنجاب کے گزشتہ حادثہ میں ان کے جوان بیٹے کی مفارقت کا اثر یقیناً بڑا ہوگا، لیکن اُس کے بعد پاکستان و ہندوستان کے درمیان جو دیوار قائم ہوگئی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجھے مرحوم کی وفات کی اطلاع بھی اس سے پہلے نہیں ہوئی اور یہ اطلاع بھی جمعیۃ العلماء دہلی کے تازہ جلسہ میں تعزیت کی تجویز سے ہوئی انا للہ، اگر کوئی صاحب اُن کی وفات کی تاریخ و روز و وقت و مقام سے مطلع کریں تو ممنون ہوں گا۔

مرحوم اسلام کے بڑے مجاہد سپاہی تھے، زبان اور قلم سے اسلام پر جس نے بھی حملہ کیا اُس کی مدافعت میں جو سپاہی سب سے آگے بڑھتا وہ وہی ہوتے، اللہ تعالیٰ اس غازی اسلام کو شہادت کے درجات و مراتب عطا فرمائے۔

مئی ۱۹۴۸ء

قائد اعظم محمد علی جینا رحمہ اللہ

افسوس ہے کہ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء کی شب کو قائد اعظم محمد علی جناح کا کراچی میں بہتر برس کی عمر میں انتقال ہو گیا، پاکستان و ہندوستان اور عالم اسلام نے اس حادثہ پر بڑا صدمہ محسوس کیا، دوسرے دن عصر کے وقت کئی لاکھ کے مجمع میں اُن کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور تدفین عمل میں آئی، عام مسلمانوں میں اُن کو جو ہر دلعزیزی حاصل تھی اس کا اثر یہ ہے کہ ہندوستان اور اکثر اسلامی ملکوں، ریاستوں اور شہروں نے اُن کا ماتم کیا اور اُن کے لئے قرآن خوانی اور مغفرت کی دعا کی گئی۔

مرحوم کے سیاسی کارنامے آفتاب کی طرح روشن ہیں، وہ بڑے قانون داں، بڑے مناظر اور اجتماعیات کے بڑے نبض شناس تھے اور اپنے پیروں پر بلا کا اثر رکھتے تھے، اُن کی بڑی خصوصیت اپنی بات پر جم کر دوسروں سے اپنی بات منوانے کی قوت تھی، انہوں نے اپنی اس قوت کا مظاہرہ پاکستان کے مطالبہ میں پوری طرح کیا اور بالآخر کامیابی حاصل کی اور ایک ایسی حکومت قائم کی جس کا دعویٰ ہے کہ وہ اس وقت سب سے بڑی اسلامی حکومت ہے اور آبادی کے لحاظ سے دنیا میں اس کا پانچواں درجہ ہے۔

ہندوستان کی سیاست میں مرحوم کا بڑا حصہ ہے اور ۱۹۱۶ء سے لے کر جب لیگ اور کانگریس میں اُن کی کوشش سے مشہور پیکٹ ہوا، ۱۹۴۸ء تک سوائے ان چند سالوں کے جب وہ ترک موالات کی تحریک میں کانگریس سے الگ ہو گئے

ہمیشہ ایک لیڈر کی حیثیت سے ملک میں ممتاز رہے، اُن کی نسبت اُن کے دوست اور دشمن ایک بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ نہ کبھی حکومتِ وقت سے ڈرے اور نہ جاہ و منصب کی کوئی حرص و طمع اُن کو اپنی جگہ سے ہلا سکی۔

مرحوم پاکستان کے بانی اور یہ کہنا چاہئے کہ اس کی کشتی کے تنہا ملاح تھے، ایسے طوفانِ حوادث کے موقع پر جب ہر ملک اندرونی و بیرونی خطروں سے گھرا ہوا ہے، ان کی وفات حد درجہ افسوسناک ہے، یہ وہ وقت ہے جب پاکستان کے حکمران اور رہنما صرف اپنی بے لوث خدمت، مخلصانہ کوشش، سادہ زندگی، ایثار، حُبِ ملت عاقبت اندیشی اور ذاتی اغراض سے بلند ہو کر باہمی اعتماد سے پورے ضبط و نظم کو قابو میں لاکر اپنی مملکت کو نشو و نما دے سکتے ہیں اور تاریخ میں نئے شاندار کارناموں کا اضافہ کر سکتے ہیں، ورنہ اُن کی ذرا سی غلطی اس نئے ملک کو ایسا سخت صدمہ پہنچائے گی جس سے وہ صدیوں تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

مرحوم سے میری ذاتی ملاقات کبھی نہیں ہوئی، البتہ چار دفعہ اُن کو دُور دُور سے اور ایک دفعہ نزدیک سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، پہلی دفعہ میں نے انہیں اس وقت دیکھا جب ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس تھے، اور وہ پہلی دفعہ مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں میں ظاہر ہوئے، سابق مہاراجہ محمود آباد کی سرکردگی میں لکھنؤ نے ان کا شاندار شاہانہ استقبال کیا تھا، اس وقت یہ نظم موزوں ہوئی۔

اِک زمانہ تھا کہ اسرار دروں مستور تھے — کوہِ شملہ جن دنوں ہم پایۂ سینا رہا
جب ہمارے چارہ فرما زہر کہتے تھے اُسے — جس پہ اب موقوف ساری قوم کا جینا رہا
بادۂ حُبِّ وطن کچھ کیف پیدا کر سکے، — دور میں یوں ہی اگر یہ ساغر و مینا رہا
علتِ دیرینہ سے گو اصلی قویٰ بیکار ہیں — گوشِ شنوا ہے، نہ ہم میں دیدۂ بینا رہا

پر مریضِ قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ اُمید
ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا

اس کے بعد دوسرے سال بمبئی میں لیگ و کانگریس کے اجلاس ہوئے، مسلم لیگ کے صدر مظہر الحق مرحوم تھے اور جینا صاحب اس اجلاس کے بانی اور داعی تھے لیکن مسلم لیگ کا یہ جلسہ جیسا کہ اس وقت سمجھا گیا انگریزی حکومت کے چند کارندوں کی شرارت سے درہم برہم ہو گیا، یہ مرحوم قائد اعظم کے دیکھنے کا دوسرا موقع تھا، اس وقت قلم نے یہ نظم لکھی۔

حق و باطل مدتوں تک معرکہ آرا رہا
ابر، خورشیدِ حقیقت پر بہت چھایا رہا

پر شبِ تاریک اب تاریک پہلی سی نہیں
ملک میں پچھلے دلوں کچھ کچھ اجالا سا رہا

وہ زمانہ جا چکا جب بُت پرستی عام تھی
جب خدا کا حکم، ہر عیّار کا ایما رہا

جب متاعِ رہنمائی تھی سزاوارِ خرید
جب کہ ہر قارون پہ ہم کو خضر کا دھوکہ رہا

پھر بھی تمیزِ حق و باطل کا وہ جوہر نہ تھا
جو ہمیشہ قوم میں شمعِ رہِ صحرا رہا

رزمگاہِ نور و ظلمت بمبئی مدت سے ہے
گر یہیں انوارِ حق چمکے تو کیا بے جا رہا

آیتِ قرآں کہ جاءَ الحق مصدق ہو گئی
مجلسِ آئین ہماری "مظہرِ حق" ہو گئی

تیسرا موقع یہ آیا کہ ۱۹۲۱ء میں خلافت کی تحریک کے زمانہ میں محمد علی مرحوم اڈیٹر کامریڈ کے ساتھ جناح صاحب کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا، جہاں دونوں لیڈروں میں اس وقت کے مسئلوں پر گفتگو ہوئی اور جس کا خاتمہ بالآخر ایک کی دوسرے سے علیحدگی پر ہوا۔

اس کے بعد میں نے انہیں ناگپور کی کانگریس میں دیکھا جب ترکِ موالات کی تجویز کی مخالفت کے لئے وہ کھڑے ہوئے اور پورے جلسہ کی مخالفت کے باوجود وہ اپنی بات پر اڑے رہے اور اس کے بعد وہ کانگریس کے اجلاس

بلکہ کانگریس سے نکل گئے اور پھر اس میں شریک نہیں ہوتے، سالہا سال کے بعد ابھی دو سال ہوئے جامعہ ملیہ کی جوبلی میں انہیں دیکھا اور ان کی تقریر سُنی۔

ایک بات زبان پر آکر رکتی نہیں، کسی کی پسند ہو یا ناپسند ہو اب یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کا برِ اعظم ایک بار پھر دو مملکتوں میں بٹ گیا، اب ان دونوں مملکتوں کی بقا اُن کے درمیان صلح و آشتی سے ہو سکتی ہے۔ ان دونوں مملکتوں میں ہزارہا خاندانوں کے لاکھوں افراد بکھر گئے ہیں، اُن کی سلامتی ان دونوں مملکتوں کی سلامتی و خیرخواہی ہی میں ہے، اس لئے ان دونوں میں جتنا زیادہ باہمی اتحاد اور اعتماد بڑھے — اتنا ہی انسانیت اور دنیا کے امن کے لئے مفید ہے۔

نواب غلام احمد کلامی مدراس

ہمارے بوڑھے قومی خدمت گزاروں میں مدراس کے ایک بزرگ نواب غلام احمد کلامی تھے، پچھلے رہنمایان ملت کے کاموں میں یہ ہمیشہ ہاتھ بٹاتے رہے اور ان کی رفاقت کا دم بھرتے رہے، ندوۃ العلماء کی تحریک سے احاطۂ مدراس میں جن بزرگوں کو دلچسپی تھی، ان میں ایک نام اُن کا بھی ہے، اسی تعلق سے ندوہ کی رُودادوں میں اُن کے تذکرے آئے ہیں، مکاتیب شبلی میں مولانا ابوالکلام کے نام خطوں میں بھی اُن کا ذکر ہے، افسوس ہے کہ مرحوم نے ۸۳ برس کی عمر میں ۲۵ دسمبر ۱۹۴۸ء، ۱۱ ماہ صفر المظفر ۱۳۶۷ھ کو بروز جمعرات بوقتِ عصر اس جہانِ فانی کو الوداع کہا۔

اُن کا قیام اور کاروبار کولار واقع ریاست میسور میں تھا۔ جہاں سونے کی کان ہے۔ وہ ریاست میسور کی اسمبلی میں مسلمانوں کے نمائندے بھی رہے تھے اور وہاں کے مسلمانوں کی خدمت کرتے تھے، معارف کے قدردانوں میں تھے، شروع سے آخیر دم تک وہ اس کے خریدار رہے، خاکسار کو سب سے پہلے ۱۹۱۲ء میں جب مدراس میں بنگلور ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کا اتفاق ہوا، تو اس تقریب سے مرحوم کی خدمت میں کولار حاضر ہونے کا اتفاق ہوا تھا، اس کے بعد میسور کی طرف جب جانا ہوتا تو ان سے نیاز حاصل ہوتا رہا، کبھی کبھی خط و کتابت کا بھی اتفاق ہوتا تھا، بہت نیک، ملنسار اور متواضع بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

مارچ ۱۹۴۸ء

سیّد حسین کی موت

۲۵ر فروری ۱۹۴۹ء کی رات کو ۹ بجے ریڈیو نے خبر سنائی کہ ہندوستانی سفیر متعین مصر سید حسین نے وفات پائی، دوسرے دن شاہانہ تزک و احتشام سے سرکاری طور سے اُن کی تدفین عمل میں آئی، جنازہ میں شاہ فاروق نے شرکت کی اور بعض علمائے ازہر نے اُن کی نماز جنازہ پڑھائی۔

شاید لوگوں کو یاد ہو کہ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان سے مجلسِ خلافت کا جو وفد یورپ بھیجا گیا تھا، اس کے ابتدائی ممبر تین تھے، محمد علی مرحوم، سید حسن اور... سید سلیمان ندوی اور اس کے بعد شیخ مشیر حسین قدوائی اور ابوالقاسم (بنگال کے نامور لیڈر) بھی شامل ہو گئے، افسوس کہ اس وقت راقم کے سوا سب ہی جنت کو سدھارے، اس وفد کے سکریٹری حسین محمد حیات صاحب تھے، جو بحمداللہ اس وقت بھی بقید حیات ہیں اور یہیں بھوپال میں اعلیٰ حضرت فرمانروائے بھوپال کے سکریٹری ہیں، سید حسین کی موت کی خبر ملتے ہی میں نے حیات صاحب کو فون کیا، وہ بھی خبر سُن چکے تھے، کچھ دیر تک مرحوم کی وفات پر ہم دونوں افسوس کرتے رہے۔

وہ اس وقت گو جوان نہ تھے، ۶۲ برس کی عمر تھی، مگر چہرہ مہرہ اور بالوں کی سیاہی سے اب تک جوان بنے تھے، اُن کی موت دل کی حرکت بند ہونے سے ہوئی، مصر کے تازہ آنے والوں سے سنا کہ ان کی صحت اخیر دنوں میں اس حد تک گر چکی تھی کہ ان کا کسی وقت بھی ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لینا تعجب خیز نہ تھا۔

مرحوم بہار و بنگال کے ایک ممتاز سادات کے گھرانے میں ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے تھے وہ اُردو کے مشہور ظریف انشاپرداز سید محمد آزاد کے چھوٹے بیٹے تھے، سید محمد مرحوم اس زمانہ میں جب بہار و بنگال ایک تھے، اعلیٰ سرکاری عہدوں پر ممتاز تھے، اُن کے ظریفانہ مضامین اودھ پنچ لکھنؤ اور مشیر قیصر لکھنؤ میں چھپتے تھے اور بعد کو اُن کے مضامین الگ بھی چھپے، اپنے زمانہ میں مشہور ادیبوں میں اُن کا شمار تھا۔

سید حسین نے ابتدائی تعلیم کے بعد انگلستان کی راہ لی، شعر و سخن اور ادب و انشا کی گودوں میں انہوں نے پرورش پائی تھی، گو وہ انگریزی کے ادیب و انشاپرداز تھے، لیکن اردو شعر و ادب میں بھی ان کو خاصہ ملکہ تھا اور جس روانی سے انگریزی میں تقریر کرتے تھے، اُردو میں بھی کرتے تھے، بڑے زندہ دل، ہنس مکھ اور باغ و بہار تھے۔

انگلستان میں جا کر انہوں نے اخبار نویسی سیکھی اور ۱۹۱۴ء والی بڑی لڑائی کے بعد جب ہندوستان میں سیاسی بیداری کا طوفان اٹھا وہ ہندوستان آئے اور پہلے مسٹر ہارنی من کی نگرانی میں بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں داخل ہوئے اور اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں جب موتی لال جی نہرو آنجہانی نے الٰہ آباد سے انڈیپنڈنٹ نکالا تو اس کی ایڈیٹری کے لئے اسی نوجوان صاحب قلم کا انتخاب کیا اور اُن کو خود اپنے پاس رکھا، انڈیپنڈنٹ کی شہرت کے ساتھ ساتھ سید حسین نے بھی شہرت حاصل کی، ان کو میں نے اسی زمانہ میں بعض قومی سیاسی جلسوں میں دیکھا، گورا رنگ، چھریرا بدن، بہترین انگریزی سوٹ میں ملبوس اور یہی اخیر تک اُن کا فیشن رہا۔ اسی زمانہ میں جلسوں میں اُن کی طرف نگاہیں اور انگلیاں اٹھتی تھیں۔

یہ وہ وقت تھا کہ کانگریس اور خلافت کے اتحاد سے ملک میں سیاسی بیداری

کا سیلاب برابر بڑھتا جا رہا تھا اور آخر شکست خوردہ ترکی کے حصہ بخرہ کرنے کی تجویزیں فاتح اتحادیوں میں پیش تھیں کہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں مجلس خلافت کے اس اجلاس میں جو کانگریس کے ساتھ امرتسر میں ہوا تھا اور جس میں علی برادران نظر بندی سے رہا ہو کر پہلی بار شریک ہوئے تھے، یہ طے ہوا کہ محمد علی کی قیادت میں سید حسین اور سید سلیمان ندوی کا وفد انگلستان اور یورپ کے دوسرے دارالحکومتوں میں اس غرض سے بھیجا جائے تاکہ وہ مسلمانوں کا اور ہندوستان کا نقطۂ نظر پیش کرے، محمد علی مسلمانوں کے اور سید حسین ہندوستان کے اور سید سلیمان علمائے دین کے نقطۂ نظر کو پیش کریں۔ اس کے علاوہ گاندھی جی نے سید حسین کو اپنے نوٹ بھی لکھوا دیئے تھے کہ وہ ان کو وزرائے برطانیہ کے سامنے اپنی طرف سے پیش کریں، جن میں ہندوستان کے نقطۂ نظر سے مسئلہ خلافت کی توضیح تھی، چنانچہ سید حسین نے انگلستان کے جلسوں اور وزیروں کی ملاقاتوں میں اسی حیثیت سے اپنے فرض کو انجام دیا۔

۳۱ جنوری ۱۹۲۰ء پہلا دن تھا، جب وفد خلافت کی یہ مختصر سی جماعت ہنگریا جہاز سے یورپ کو روانہ ہو رہی تھی، اسی تاریخ کی شام کو سید حسین سے میری پہلی ملاقات ہوئی، سفر کا پہلا یا دوسرا دن تھا کہ شام کو محمد علی اور سید حسین میں انگریزی کی ایک ضرب المثل پر جو حقیقت میں ہابیل و قابیل کے سلسلہ میں توراۃ کا ایک فقرہ ہے کہ "میں اپنے بھائی کا رکھوالا نہیں ہوں" مناظرہ چھڑ گیا، سید حسین اس کی تائید اور محمد علی اس کی مخالفت کر رہے تھے، یہ حقیقت میں ان دونوں کی زندگیوں کے اصول اور عقیدہ کا اختلاف تھا، محمد علی قومی مسلمان سے مذہبی مسلمان بن چکے تھے، جن کے نزدیک ہر مسلمان کا فرض تھا کہ دوسرے مسلمان کو غلطی سے روکے اور سید حسین ابھی اس منزل سے پیچھے تھے، ان کے نزدیک شخصی آزادی اسی میں تھی کہ کسے را با کسے کارے نباشد، یہ مناظرہ بڑے جوش و خروش سے فریقین میں جاری رہا اور

بڑی مشکل سے اس کو روکا جا سکا۔

محمد علی اور سید حسین دونوں ہی لائق اور قابل تھے اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اٹل اصول اور عمل رکھتے تھے، اس لئے ان دونوں شیروں کو تھپک تھپک رکھنا بڑا مشکل تھا، یہ کام اسی کو کرنا پڑتا تھا جو دونوں کے بیچ میں واو عطف کی طرح تھا اور واقعہ یہ ہے کہ دونوں کو غصہ جلد آجاتا تھا، تاہم کام کی اہمیت کا خیال کر کے دونوں نے جس طرح بنا آٹھ مہینے کی مدت کو خیر خوبی کے ساتھ بنایا۔

وفد خلافت ستمبر ۱۹۲۰ء میں یورپ میں اپنا کام ختم کر کے امریکہ جانے کا خیال کر رہا تھا کہ ہندوستان کے حالات نے اس کو ہندوستان لوٹنے پر مجبور کیا اور تنہا سید حسین نے امریکہ جانے کا ارادہ کیا، چنانچہ ادھر وفد ہندوستان واپس ہوا اور ادھر سید حسین نے امریکہ کی راہ لی، امریکہ پہنچ کر انہوں نے ہندوستان کی بڑی خدمت کی اور امریکہ میں اپنی تقریر و تحریر سے انگریزوں کے پروپگنڈے کا جواب دیتے رہے اور ہندوستان کی بھلائی کا کام کرتے رہے، امریکہ سے "نوائے وطن" کے نام سے ایک اردو کا اخبار بھی نکالا اور اس سلسلہ میں سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۴۶ء تک گویا چوتھائی صدی امریکہ میں رہ کر اپنی زبان اور قلم سے ہندوستان کی خدمت میں مصروف رہے، اس دوران میں دس بارہ برس ہوئے چند ماہ کے لئے ہندوستان آئے تھے، ہندوستانی یونیورسٹیوں میں اُن کی خاص طور سے قدر کی گئی اور لاہور سے دکن تک اکثر یونیورسٹیوں کی دعوت پر انہوں نے تقریریں کیں، پھر وہ امریکہ واپس چلے گئے اور اخیر دفعہ وہ سنہ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان واپس آئے، جب ہندوستان میں انگریز اپنی سیاست کا آخری تماشہ دکھا رہے تھے، میری ان کی ملاقات ایک چوتھائی صدی کے بعد ۱۶ نومبر سنہ ۱۹۴۶ء کو جامعہ ملیہ کی جوبلی میں دہلی میں ہوئی، بڑی گرم جوشی سے مصافحہ ہوا اور پچھلے گلے شکوے اور حکایات ہوئے، دوسری آخری ملاقات ۲۴ یا ۲۵ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو اسی دلّی میں

مولانا ابوالکلام صاحب کی کوٹھی میں ہوئی جس کے بعد وہ نومبر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی طرف سے مصر کے سفیر ہو کر مصر روانہ ہوئے، کام کے لئے صرف ایک سال کی مہلت پائی، مگر سنا ہے کہ حکومت ہند نے ان کے کاموں کو پسند کیا۔

مرحوم نے اپنی عمر تجردی کی حالت میں گزاری، اس لئے ان کی کوئی ظاہری یادگار نہیں اور اس سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ انگلستان اور امریکہ میں گزارا، اس لئے ملک کو ان کی قابلیت سے براہ راست فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

مرحوم کے اعزہ بنگال اور کلکتہ میں موجود ہیں' ان کے دو عزیزوں کی شادیاں ہمارے گاؤں (دیسنہ ضلع پٹنہ) میں سادات کے گھرانے میں ہوئی ہیں۔

مرحوم کے ناتمام افسانۂ زندگی کی ان چند سطروں کے لکھنے کی حاجت نہ تھی۔ مگر میری ان کی آٹھ ماہ کی رفاقت کے حق نے لکھنے کا تقاضہ کیا تاکہ اس مسافر عدم کی یاد اہلِ وطن میں تازہ رہے ؏

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

اپریل ۱۹۴۹ء

مولانا شبّیر احمد عثمانی رح

دسمبر ۱۹۴۹ء کے وسط میں میں جدّہ میں تھا، ۱۳ر دسمبر کی شام کو مغرب کے بعد حکومتِ سعودیہ کی وزارتِ خارجیہ جدّہ میں ایک ہندوستانی مسافر کی دعوت تھی شہر کے کچھ معززین، اسلامی حکومتوں کے سفیر اس میں شریک تھے، ہندوستان، پاکستان، مصر و عراق وغیرہ کے سفیر اور وزارتِ خارجہ سعودیہ کے بعض ارکان موجود تھے، میں ہندوستانی کونسل کے نمائندوں، پروفیسر عبدالمجید خان انڈین کونسل اور مولانا عبدالمجید الحسریری کمشنر حج متعین جدّہ کے ساتھ وہاں پہنچا، احباب کچھ آچکے تھے، کچھ آرہے تھے، مختلف موضوعوں پر گفتگو تھی، خصوصیت سے کراچی میں اسلامی ملکوں کی جو اقتصادی کانفرنس ہو رہی تھی، اس میں حجاز کی طرف سے حجاز کی اقتصادی حالت کی جو مطبوعہ رپورٹ اس وقت سامنے رکھی تھی، اس پر گفتگو ہو رہی تھی کہ اتنے میں جدّہ میں پاکستانی کونسل مسعود صاحب جو مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب داناپوری کے صاحبزادہ ہیں تشریف لائے اور نہایت افسوس کے ساتھ یہ ذکر کیا کہ آج مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا انتقال ہوگیا، اس خبر کے سننے کے ساتھ مجلس پر اُداسی چھاگئی، میرے سامنے سے پوری نصف صدی کی معاصرانہ مسابقتوں کی ایک دنیا گزر گئی۔

۱۹۰۲ء کی بات ہے وہ دارالعلوم دیوبند میں اور راقم دارالعلوم ندوۃ میں تعلیم پا رہے تھے، یہ زمانہ دونوں درسگاہوں کا زرّیں زمانہ تھا، دارالعلوم ندوہ میں میرے ساتھ

میرے ایک عزیز قریب وہموطن (مولوی سیّد محمد قاسم صاحب خلف الرشید مولانا شاہ تجمل حسین صاحب خلیفہ شاہ فضل الرحمان صاحب گنج مراد آبادی وحضرت مولانا شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہم اللہ تعالیٰ) رفیق درس تھے، وہ اپنے والد کے حکم سے ندوہ چھوڑ کر دیوبند چلے گئے تھے، اُن کو طالبعلموں کی انجمن سازی اور دفترداری کا بڑا اچھا سلیقہ تھا چنانچہ دیوبند پہنچکر انہوں نے اس سلیقہ کا ثبوت دیا اور دیوبند میں طالبعلموں کی تقریر و تحریر کی ایک انجمن کی بنیاد ڈالی، مولانا شبیر احمد صاحب جو اُن دنوں انہی کے عمر کے طالب علم تھے اور تقریر و تحریر کا فطری ذوق رکھتے تھے ان جلسوں میں دلچسپی لیتے تھے اور اسی مناسبت سے مولوی قاسم سے بھی اُن کو محبت تھی، مولوی قاسم نے ندوہ و دیوبند کو ملانا چاہا۔ وہ میرے خطوں میں مجھ سے مولانا شبیر احمد صاحب کا تذکرہ کرتے تھے اور سلام پہنچاتے تھے اور میرا تذکرہ اُن سے کرتے تھے اور میری طرف سے اُن کو سلام پہنچاتے تھے، اس تعلق کا یہ اثر ہوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے آشنا اور ایک دوسرے سے واقف ہوگئے، یہ وہ زمانہ تھا جب دیوبند سے القاسم اور ندوہ سے الندوہ نکل رہا تھا اور ہم دونوں کے مضامین اپنے اپنے پرچہ میں نکلتے تھے، اور چھپتے تھے، اسی زمانہ میں مرحوم کسی تعلق سے لکھنؤ آئے تو مدرسہ میں مجھ سے ملنے آئے، یہ میری ان کی طالب علمانہ ملاقات کا پہلا موقع تھا، یہ غالباً ۱۹۰۴ء کی بات ہے:

۱۹۰۶ء میں میری دستاربندی ہوئی اور دستاربندی کے جلسہ میں برجستہ عربی تقریر کی وجہ سے عربی مدرسوں میں ایک خاص شہرت حاصل ہوئی اور اسی زمانہ میں مولانا کو بھی فراغت حاصل ہوئی، وہ دارالعلوم دیوبند میں اور میں دارالعلوم ندوہ میں مدرس ہوگئے، اسی کے سال دو سال کے بعد کسی انجمن کی دعوت پر پنجاب جانے کا اتفاق ہوا، تو راہ میں سہارنپور اُتر کر دیوبند چلا گیا، یہ میری حاضری کا پہلا اتفاق تھا، ان دنوں دارالعلوم دیوبند میں میرے عزیز دوست ڈاکٹر سیّد عبدالعلی صاحب

(خلف مولانا سید حکیم عبدالحیٔ صاحب ناظم ندوہ) ندوہ کی تعلیم سے فارغ ہو کر دیوبند میں حدیث کے دورہ میں شریک تھے، میں نے اس کا اہتمام کیا کہ مجھے کوئی پہچانے نہیں، منہ چادر میں لپیٹے تھا، مدرسہ پہنچ کر سید عبدالعلی صاحب کو پوچھ کر اُن کے کمرہ میں گیا، وہ مجھے یک بیک دیکھ کر کچھ کہا ہی چاہتے تھے کہ میں نے اشارہ سے اُن کو منع کیا اور وہ رُک گئے اور ساتھ لے کر مدرسہ اور درس کے کمرے دکھانے لگے، اور آخر میں اوپر چھت پر دارالشوریٰ اور دارالاہتمام دکھانے لے گئے، اتفاق دیکھئے کہ ایک طالب علم جو پہلے ندوہ میں پڑھتے تھے اور اب دیوبند میں زیر تعلیم تھے وہ دارالاہتمام سے نکل رہے تھے، وہ مجھے دیکھتے کے ساتھ دوڑ کر مولانا حبیب الرحمان صاحب مہتمم کی خدمت میں چلے گئے اور میرا نام بتایا، موصوف نے جو ہمہ تن متواضع اور خاکسار تھے، ایک معمولی طالب علم کے لئے یہ زحمت فرمائی کہ تشریف لائے اور اپنے ساتھ اندر کمرے میں لے گئے اور چائے کی دعوت فرمائی، جس میں اکثر حضرات مدرسین شریک تھے۔ دوسرے وقت حضرت مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ نے اپنے فضیلت کدہ پر کھانے کی دعوت فرمائی۔

ایک طالب علم کے لئے سب سے بڑی دعوت طالب علموں کے جلسہ کی ہو سکتی تھی، چنانچہ مولانا حبیب الرحمان صاحب نے جلسہ کا اہتمام فرمایا، یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس تھے، مگر اس خدمت سے علیحدگی کا خیال کر رہے تھے اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب تازہ تازہ حجاز سے ہندوستان وارد ہوئے تھے، جلسہ آراستہ ہوا... طالب علموں نے تقریریں کیں، آخر میں مولانا انور شاہ صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب نے عربی میں تقریریں کیں اور پھر اس کم سواد کو عربی میں تقریر کا حکم ہوا اور اس نے تعمیل کی۔

اس زمانہ میں آریوں کی تحریک سے شدھی کا زور تھا اور عربی مدرسوں میں آریوں سے مناظرہ کی تعلیم دی جاتی تھی، چنانچہ جلسہ کے بعد طالب علموں نے آریہ اور مسلمانوں کے مناظرہ کا مظاہرہ کیا، طالب علموں کے دو گروہ بنے، ایک، ایک مسئلہ کا حامی تھا، دوسرا اس پر معترض، باہم سوال و جواب اور ردّ و قدح کا سلسلہ قائم تھا کہ ایک فریق کم زور سا پڑ گیا، مولانا شبیر احمد صاحب جو مدرسین کے ساتھ میرے قریب بیٹھے تھے مولانا حبیب الرحمان صاحب سے اجازت لے کر مدرسین کی صف سے نکل کر طالبعلموں میں مل گئے اور اس کم زور فریق کی حمایت میں فرمانے لگے اور آخر اپنی تقریر کی قوت اور استدلال کے زور سے ہارا ہوا میدان جیت لیا اور سب نے اُن کی ذہانت کی اور طباعی کی داد دی، میں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کی تمام عمر میں ایک دفعہ زیارت کی اور وہ اسی موقع پر نہایت سادگی اور خاموشی کے ساتھ ایک کمرہ میں جس میں کھری چارپائی اور ایک چٹائی اور ایک مٹی کا لوٹا تھا، تشریف فرما تھے۔

اس واقعہ پر سالہا سال گزر گئے، مولانا شبیر احمد صاحب دار العلوم دیوبند میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے ہوتے کتب حدیث کا درس دینے لگے، کچھ دنوں کے بعد مدرسہ فتحپوری دہلی میں صدر مدرس ہو گئے، اسی زمانہ میں میرا بھی دلّی جانا ہوا، تو مدرسہ میں اُن سے ملاقات ہوئی، مگر پھر دار العلوم دیوبند لوٹ آئے، اسی زمانہ میں مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کی طلب پر دیوبند آکر مقیم ہوتے تھے اُن کا مشن یہ تھا کہ دیوبند پر جو تعلیمی فضا محیط ہو گئی تھی اور سیّد احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید کی مجاہدانہ روح جو اس حلقہ سے دبتی چلی جا رہی تھی، اس کو دوبارہ زندہ کیا جائے اور اس سلسلہ میں مؤتمر الانصار کی بنیاد پڑی اور اس کا سالانہ ۱۹۱۱ء یا اُس کے پس و پیش زمانہ میں مراد آباد میں بہت بڑا جلسہ ہوا، جس میں علی گڑھ اور ندوہ اور دیوبند کے اکثر رجال علم و عمل جمع ہوئے اور تمام ہندوستان

سے مسلمانوں کا بہت بڑا مجمع اس میں شریک تھا، ندوہ سے حضرت الاستاذ مولانا شبلی مرحوم شریک ہوئے تھے، اس جلسہ میں مولانا شبیر احمد صاحب نے العقل والنقل کے نام سے اپنا ایک کلامی مضمون پڑھ کر سنایا، حاضرین نے بڑی داد دی، اس مضمون میں گو جدید معلومات حضرت الاستاذ کی تصنیف سے لئے گئے تھے، مگر اس کا نتیجہ اس کے برعکس نکالا گیا تھا، یہ گویا حامیانِ عقل کے اس علم کلام کا رد تھا، جس میں خرق عادت کے وجود اور معجزات کے صدور پر ناک بھوں چڑھائی جاتی، حضرت الاستاذ نے واپس آکر مجھ سے فرمایا تھا کہ انہوں نے معلومات میری کتاب سے لئے اور پھر میرا ہی رد کیا۔

دیوبند کے حلقہ میں اس زمانہ میں یہ بات برملا کہی جاتی تھی کہ مولوی شبیر احمد صاحب کو حضرت مولانا قاسم صاحب کے علوم و معارف پر پورا احتوا ہے، وہ حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ کے مضامین و معانی کو لے کر اپنی زبان اور اپنی طرز ادا میں اس طرح ادا کرتے تھے کہ وہ دل نشین ہو جاتے تھے، یہ خیال ہے کہ مولانا قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مضامین نہایت غامض، دقیق اور مشکل ہوتے تھے، جن تک عوام کی پہنچ نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے اُن کے مضامین اور حقائق کو سمجھنا، پھر زمانہ کی زبان میں اس کی تعبیر و تفہیم کوئی آسان بات نہ تھی اور اسی لئے مولانا شبیر احمد کی تقریر و تحریر کی تعریف کی جاتی تھی۔

۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک مسلمانوں کی سیاست کروٹ لے رہی تھی، یکے بعد دیگرے طرابلس پھر کانپور کی مسجد، پھر بلقان کی جنگ پھر یورپ کی پہلی جنگ عظیم کے واقعات پیش آئے اور ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ کی سیاسی تحریک بڑھتی اور پھیلتی گئی۔

یہاں پر ایک بات مجھے بے محابا کہنا ہے، یہ وہ وقت تھا کہ جب مولانا ابوالکلام

کا الہلال نکل رہا تھا اور ان کی آتش بیانی سے مسلمانوں میں آگ سی لگی ہوئی تھی اور وہ جہاد جس کا نام لینے سے لوگ ڈرنے لگے تھے ۔ مولانا ابوالکلام نے اس کا صور اس بلند آہنگی اور بیباکی سے پھونکا کہ وہ بھولا ہوا سبق لوگوں کی زبانوں پر آگیا، الہلال، دیوبند کے حلقہ میں بھی آتا تھا اور حضرت مولانا محمود حسن کی مجلس میں پڑھا جاتا تھا، میں نے اس زمانہ میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب کا یہ فقرہ سنا تھا کہ ہم نے جہاد کا سبق بھلا دیا تھا اور ابوالکلام نے ہم کو پھر یاد دلا دیا ۔

اس زمانہ میں مولانا عبیداللہ صاحب سندھی حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ترجمان تھے، مگر یہ حالت دیر تک قائم نہ رہی، اس حلقہ کی ایک جماعت پر مدرسہ کے مصالح مقدم تھے اور دوسرے پر اسلام کے مصالح، مولانا محمود حسن صاحب دل سے دوسری جماعت میں شریک تھے، میں نے سُنا کہ انہوں نے ایک دفعہ فرمایا کہ ہمارے بزرگوں نے تو مدرسہ اپنے اصلی مقصد (جہاد) پر پردہ ڈالنے کے لئے بنایا تھا، بہرحال مولانا عبیداللہ سندھی کو دیوبند سے ہٹنا پڑا اور دلی میں مسجد فتحپوری کے ایک گوشہ میں دائرۃ المعارف کی بنیاد ڈالی اور اس میں انگریزی خواں تعلیم یافتوں اور عربی کے فارغ التحصیل عالموں کو قرآن پاک کا درس اس جہادی اسپرٹ میں دینے لگے، جو سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی زندگی کی روح تھی اور مجاہدین سرحد (یاغستان وچمرقند) سے حلقۂ اتصال قائم کیا گیا، اس وقت یورپ کی جنگ کے شعلے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور ہندوستان میں بغاوت کا خیال روزافزوں تھا، انگریزی حکومت کی جاسوسی اپنا کام کر رہی تھی، مولانا ابوالکلام محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی وغیرہ احرار سب نظربند تھے، یا جیل میں تھے حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ہندوستان سے ہجرت کی اور وہ حجاز میں قید ہو کر مالٹا میں نظربند ہوئے اور مولانا عبیداللہ سندھی مولانا سیف الرحمان اور

مولانا عبداللہ انصاری چھپ کر افغانستان چلے گئے، جو لوگ اب باقی رہ گئے تھے، ان میں بڑے لوگ حکیم اجمل خان مرحوم، ڈاکٹر انصاری مرحوم اور مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی تھے ان لوگوں نے قوم کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور پہلے مجلسِ خلافت اور پھر جمعیۃ العلماء کی بنیاد ڈالی، اس وقت تک مولانا محمود حسن رحمہ اللہ تعالیٰ مالٹا میں تھے، ۱۹۲۰ء میں جو وفد خلافت لندن گیا تھا، اس کا ایک ممبر یہ راقم الحروف بھی تھا، غالباً مارچ یا اپریل میں جب مسٹر فشر وزیرتعلیم قائم مقام وزیرہند سے ملاقات ہوئی تو میں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کی اسیری و نظربندی کے معاملہ کو ان کے سامنے پیش کیا، یاد آتا ہے کہ موصوف اسی سال کے اخیر یا ۱۹۲۱ء کے شروع میں مالٹا سے چھوٹ کر مع خدام کے جن میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب بھی تھے، واپس آئے، مگر شاید چند ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہے، اور وفات پائی، اس درمیان میں عقیدتمندوں نے ہر سمت سے اُن کو بلایا، مگر خود تشریف نہ لے جا سکے، اپنے قائم مقام یا ترجمان کی حیثیت سے مولانا شبیر احمد صاحب ہی کو بھیجا، ان مقامات میں سے خاص طور سے دہلی کے جلسہ میں اُن کی نیابت نہایت یادگار اور مشہور ہے، گائے کی قربانی ترک کرنے کے مسئلہ میں بھی جس کو حکیم اجمل خان مرحوم نے اٹھایا تھا۔ حضرت مولانا شیخ الہند کی طرف سے مولانا شبیر احمد صاحب نے نہایت واشگاف تقریر فرمائی تھی، یہ ترجمانی اور نیابت مولانا شبیر احمد صاحب کے لئے نہ صرف فخر و شرف کا باعث بلکہ ان کی سعادت اور ارجمندی کی بڑی دلیل ہے۔

۱۹۲۳ء کے آخر میں گیا میں کانگریس اور جمعیۃ العلماء کے شاندار اجلاس ہوئے جمعیۃ کے اس اجلاس کے صدر مولانا حبیب الرحمان صاحب تھے، اُن کے ساتھ حلقۂ دیوبند کے اکثر اساتذہ آئے ہوئے تھے، ان میں مولانا شبیر احمد صاحب بھی تھے، کانگریس اور جمعیۃ کے یہ اجلاس ایک خاص حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں،

یعنی اس اجلاس میں کانگریس کی سیاست میں ایک اہم تبدیلی ہوئی اور پنڈت موتی لال سی، آر داس، حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ کی رہنمائی میں ترک موالات کی جگہ جس میں کونسلوں اور اسمبلیوں کا بائیکاٹ بھی تھا، یہ تجویز سامنے رکھی گئی کہ ان کونسلوں اور اسمبلیوں پر قبضہ کر کے حکومت کو بے دست و پا کر دیا جائے گویا مقصد یہ تھا کہ مقصود کے حصول کے لئے طریق جنگ اور لڑائی کے ڈھنگ کو بدلا جائے اس تحریک کے حامیوں نے سوراج پارٹی اپنا نام رکھا، اس وقت گاندھی جی . . . ابوالکلام، محمد علی وغیرہ جیل میں تھے، اُن کے خالص پیروؤں نے اس کی سخت مخالفت کی اور نوچینجرز (نہ بدلنے والے) کا لقب پایا، کانگریس کی طرح جمعیتہ میں بھی حکیم صاحب نے اس تجویز کو پیش کیا اور اس کے فیصلے کے لئے ارکان جمعیتہ کا خاص جلسہ ہوا، تجویز کے حامیوں کی طرف سے خاکسار نے اور مخالفوں کی طرف سے مولانا شبیر احمد صاحب نے تقریریں کیں، مولانا شبیر احمد صاحب کی اس تقریر کا صرف ایک حصّہ مجھے یاد ہے، جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ حضور انور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام خانۂ کعبہ کی فتح کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتے تھے، مگر چونکہ قریش نومسلم تھے، اُن کو یہ بات کعبہ کی حرمت اور ادب کے خلاف نظر آئی، اس لئے حضورؐ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہاری قوم تازہ مسلمان نہ ہوتی تو میں کعبہ کو ڈھا کر پھر اس کی بنیاد ابراہیمی اساس پر رکھتا، یہ واقعہ بیان کر کے مولانا نے فرمایا کہ ترک موالات کے بدولت ابھی ہماری قوم انگریزوں کی غلامی سے نئی نئی نکلی ہے، یہ کونسل اور اسمبلی کے چکر میں پڑ کر پھر غلام نہ بن جائے بہرحال ووٹ لئے گئے اور مولانا کی مخالفت کامیاب ہوئی۔

مولانا حسین احمد صاحب کا نام اس وقت تک خواص سے نکل کر عوام تک نہیں پہنچا تھا، وہ اس تمام ہنگامہ کے وقت حضرت شیخ الہند کے ساتھ مالٹے میں

تھے، ساتھ ہی ۱۹۲۱ء میں ہندوستان واپس آتے اور سب سے پہلی دفعہ وہ ہندوستان کی سیاست میں کراچی خلافت کانفرنس میں مقرر کی حیثیت سے نمودار ہوئے، اور اس مشہور انقلابی تجویز کے مؤیدین میں تھے، جس میں مسلمان فوجیوں سے فوج کی ملازمت ترک کرنے کی تحریک تھی، اس کے محرک محمد علی اور مؤید مولانا حسین احمد، پیر غلام مجدد اور سیف الدین کچلو وغیرہ تھے، آخر سب پر مقدمے چلائے گئے اور سب کو چند سال کی قید کی سزا ہوئی۔

بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

اس قید سے آزادی کے بعد حضرت مولانا حسین احمد صاحب بیش از بیش تحریکات میں حصہ لینے لگے اور آخر خلق کی زبان نے اُن کو شیخ الہند کا جانشین مان لیا اور اب حضرت شیخ الہند کے مسلک کی ترجمانی اور ان کی جماعت کی نمائندگی مولانا موصوف فرمانے لگے، تاہم خلافت اور جمعیۃ کے جلسوں میں مولانا شبیر احمد صاحب بھی آتے جاتے رہتے تھے، لیکن یہ آمد و رفت بھی کم ہوتی رہی۔

۱۹۲۶ء میں جب سلطان ابن سعود نے مکہ معظمہ میں عالمگیر اسلامی کانفرنس بلائی اور ہندوستان کی مختلف مجلسوں کی طرف سے وفد بھیجے گئے، تو خلافت کے وفد کی صدارت حکیم صاحب اور احرار پنجاب کے اصرار سے اس خاکسار کے حصہ میں آئی اور اس کے ممبر محمد علی، شوکت علی، شعیب قریشی ہوئے اور جمعیۃ العلماء کے وفد کے صدر مولانا کفایت اللہ صاحب اور ممبر حافظ احمد سعید صاحب، مولانا عبدالحلیم صدیقی صاحب اور مولانا عرفان صاحب مرحوم تھے، یہ کل وفد ایک ہی جہاز پر حجاز کو روانہ ہوا اور اسطرح اس سفر میں مرحوم کو بہت پاس سے دیکھنے کا موقع ملا، طبیعت میں بڑی نزاکت تھی اور بات بات میں وہ چیز ظاہر ہوتی تھی، اسلیئے رفقائے سفر ان کی بڑی رعایت کرتے تھے، ایک یمنی طالب علم جو دیوبند میں اُن کے شاگرد تھے، اُن کی خدمت کرتے تھے اور یہ خدمت پورے سفر حجاز میں

انہوں نے کی، جدہ سے مکہ معظمہ تک ہم سب ایک لاری میں آئے۔ جب مکہ معظمہ قریب آیا تو مرحوم پر عجیب کیفیت تھی، انہوں نے قرآن کا احرام باندھا تھا اور ہم سب تمتع کے احرام میں تھے، جیسے جیسے مکہ معظمہ قریب آتا جاتا تھا، اُن پر گریہ کا غلبہ ہوتا جاتا تھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، یہ ان کا دوسرا حج تھا مکہ معظمہ میں موتمر کے جلسے ایک ماہ کے قریب ہوتے رہے، ان میں ہم لوگ شریک ہوتے رہے اور اکثر مولانا شبیر احمد صاحب بھی شریک ہوتے تھے، اسی سفر میں مجھے علم ہوا کہ موصوف عربی تحریر و تقریر پر اچھی طرح قادر تھے، سلطان نے خلافت اور جمعیۃ کے ایک ساتھ ملنے کو بلایا اور مختلف موضوعوں پر گفتگو کی، مولانا شبیر احمد صاحب نے اس موقع پر خلاف توقع اپنے اکابر دیوبند کے عقائد اور فقہی مسلک پر اچھی اور شستہ گفتگو کی اور سلطان اس کو دیر تک سنتے رہے۔

موتمر کی کارروائی میں تو مولانا نے کوئی خاص حصہ نہیں لیا، مگر موتمر کے آخری اجلاس میں ایک مضمون انہوں نے پڑھ کر سنایا، جس کو پہلے سے وہ لکھ لائے تھے، مگر اپنے رفقا کو وہ پہلے سے نہیں دکھایا تھا، میں اس اخیر جلسہ میں شریک نہ تھا، مگر وفد جمعیۃ کے ارکان کو مولانا کے اس تنہا بیان سے بڑی حیرانی تھی، بہر حال بات چپ چپ ختم ہوگئی

حج کے مناسک میں بھی اُن کی رفاقت رہی، یہ زمانہ گرمی کا تھا، بادِ سموم کے جھونکے چل رہے تھے، ظہر کے وقت ذوق و شوق میں مسجد نمرہ میں نماز پڑھنے کی آرزو تھی، مگر آفتاب کی حدت اور دھوپ کی تمازت دیکھ کر ہمت نہیں پڑتی تھی، مگر مولانا کفایت اللہ صاحب اور حافظ احمد سعید نے اونٹوں کا سامان کر لیا تھا، آخر مولانا کفایت اللہ صاحب کے ساتھ اونٹ پر اُن کا ردیف بن کر چلا، مجھے ہر قدم پر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب گرا اور تب گرا، اسی خوف سے واپسی میں پیدل آیا، اسی موسم کی کی شدت میں مولانا شبیر احمد صاحب پیدل ہی روانہ ہوئے، مسجد کے قریب ہی پہنچے

تھے کہ بادِ سموم کے ایک جھونکے نے اُن کو آلیا، مگر بال بال بچ گئے۔

اس نماز میں آنے کا شوق اس خیال سے بھی تھا کہ سلطان امامت کریں گے۔ اور ایک سلطان وقت کے پیچھے ہم ہندوستان کے غلام نماز پڑھیں گے، مگر مسجد میں جماعت تیار تھی، سلطان کا انتظار رہا، وہ نہیں آئے، تو ایک مصری شیخ نے نماز پڑھائی نماز ختم ہوئی تو دیکھا کہ سلطان اپنے نجدی ہمراہیوں کے ساتھ ننگے سر اور ننگے پاؤں لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے آرہے ہیں، بعد کو جب سلطان سے ملاقات ہوئی تو میں نے حاجیوں کی طرف سے شکایت پیش کی کہ نماز میں آپ کا بڑا انتظار رہا، سلطان نے کہا کہ ہمارے نجدی بھائی آپ جانتے ہیں کہ چھتری نہیں لگاتے، اس لئے میں نے چاہا کہ آفتاب ڈھل جائے تو چلوں، مگر میرے پہنچنے سے پہلے ہی نماز ہوگئی، پھر کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں بچپن ہی سے بے گھر ہوگیا، تعلیم جیسی چاہیئے نہیں ہوئی، بدوی ہوں، قرأت نہیں جانتا، بد آواز بھی ہوں، اس لئے نماز پڑھانے سے گریز کرتا ہوں، میں نے مذاقاً کہا کہ سال میں ایک دفعہ لوگ آسانی سے اس آواز کو گوارا کرسکتے ہیں، مولانا شبیر احمد صاحب نے فرمایا کہ ہم ہندوستان کے مسلمان تو مشتاق رہتے ہیں کہ بادشاہ یا امیر کے پیچھے نماز پڑھیں، امیر افغانستان جب ہندوستان آئے تھے تو مسلمان سیکڑوں کوس سے اُن کے پیچھے نماز پڑھنے آئے تھے۔

مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک سفر میں بھی رفاقت رہی، میں گو محمد علی و شوکت صاحب وغیرہ کے ساتھ تھا، مگر ہم جنسی اور ہم مذاقی کے سبب سے اکثر جمعیۃ والوں کے یہاں آکر بیٹھا کرتا تھا، اونٹوں کا سفر تھا، بارہ روز میں منزلیں تمام ہوئیں، ہر روز ایک نئی منزل میں قیام تھا۔

ہر روز مرا نیا مقام | صبح کہیں کہیں ہے شام
عشق کی منزلیں تمام | راہِ دور و دراز میں

میں مرحوم کی خدمت میں بیٹھتا، اور طرح طرح کی باتیں، ایک منزل میں مرحوم نے عذر دھلی کے زمانہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور اُن کے رفقائے جہاد مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حافظ ضامن علی صاحب شہید کے واقعات اور تھانہ بھون اور شاملی پر تاخت اور مجاہدین کا حملہ اور حافظ صاحب کی شہادت کے واقعات کو اس پر اثر طریقہ سے بیان فرمایا کہ روح نے لذّت پائی۔

واپسی میں مولانا جہاز پر بہت علیل ہو گئے تھے، حالت بہت نازک معلوم ہوتی تھی، دوسرے درجہ میں اُن کا سفر تھا، جو جہاز کے پچھلے حصّہ میں تھا، وہاں بڑی تکلیف جہاز کے بعض آلات کا دھڑ دھڑ کر کے نیچے گرنا تھا، اسی حالت میں ہندوستان پہنچے، بالآخر اُن کو صحت ہوگئی۔

اُن کی آنکھیں کمزور تھیں، ایک دفعہ تو تکلیف بہت بڑھ گئی تھی، موگا (پنجاب) کے ڈاکٹر آنکھوں کے مشہور ڈاکٹر تھے، اُن سے علاج کرایا تو درست ہوگئی تھیں۔

مرحوم اب تک دارالعلوم دیوبند میں مدرس تھے، دارالعلوم دیوبند کے اکابرین میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد سے کچھ انتشار سا تھا، جو رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا تھا، ایک طرف مولانا حبیب الرحمان صاحب اور مولانا حافظ احمد صاحب اور کچھ مدرسین تھے، دوسری طرف مولانا انور شاہ صاحب، مفتی عزیز الرحمان صاحب مولانا سراج احمد صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب اور بعض نوجوان مولوی عتیق الرحمان صاحب وغیرہ تھے، آخر دوسرا گروہ دیوبند کو چھوڑ کر گجرات میں ڈابھیل ضلع سورت میں منتقل ہو گیا، جہاں پہلے سے ایک معمولی سا مدرسہ قائم تھا، مگر عمارت اچھی خاصی تھی، مولانا انور شاہ صاحب اور مولانا شبیر احمد اور مولانا سراج

احمد صاحب وغیرہ نے یہاں دوسرا دیوبند قائم کیا، بہت سے سرحدی، ولایتی بنگالی اور ہندوستانی طالب علم بھی ان کے ساتھ آئے اور چند سال تک زور وشور سے ان صاحبوں کا درس وہاں جاری رہا۔

اسی زمانہ میں خاکسار کو کسی جلسہ کے سلسلہ میں راندھیر ضلع سورت جانے کا اتفاق ہوا، ڈابھیل قریب ہے، مولانا شبیر احمد صاحب کو معلوم ہوا تو ایک حیدر آبادی طالبعلم کو خط دے کر بھیجا، میں نے آنے کا وعدہ کیا اور دوسرے روز ڈابھیل گیا، مدرسہ کو دیکھا، حضرات مدرسین سے ملاقات ہوئی، طلبہ سے ملا، طلبہ نے میرے لئے ایک جلسہ ترتیب دیا جس میں تقریریں ہوئیں، رات کو قصبہ میں جلسہ کا انتظام ہوا جس میں مختصر تقریر کی، اس کے بعد خود مولانا نے تقریر فرمائی، جس میں میری حقیر ذات کی نسبت ایک فقرہ استعمال کیا تھا، جو درحقیقت میری حقیقت ہے، میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ مجھے ان سے بہت انس ہے، اس لئے کہ یہ علماء اور تعلیم یافتوں کے درمیان ایک سفیر و متوسط کی حیثیت رکھتے ہیں، پھر میری کتاب ارض القرآن کی تعریف فرمائی۔

اُن کے گجرات کے قیام کے زمانہ میں ان کی آمد و رفت حیدر آباد دکن کی طرف بہت بڑھ گئی تھی، شرح صحیح مسلم کی امدادی تحریک جاری تھی اور کبھی کبھی میرا بھی جانا ہو جاتا تھا، ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک میلاد کی مجلس میں میرا اُن کا ساتھ ہو گیا اسی جلسہ میں خود حضور نظام بھی آنے والے تھے، میری تقریر ہو رہی تھی کہ وہ آگئے میرے بعد مولانا شبیر احمد صاحب نے تقریر شروع کی، حضور نظام نے بڑی داد دی، اور اہل محفل محظوظ ہوئے، لوگوں میں باہمی ترجیح کی اچھی خاصی ردّوکد شروع ہو گئی مگر بحمد اللہ دونوں مقرروں کے دل باہم صاف رہے اور زبانیں محفوظ،

مولانا شبیر احمد صاحب بڑے خطیب و مقرر تھے، عالمانہ استدلال کے ساتھ بڑے دلچسپ قصے اور لطیفے بھی بیان کرتے تھے، جس سے اہل محفل کو بڑی دلچسپی

ہوتی تھی اور ظریفانہ فقرے اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود نہیں ہنستے تھے، مگر دوسروں کو ہنسا دیتے تھے، اُن کی تقریروں میں کافی دلائل بھی ہوتے تھے اور سیاسی و علمی و تبلیغی اور واعظانہ ہر قسم کے بیان پر اُن کو قدرت حاصل تھی، ذہانت وطباعی، اور بدیہہ گوئی اُن کی تقریروں سے نمایاں ہوتی تھی، اکبر کے ظریفانہ اور فلسفیانہ شعران کو بہت یاد تھے، وہ اُن کو اپنی تقریروں میں عمدگی سے کھپاتے تھے۔

اُن کی تحریر بھی صاف شستہ تھی اور اس عصر کے اچھے لکھنے والوں کے لٹریچر کو غور سے پڑھا تھا اور اس سے فائدہ اٹھایا تھا، جمعیۃ وخلافت کے جلسوں میں علماء کی بعض تجویزوں کی انگریزی بنانے میں بڑی دقت ہوتی تھی، اس موقع پر محمد علی مرحوم نے کہا تھا کہ مولوی شبیر احمد صاحب کی عبارت کی انگریزی بنانے میں بڑی آسانی ہوتی ہے، کیونکہ اس کی ساخت انگریزی طرز پر ہوتی ہے۔

موصوف کے مضامین اور چھوٹے رسائل تو متعدد ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اُن کے تصنیفی اور علمی کمال کا نمونہ اُردو میں اُن کے قرآنی حواشی ہیں، جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے ترجمۂ قرآن کے ساتھ چھپے ہیں، ان حواشی سے مرحوم کی قرآن فہمی اور تفسیروں پر عبور اور عوام کے دل نشین کرنے کے لئے اُن کی قوتِ تفہیم حدبیان سے بالا ہے، مجھے امید ہے کہ اُن کے ان حواشی سے مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچا ہے، ان حاشیوں میں انہوں نے جابجا اپنے ایک معاصر کی تصنیف کا حوالہ صاحب ارض القرآن کے نام سے دے کر اس بات کا ثبوت بہم پہنچایا ہے کہ وہ معاصرانہ رقابت سے کس قدر بلند تھے۔

میں نے اپنے حلقۂ درس میں اُن کے حواشی کی افادیت کی ہمیشہ تعریف کی ہے اور ان کے پڑھنے کی ترغیب دی ہے، افسوس یہ ہے کہ یہ حاشیے بہت باریک چھاپے گئے ہیں، اس لئے اُن سے استفادہ میں مشکل پڑتی ہے، ان حواشی کی افادیت کا

اندازہ اس سے ہوگا کہ حکومت افغانستان نے اپنے سرکاری مطبع سے قرآنی متن کیساتھ حضرت شیخ الہند کے ترجمہ اور مولانا شبیر احمد صاحب کے حواشی کو افغانی مسلمانوں کے فائدہ کے لیئے فارسی میں ترجمہ کر کے چھاپا ہے۔

صحیح مسلم کی شرح لکھنے کا خیال اُن کو اپنی نوجوانی کے عہد سے تھا، صحیح بخاری کی شرح تو احناف میں سے حافظ بدرالدین عینی نے بہت پہلے لکھ کر احناف کی طرف سے حق ادا کر دیا تھا، مگر صحیح مسلم کی کوئی شرح حنفی نقطۂ نظر سے اب تک نہیں لکھی گئی تھی، اس لیئے مرحوم نے اپنے دست وبازو کو آزمایا۔

انگریزوں کے عہد میں دیوبند میں جو بعض سیاسی اختلافات پیدا ہو گئے تھے اور کانگریسی اور لیگی خیالات میں جو آویزش تھی، اس کی اطلاع حیدری صاحب صدراعظم حیدرآباد کے کانوں تک پہنچی تھی، اس سلسلہ میں انہوں نے مناسب سمجھا کہ مولانا شبیر احمد کو مہتمم بنا کر دیوبند بھیجیں، چنانچہ وہ اس صورت سے ڈھابیل سے واپس آکر دیوبند میں مقیم ہوئے اور اہتمام کا کام شروع کیا، مگر ظاہر ہے کہ صرف تقرر اور منصب سے خیالات اور نظریوں میں اختلاف دور نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ طلبہ میں اسٹرائیک ہوئی اور بعض نامناسب واقعات پیش آئے، جن کا نتیجہ ان کا استعفا تھا۔

اس موقع پر مجھے ایک بات یاد آئی، ۱۹۱۳ء کی بات ہے کہ ندوہ میں مولانا شبلی کے استعفے پر ایک عظیم الشان اسٹرائیک ہوئی تھی، جس میں علی گڑھ اور دیوبند وغیرہ ندوہ کے اہل اہتمام کے ساتھ تھے اور ملک اور قوم کے آزاد اخبارات مولانا ابوالکلام کی رہنمائی میں طلبہ کی تائید میں تھے، اس وقت مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کا ایک مضمون "الاعتصاب فی الاسلام" کے عنوان سے الہلال میں نکلا تھا، اس کے جواب میں مولانا شبیر احمد صاحب کا مضمون اسی الہلال میں نکلا تھا جس میں اسٹرائیک کو خلافِ اصول بتایا تھا، اس مضمون میں ایک مصرع یہ بھی تھا ع

لو آپ اپنے جال میں صیاد آگیا

پھر جب دیوبند کے احاطہ تک اسٹرائکوں کا سیلاب آپہنچا، تو اُن کا یہ مضمون مجھے بہت یاد آیا۔

موصوف کے حیدر آباد دکن اور نظام حیدر آباد سے گوناگوں تعلقات پیدا ہو گئے تھے، مرحوم نے اس ہنگامہ میں جو آریہ تحریک کے زمانہ میں حیدر آباد کے مسلمانوں میں پیدا ہو گیا تھا، اپنی تقریر سے بہت کچھ مسلمانوں میں سکون پیدا کیا، یہاں تک کہ حیدری صاحب نے اپنی ممنونیت اُن کی ذات کی نسبت ظاہر کی اور منصب میں ترقی کی، مگر ایک وقت ایسا آیا کہ نظام پر تفضیلت کا غلبہ تھا اور اتفاق سے وہ مکہ مسجد میں نماز پڑھنے آتے تھے، تو مرحوم نے تقریر فرمائی جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل بہت دل نشین طریقہ سے بیان کئے تھے، اس دن لوگوں کو مرحوم کی تقریر سے بڑی خوشی ہوئی، اور ان کے بے باکانہ اظہار حق کی سب نے تعریف کی۔

مجھے خیال آتا ہے کہ مرحوم ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء میں انجمن اسلامیہ اعظم گڑھ کی دعوت پر اعظم گڑھ آئے اور شبلی منزل میں میرے ہی پاس ٹھہرے، اس وقت اُن کی شرح مسلم کے کچھ اجزاء ساتھ تھے، جن میں قرأت فاتحہ خلف الامام وغیرہ اختلافی مسائل پر مباحث تھے، جن کو جا بجا سے مجھے سُنایا، ایک اور دفعہ اسی زمانہ میں وہ اعظم گڑھ آئے، ٹھہرے کہیں اور جگہ تھے، مجھ سے ملنے آئے، میں نے چائے پیش کی، تو پینے سے انکار کیا، انکار کی وجہ نہ معلوم ہوئی، مگر بعد کو خیال آیا تو قیاس ہوا کہ چائے کی پیالیاں جو جاپانی تھیں، اُن پر جانوروں کی تصویریں بنی تھیں، اس لئے اُن میں پینے سے انکار کیا، بہر حال اس سے اُن کے تقویٰ اور بزرگوں کی صحبت کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔

مرحوم کی شرح مسلم جس کا نام فتح الملہم ہے لکھنے کا کام تمام عمر جاری رہا، اتنے بڑے کام کے لئے ان کو کسی ریاست سے امداد کی فکر تھی، چنانچہ اس کیلئے حیدر آباد دکن

کا خیال تھا، اس کیلئے معروضہ پیش کیا اور آخر بڑے ردّوکد کے بعد ریاست نے اس کی سرپرستی منظور کی اور ہر جلد کے لئے کچھ امداد اور مصنف کے لئے ماہانہ وظیفہ منظور ہوا، اور مولانا نے جمعیتِ خاطر کے ساتھ اس کی چند جلدیں لکھ کر شائع کیں، اس سلسلہ میں یہ امر ذکر کے قابل ہے کہ جب ریاست نے اُن کی امداد منظور کی تو مرحوم نے مجھے دوستانہ خط لکھا کہ اہل علم کی طرف سے ریاست کی اس کرم فرمائی کا شکریہ ادا کیا جائے، چنانچہ میں نے اس کی تعمیل معارف کے شذرات میں کی، افسوس ہے کہ یہ کتاب ناتمام رہی۔

مرحوم سے میری آخری ملاقات اُس سال ہوئی، جب جمعیۃ علمائے اسلام کا اجلاس کلکتہ میں تھا اور اس میں اُن کا ایک پیغام پڑھ کر سنایا گیا تھا، جس کی اس زمانہ میں بڑی دھوم تھی اور جس کے بعد مرحوم مسلم لیگ کی دعوت کی صف میں اہم عنصر کی حیثیت سے شامل ہوگئے اور روز بروز ان کا تعلق لیگ سے بڑھتا ہی چلا گیا، مرحوم اس زمانہ میں بیمار تھے، نشست و برخاست سے معذور سے رہتے تھے، گھٹیے کا گمان تھا اور میرٹھ کے کسی ہومیو پیتھ کے علاج سے فائدہ ہو رہا تھا، اتفاق سے اس زمانہ میں میرا دیو بند جانا ہوا تو ملاقات کو حاضر ہوا، بشاشت سے ملے اور مجھ سے اپنے پیغام کے متعلق رائے پوچھی، تو میں نے اس کے نرم و ملائم لہجہ اور مصالحانہ انداز کی تعریف کی، اسی زمانہ میں اُن کو حیدر آباد دکن کی ریاست اپنی عربی درسگاہ مدرسہ نظامیہ کی صدر مدرسی کے لئے پانچ سو ماہوار پر بلارہی تھی، مرحوم اس کے قبول و عدم قبول میں متردّد تھے، مجھ سے بھی اس میں مشورہ پوچھا، مجھے اس مدرسہ کا اندرونی حال جو معلوم تھا، وہ بیان کیا اور عدم قبول کا مشورہ دیا، بہرحال مرحوم نے بھی وہاں جانا قبول نہیں کیا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے لیگ کی خدمتوں میں ایسے اُلجھتے چلے گئے کہ پھر دوسری طرف اُن کو خیال کا موقع ہی نہیں ملا اور آخر ۱۹۴۷ء میں لیگ کے

بڑے بڑے رہنماؤں کے ساتھ مرحوم بھی کراچی چلے گئے اور وہیں کے ہو گئے ۔

مرحوم نے کراچی پہنچ کر گو کوئی سرکاری عہدہ حاصل نہیں کیا، مگر مذہبی معاملات میں اُن کی حیثیت مشیر خاص کی تھی، اس لئے زبانِ خلق نے اُن کو شیخ الاسلام کہہ کر پکارا، جو اسلامی سلطنتوں میں عموماً قاضی القضاۃ کا لقب رہا ہے اور زیادہ تر اس لقب کی شہرت دولت عثمانیہ میں رہی، اسی حیثیت سے مرحوم پاکستان کی مجلس آئین ساز کے رکن بھی تھے اور اس جماعت کے رُوح رواں تھے، جو اس آئین کو اسلامی قالب میں ڈھالنا چاہتی ہے اور اس راہ میں مرحوم ہی کی ابتدائی کوشش کی کامیابی کا وہ نتیجہ تھا، جس کو پاکستان کی آئینی اصطلاح میں "قرارداد مقاصد" کہتے ہیں۔

مرحوم گو مستقل طور سے پاکستان چلے گئے تھے مگر تعجب ہوگا کہ انہوں نے نہ تو اپنا کوئی خاص گھر بنایا، نہ کسی کی ذاتی کوٹھی پر قبضہ کیا، بلکہ بعض عقیدت مند اہل ثروت کے مکان میں رہے اور اسی مسافرت میں اس مسافر نے اپنی زندگی بسر کردی ۔

مرحوم مروت کے آدمی تھے اور اہل حاجت کی سعی و سفارش بدل و جان کرتے تھے، چنانچہ پاکستان کے اہل حاجت اور اہل غرض دونوں ان سے فائدہ اٹھاتے رہے اور وہ اپنی جاہ و منزلت کا ذرا خیال کئے بغیر ہر ایک کے کام آتے رہے اور حکام کے پاس جاجا کر بے تکلف اُن کی سفارشیں کرتے رہے ۔

مرحوم کا آخری کام ایک عظیم الشان عربی درسگاہ کے قیام کا خیال تھا، چنانچہ اس کیلئے انہوں نے مخلصین کی ایک جماعت بنائی تھی، میرے قیام حجاز کے آخری زمانہ میں مرحوم کی طرف سے اس جماعت کا دعوت نامہ مجھے بھی ملا تھا اور انہوں نے مجھے بھی اس مجلس کا ایک رکن بنایا تھا ۔

مرحوم کی صحت اخیر دنوں میں اچھی نہ تھی، امسال پاکستان سے خیر سگالی کا ایک وفد حجاز جارہا تھا، اس کے ممبروں میں خواجہ شہاب الدین وغیرہ کے ساتھ مرحوم کا نام

بھی تھا، مگر وہ اسی علالت کے سبب نہ جا سکے اور ان کی جگہ مولانا ظفر احمد تھانوی گئے، مرحوم پر فالج کا اثر تھا، جس سے اُن کے دل و دماغ اور جسمانی قویٰ پر بڑا اثر تھا، اتفاقِ وقت یا تقدیر کا تماشہ دیکھئے کہ دسمبر میں جب سردی انتہائی نقطہ پر تھی وہ جامعہ عباسیہ کی تعلیمی ضرورت سے بھاولپور گئے، جہاں سُنا ہے کہ اس وقت بڑی سردی تھی، اسکے بعد کا حال کراچی کے ایک رسالہ "ندائے حرم" مورخہ جنوری ۱۹۵۰ء سے نقل کرتا ہوں۔

"۷ ارصفر ۱۳۶۹ھ مطابق ۸ دسمبر ۱۹۴۹ء کو حضرت علامہ مرحوم و مغفور جامعہ عباسیہ کی ایک تقریب میں شرکت کیلئے کراچی سے بھاولپور تشریف لے گئے، ۲۲ صفر ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی صبح تک طبیعت بالکل ٹھیک ہی معلوم ہوتی تھی، خلاف معمول اس روز ایک پیالی کے بجائے دو پیالیاں چائے پی اور فرمایا رات کو کچھ حرارت رہی، چنانچہ اسی وقت ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر کے طلب کیا گیا، ڈاکٹر نے بہت خفیف حرارت بتائی اور دوا دیدی، دس بجے کے قریب سینہ میں غیر معمولی گھبراہٹ محسوس ہوئی، دوبارہ ڈاکٹر کو بلایا گیا، نبض کی رفتار اس وقت اپنی طبعی رفتار سے کچھ کم تھی، ایک طبیب اور دوسرے ڈاکٹر کو بھی طلب کر لیا گیا، بھاولپور کے وزیر تعلیم اور وزیر اعظم اور وزیر مال بھی پہنچ گئے، چار پانچ انجکشن دیئے گئے، مگر نبض کی رفتار کم ہوتی گئی، آخر گیارہ بجکر ۵۰ منٹ پر یہ آفتابِ علم غروب ہو گیا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

میت اُسی روز شام کو بذریعہ پاکستان میل ۷ بجے کے قریب بھاولپور سے کراچی روانہ کی گئی، اسی روز شام کو پاکستان کے اس مایۂ ناز عالم باعمل کو لاکھوں اشکبار آنکھوں اور سوگوار دلوں نے سپردِ خاک کیا، ڈیرہ نواب کے اسٹیشن پر نواب صاحب بھاولپور نے میت کی زیارت کی اور اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔"

کراچی کے اسٹیشن پر مسلمانوں کے بہت بڑے مجمع نے میت کو اتارا اور پہلے مرحوم کے قیامگاہ پر لائے اور پھر وہاں سے اُن کے قیامگاہ کے سامنے ایک زمین میں جس کو عامل کالونی کہتے ہیں، دفن کیا گیا، سندھ کے اقطاع میں سے بھاولپور ہی وہ مقام ہے جس سے دیوبند کے اکابر اور امداد اللّٰہی سلسلہ کے مشائخ کو تعلق خاطر رہا ہے، اس لئے اگر مرحوم کی موت اسی سرزمین پر واقع ہوئی، تو عالم مثال کے حوادث میں کوئی عجیب چیز نہیں ہوئی۔

مرحوم کی کوئی ظاہری اولاد نہ تھی، لیکن بحمد اللہ کہ انھوں نے اپنی کثیر باطنی اولاد چھوڑی ہے، یہ اُن کے تلامذہ ہیں، جو زیادہ تر دیوبند اور بعض ڈابھیل میں اُن کے شرف تلمذ سے مشرف ہوئے ہیں، ان میں بعض مشاہیر کے نام جو مجھے معلوم ہیں، وہ یادگار کے طور پر سپرد قلم کرتا ہوں، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ابو المآثر محمد حبیب الرحمان صاحب اعظمی، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کہ ان میں سے ہر ایک بجائے خود دائرہ علم ہے۔

مرحوم کی پیدائش ۱۳۰۵ھ معلوم ہوئی ہے، اس لحاظ سے اُن کی عمر قمری حساب سے چونسٹھ سال کی ہوئی، اس وقت جب مرحوم کے نصف صدی کے واقعات کو سپرد قلم کر رہا ہوں، میرا دل کانپ رہا ہے اور لب معاصر مسافر عدم کے لئے مغفرت کی دعا میں مصروف ہیں، ایسے نادرۂ روزگار صاحب کمال صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کے مرقد کو پُر نور فرمائے اور اس پر اپنا ابر رحمت برسائے، وہ اب اس دنیا میں نہیں، مگر اُن کے کارنامے دنیا میں انشاء اللہ تعالیٰ حیاتِ جاوید پائیں گے

سالہا، زمزمہ پرداز، جہاں خواہد بود
زیں نواہا کہ دریں گنبدِ گرداں زدہ است

سر شیخ عبدالقادر

ہندوپاک کی تقسیم نے اب ایسا کر دیا ہے کہ ایک جگہ کا حال دوسری جگہ مشکل سے معلوم ہوتا ہے، بہر حال چونکہ پہلے کی شناسائی ہے، اس لئے کچھ ابھی تعلق سا معلوم ہوتا ہے، اس کے بعد تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہ دو مصنوعی ملک حقیقت میں دو ملک ہو جائیں جس میں ایک کا حال دوسرے کو شاید ہی معلوم ہو، اور اگر ہو بھی تو دل کا تعلق ظاہر نہ ہو، سر شیخ عبدالقادر متحدہ ہندوستان کے ایک ممتاز ادیب تھے، اگر ان کا انتقال اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہوا ہوتا تو سارا ہندوستان اُن کا ماتم کرتا، لیکن ان کا انتقال ۱۹۵۰ء میں ہوا، جب ہندوستان میں اُن کے انتقال کی خبر کسی نے سُنی، کسی نے نہ سُنی اور جس نے سُنی اُس نے یہ بھی نہ جانا کہ یہ کونسی ہستی تھی۔

مجھے اُن کے انتقال کی خبر اُن کی وفات کے کئی ہفتے کے بعد ملی، ایک اردو اخبار دیکھ رہا تھا کہ اس میں یہ خبر نظر سے گزری کہ سر شیخ عبدالقادر نے ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو پچھتر برس کی عمر میں لاہور میں وفات پائی، خبر پڑھنے کے ساتھ تعجب کے ساتھ زبان سے نکل گیا کہ "ارے! شیخ عبدالقادر نے وفات پائی" پاس والوں نے پوچھا کہ کون عبدالقادر! میں نے کہا ایک تھے، اب کیا کوئی سمجھے کہ اس "ایک تھے" میں پوچھنے والوں کے لئے کتنے تیر و نشتر چھپے ہیں۔

مرحوم سے میری واقفیت کو پوری نصف صدی گزر گئی، ۱۹۰۰ء میں ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ بڑی ہی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے پٹنہ عظیم آباد میں ہوا تھا

یہ پہلا اجتماع تھا جس میں ہیٹ اور عمامے ایک ساتھ جمع ہوئے، جسٹس سید شرف الدین، سید علی امام، سید حسن امام، نصیر الدین بیرسٹر اور خدا جانے کتنے نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور علماء و مشائخ ایک صف میں دین و ملت کے لئے کمربستہ نظر آئے، یہی وہ جلسہ تھا، جس میں میں نے مرحوم کو پہلی بار دیکھا، یہ اُن کی جوانی کا وقت تھا، انہوں نے ایک قومی کتب خانہ کے قیام کی تجویز پر تقریر فرمائی، جس کو وہ لکھ کر ساتھ لائے تھے، اس وقت میری عمر پندرہ سولہ برس ہوگی، عربی کی ابتدائی کتابیں زیر درس تھیں، مرحوم اس زمانہ میں آبزرور نام ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار کے اڈیٹر تھے، علماء کے جلسہ میں ایک انگریزی تعلیم یافتہ کی تقریر ایسے انداز میں جس میں پرانے بزرگوں کی تحقیقات کا احترام اور ان کی اس متروکہ دولت پر فخر تھا، بڑی توجہ سے سُنی گئی، میری عمر کا یہ پہلا واقعہ تھا، جس میں یہ اجتماع اور یہ منظر نظر آیا، محو حیرت تھا اور میں کیا سارا مجمع مقرر کے جادو سے مسحور تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مرحوم نے اپنی تقریر ایک ایسے انوکھے انداز سے شروع کی کہ جس میں اُن کا اور اُن کے اخبار کا اشتہار بھی تھا اور انداز بیان کی دلچسپی بھی تھی، انہوں نے کہا "حاضرین! اگر میں یہ کہوں کہ بزرگوں نے آپ کے لئے ایک بڑا دفینہ چھوڑا ہے، تو آپ کو میری اس بات پر یقین نہیں آئے گا، خصوصاً اس لئے کہ میں ایک اخبار نویس ہوں، اخبار کی خبروں پر یقین کس کو آتا ہے۔ (اس وقت ٹرنسوال میں بوئروں اور انگریزوں کی جنگ ہو رہی تھی، اس کا حوالہ دے کر کہا) ابھی یہ خبر آتی ہے کہ بوئروں کو شکست ہوئی اور کل اس کی تصحیح یوں ہوتی ہے کہ انگریزوں کی شاندار پسپائی ہوئی۔

مرحوم کی یہ پوری تقریر اس سال کی ندوہ کی روداد میں چھپی ہوئی ہے، اسی جلسہ میں مرحوم نے مخزن کا اشتہار تقسیم کیا تھا اور آخر بیسویں صدی کے پہلے مالی سال اپریل ۱۹۰۱ء سے انہوں نے مخزن نکالنا شروع کیا، یہ اردو کا وہ پہلا رسالہ

ہے جس نے نوجوان انگریزی تعلیمیافتہ اہل قلم کو اُردو کی خدمت کی دعوت دی اور جدید وقدیم ادب نوازوں کو ایک میز پر جمع کیا، کتنے اس وقت کے نوآموز اور نوجوان جواب مرحوم ہو چکے ہیں یا بوڑھے ہو گئے ہیں، اُن کے قلم کا پہلا ظہور اسی مخزن کے صفحات میں ہوا، ڈاکٹر اقبالؔ اسی کے ذریعہ روشناس ہوئے، سید حسرت موہانی کی صورت سب سے پہلے اسی بزم میں ہم کو نظر آئی، مولانا ابوالکلام کا پہلا مضمون "اخبار" اسی میں نکلا اور اسی طرح راقم الحروف کے سب سے پہلے مضمون "وقت" اور "معشوقۂ عرب کی یادیں" اسی میں چھپے، اُردو ادب پر مرحوم کا یہ بڑا احسان ہے کہ انہوں نے نوجوان تعلیمیافتوں کو اُردو ادب کی خدمت میں لگایا اور اُس سے زبان کو بڑا فائدہ پہنچا۔

مرحوم سے میرے تعلق خاطر کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اُن کو ندوہ کی تحریک سے دلچسپی تھی اور وہ اس کے اکثر ابتدائی جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور تقریر کرتے تھے اور اخیر اخیر تک وہ ندوہ کے رکن رہے، بارہ تیرہ برس کی بات ہے کہ دہلی کے ریڈیو اسٹیشن نے ایک سلسلۂ تقریر شروع کیا تھا "میں کن سے متاثر ہوا" اس سلسلہ کے پہلے نمبر میں مرحوم کی تقریر تھی انہوں نے اپنے تاثر کا آغاز سرسید احمد خاں مرحوم سے کیا تھا، اتفاق دیکھئے کہ اس تقریر کے دوسرے نمبر کے لئے میرا نام رکھا گیا، میں نے اپنی تقریر کا آغاز مرحوم سے کیا، کیوں کہ عمر میں پہلی دفعہ اُن ہی کی تقریر سنی اور انہی سے اثر پذیر ہوا۔

مرحوم کا آغاز گو انگریزی اور اُردو کے ادیب کی حیثیت سے ہوا، مگر ان کو اپنی روزی کے لئے یہ میدان بہت تنگ نظر آیا، اس لئے اس وقت کے سب سے ممتاز پیشہ قانون دانی کی طرف اُن کی توجہ مبذول ہوئی، اسی لئے ۱۹۰۴ء یا اس کے قریب زمانہ میں وہ بیرسٹری کے لئے لندن سدھارے اور چند برس کے بعد بیرسٹر

ہوکر لوٹے، راہ میں قسطنطنیہ کی بھی سیر کی، جس کی یادگار اُن کا سفرنامہ "مقام خلافت" ہے، واپس آکر بیرسٹری شروع کی، مگر اس پیشہ میں جیسا کہ چاہیے ان کو فروغ نہیں ہوا۔ اس لئے گورنمنٹ کی ملازمتوں اور عہدوں کی طرف اُن کی توجہ ہوئی، وہ ہائی کورٹ کے جج بھی ہوئے، لندن انڈیا کونسل کے ممبر بھی ہوئے اور پنجاب کونسل کے صدر اور وزیر تعلیم بھی رہے اور لیگ آف نیشنس جنیوا میں ہندوستان کے نمائندہ بنے، اُن کا آخری عہدہ بھاولپور ہائی کورٹ کی ججی تھی، بارہ تیرہ برس ہوئے ہوں گے کہ انہوں نے انجمن حمایت اسلام لاہور میں جس کے وہ اس وقت صدر تھے مجھے یاد فرمایا تھا، میں حاضر ہوکر اُن کا مہمان ہوا، اسی اجلاس میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی بھی اُن کے بلاوے پر گئے تھے اور اُن کے مہمان تھے۔

اس وقت کا ایک لطیفہ یاد آیا، مرحوم کی صدارت میں اس جلسے میں انجمن کو بہت چندے مل رہے تھے، بلکہ کہنا چاہیئے کہ روپے برس رہے تھے، اتفاق سے میں ایک صبح کو اُن کے مکان سے ٹہلنے نکلا، تو ایک چھوٹی سی مسجد کے دروازے پر یہ دُعا لکھی ہوئی نظر آئی "یا شیخ عبدالقادر شیئاً للّٰہ" واپس آکر میں نے شیخ صاحب سے عرض کی کہ حضرت انجمن میں اس قدر آپ کی صدارت میں روپے برسنے کی وجہ ابھی معلوم ہوئی، انجمن نے یا شیخ عبدالقادر شیئاً للّٰہ" کا عمل پڑھا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم یونیورسٹی کے لئے ایک وائس چانسلر کی تلاش تھی اور مرحوم کے احباب اس جگہ کے لئے اُن کو کھڑا کرنا چاہتے تھے، مجھ سے بھی مشورہ چاہا میں نے اس وقت کی وہاں کی صورت حال عرض کر دی، بعد میں دوسرے صاحب اس جگہ پر ہوگئے اور مرحوم بھاولپور جج ہوکر چلے گئے، مرحوم کو علی گڑھ کی تعلیمی تحریک سے بھی دلچسپی تھی، وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس مدراس کے صدر تھے اور مسلم یونیورسٹی کے رکن بھی تھے۔

مرحوم کی شخصیت گوناگوں اوصاف کی حامل تھی اور ہر مجلس و محفل میں انکی یکساں قدر و منزلت تھی، وہ نیک طینت، نرم مزاج، متواضع اور ملنسار تھے، انکی مختلف النوع خدمات میں میرے نزدیک سب سے بڑی خدمت اُن کی ادبی خدمت ہے اور وہ بھی خاص نوع کی یعنی لکھنے والے تو بیسیوں ہیں، مگر ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بیسیوں کو ادیب، انشا پرداز، اہل قلم مصنّف اور شاعر بنا دیا اور حق یہ ہے کہ انہیں نے ہندوستان کو اقبال بخشا اور انہیں کے فیض نے شاہنامۂ اسلام کے مصنف حفیظ جالندھری کو روشناس کیا۔

مضمون لکھنے کے بعد اتفاق سے ماہ نو کراچی (اپریل ۱۹۵۰ء) میں ان کی زندگی کے سنین نظر سے گزرے، جی چاہا کہ اوپر کے واقعات کی صحیح تعیین کے لئے بعض سنین یہاں نقل کر دوں۔

وہ ۱۸۷۴ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے ۱۸۹۴ء میں بی، اے ہوئے ۱۸۹۵ء میں پنجاب آبزرور میں اسسٹنٹ ایڈیٹر اور تین سال کے بعد چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے، ۱۹۰۱ء میں مخزن نکالا، ۱۹۰۴ء میں بیرسٹری کیلئے لندن گئے، ۱۹۰۶ء میں واپس آکر دلی میں بیرسٹری شروع کی، ۱۹۰۹ء میں لاہور چلے آئے، ۱۹۱۲ء میں لائلپور میں سرکاری وکیل ہوئے اور آٹھ سال تک یہ کام کرتے رہے، ۱۹۲۱ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جج ہوئے ۱۹۲۲ء میں پنجاب لیجسلیٹیو کونسل کے صدر بنے ۱۹۲۵ء میں وہ قائم مقام وزیر تعلیم مقرر ہوئے ۱۹۲۶ء میں لیگ آف نیشنس میں ہندوستان کے نمائندہ ہو کر جنیوا گئے ۱۹۲۶ء میں مسلم لیگ کے اجلاس دہلی کی صدارت کی ۱۹۲۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی مدراس میں صدارت کی ۱۹۲۸ء میں پنجاب ایگزیکیٹو کونسل کے قائم مقام ممبر بنے اور سر کا خطاب پایا ۱۹۲۹ء میں پبلک سروس کمیشن کے رکن ہوئے ۱۹۳۰ء میں لاہور ہائی کورٹ کے ایڈیشنل جج ہوئے ۱۹۳۴ء میں انڈیا کونسل لندن کے ممبر ہوئے اور پانچ سال تک

لندن رہے، جہاں سے ۱۹۳۹ء میں ہندوستان واپس آئے، اور اسی سال کچھ عرصہ کے لئے وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے قائم مقام ممبر رہے، ۱۹۴۲ء میں بھاولپور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس بنے، جہاں سے ۱۹۴۵ء میں واپس آکر لاہور میں مقیم ہوئے اور آخر یہیں فروری ۱۹۵۰ء میں سپرد خاک ہوئے۔

اوپر کی سطروں کے پڑھنے کے بعد ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ مرحوم نے وقت کے اور حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے حاصل کئے اور بڑے بڑے دنیاوی اعزاز سے سرفراز ہوئے، مگر دیکھنا کہ دنیا اگر انہیں یاد رکھے گی تو مدیر مخزن ہی کی حیثیت سے یاد رکھے گی اور اُن کی قبر پر احترام کے پھول چڑھاتی رہے گی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علمی وادبی احترام کے آگے دنیا کے سارے اعزاز ہیچ ہیں، اور آخر یہ اعزاز بھی تاریخ کے صفحوں میں آسودۂ خواب ہوجائے گا، دنیا نے کس کو یاد رکھا ہے اور کس کو یاد رکھے گی، شہرت بھی ایک فریب سراب ہے، یا نقش برآب۔

مرحوم کو علماء اور اہل دین سے ایک نسبت تھی، وہ مذہبی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت پر یقین رکھتے تھے، جس کا اظہار ندوہ کے اجلاس مدراس کی تقریر اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ منعقدہ مدراس کے خطبۂ صدارت میں انہوں نے کیا تھا، ابھی حال میں مدراس کے ایک بزرگ نے اُن کی وفات کے فوراً بعد اس کا اقتباس چھاپا ہے، اور یہ معلوم کرکے کہ اُن کا انتقال ہوگیا، تاریخ وفات کہی ہے، بزرگوں کا اُن کے حال پر یہ حسن التفات ان کی مغفرت کی بشارت ہے، رہے نام اللہ کا۔

مرحوم کی یادگار میرے پاس اُن کے ہاتھ کے دو خط ہیں، ایک اُردو میں ایک انگریزی میں، ۱۹۴۰ء میں وزارت تعلیم ریاست بھاولپور نے اپنے جامعہ عباسیہ کے نصاب تعلیم کے سلسلہ میں مجھے بلایا تھا، ریاست بھاولپور کے فرماں رواؤں کے ہمارے دارالعلوم ندوۃ العلماء پر بڑے احسانات ہیں، اسی کی امداد سے دارالعلوم

کی موجودہ ناتمام عمارت اس شان سے تعمیر پائی، جی چاہتا تھا کہ بقیہ عمارت بھی انہیں کی امداد سے تکمیل پائے، میں بھاولپور جاتے ہوئے شیخ صاحب مرحوم سے لاہور میں ملا اور ان سے خواہش کی کہ وہ وہاں کے چند اعلیٰ عہدہ داروں کے نام مجھے سفارشی خط لکھ کر دیں، چنانچہ مرحوم نے اس تعلق کی بنا پر جو اُن کو قدیم سے دارالعلوم ندوہ سے تھا، فوراً یہ دونوں خط لکھ دیئے، ایک اُردو میں کرنل قریشی صاحب کے نام اور دوسرا انگریزی میں خان بہادر محمد حسین صاحب کے نام، مگر وہاں کچھ مقامی حالات ایسے تھے کہ میں نے ان دونوں خطوں سے کام نہیں لیا، خود وزیر صاحب تعلیمات نے نواب صاحب بھاولپور کو ادھر متوجہ کیا اور انہوں نے وعدہ فرمایا اور پندرہ ہزار کی رقم منظور ہوئی، جس کی باقاعدہ اطلاع وزیر اعظم صاحب بھاولپور نے مجھے دی، مگر افسوس ہے کہ بار بار یاددہانی کے بعد بھی یہ وعدہ پورا نہ ہوا، کاش اگر اب بھی یہ رقم مل جاتی تو اس کو ایک طرح کا تعلق شیخ صاحب کی زندگی سے بھی ہوتا اور ہندوستان میں ایک پاکستانی فرماں روا کی یادگار قائم رہتی۔

مئی سنہ ۱۹۵۰ء

آہ! مولانا شروانی

اگست کی کوئی آخری تاریخ تھی، کہ لاہور کے کسی اخبار میں سرسری طور سے یہ خبر چھپی کہ مولانا شروانی کا انتقال ہوگیا، خبر پڑھ کر دل دھک سے ہوگیا اور اپنی دوری، مجبوری اور مجبوری پر بڑا افسوس آیا، میں نے مرحوم کی زندگی ہی میں اُن کے واقعات اور خاندان شروانی کے بعض احوال لکھوا کر دارالمصنفین میں رکھ لئے تھے اب جب اُن کا سانحہ پیش آیا تو تقدیر کی مجبوری دیکھئے کہ تدبیر کوئی کام نہ آئی۔

مرحوم نے چھیاسی سال کی عمر میں بتاریخ ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء اس دنیائے رنگ و بو کو خیر باد کہا اور سلف صالحین سے جا ملے (ان کی ولادت کی تاریخ ۲۸ر شعبان ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء ہے) مرحوم سے میرے تعلقات اس قدر گوناگوں تھے کہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کو کہاں سے شروع کیا جائے اور کیا کہا جائے اور کیا چھوڑا جائے، میں نے موصوف کو سب سے پہلے ۱۹۰۰ء میں نصف صدی پہلے پٹنہ کے اجلاس ندوہ میں دیکھا تھا، بھرا شباب، مردانہ حُسن و جمال، سپید رنگ سیاہ خوب صورت ڈاڑھی اور سر پر زلفیں، بلند و بالا قامت، لطیف و قیمتی لباس، جلسہ کے ہر اجلاس میں نیا جوڑا زیب بدن، کبھی سر پر عمامہ، کبھی گول ٹوپی، کبھی ترکی ٹوپی، جدھر نکل جاتے، آنکھیں اُٹھ جاتیں، انگلیاں اشارہ کرتیں، لوگ ایک دوسرے کو دکھاتے اور بتاتے، اسی طرح میں نے دیکھا اور بتایا گیا کہ یہ علی گڑھ کے رئیس عالم ہیں۔

۱۹۰۱ء میں جب میں ندوہ آیا، تو مدرسہ اُن کے ذکر جمیل سے پُر شور تھا،

انتظامی جلسے سال میں چند بار ہوتے اور وہ اُن میں جب آتے تو جلسہ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے ۱۹۰۴ء میں جب الندوہ نکلا اور وہ اس کے اڈیٹر ہوئے اور میرے ایک دو مضمون اس میں نکلے، تو تعارف بڑھا، جب وہ آتے میں حاضر ہوتا اور وہ اپنے بزرگانہ لطف ونوازش سے نوازتے ۱۹۰۶ء میں جب میری جماعت کی دستار بندی کا جلسہ ہوا اور خاکسار کی عربی تقریر نے حاضرین سے دادِ تحسین حاصل کی، اور حضرۃ الاستاذ نے خوش ہو کر اپنے سر سے دستار اتار کر میرے سر پر رکھی، تو اس جلسہ میں مولانا شروانی شریک نہ تھے، تاہم حضرۃ الاستاذ نے خود اپنے قلم سے لکھ کر ان کو اس واقعہ کی بڑی مسرت سے خبر دی، (یہ خط مکاتیب شبلی میں درج ہے) استاد کی یہ وساطت مولانا شروانی سے تقریب کا نیا ذریعہ بنی۔

۱۹۱۰ء میں جب مکاتیب شبلی کی تدوین کا خیال آیا تو استاد نے پھر مولانا شروانی سے تقریب کی کہ اُن کے پاس شبلی کے جو خطوط ہوں وہ سید سلیمان کو دیئے جائیں، ۱۹۱۲ء میں جب ندوہ میں حضرۃ الاستاذ کے حسب ایما انگریزی مدارس کے نصاب تاریخ کی غلطیوں کی تصحیح کا کام میرے سپرد ہوا، تو پھر تازہ تقریب کی گئی، نومبر ۱۹۱۴ء میں جب حضرت الاستاذ بیمار ہوئے اور حالت مایوسی کو پہنچی تو خاکسار حاضر خدمت تھا، سب سے پہلے میں نے اس شدتِ تعلق کی بنا پر جو ان دونوں دوستوں میں تھا، اس مضمون کا ایک مختصر کارڈ اُن کو بھیجا "افسوس کہ "الفاروق" کا مصنف اسوقت موت وحیات کی کشمکش میں ہے" ۱۸ نومبر کو مولانا نے وفات پائی، اس کی اطلاع دی، اس کے بعد سے جو اُن سے مکاتبات کا سلسلہ شروع ہوا تو آج سے دو برس پہلے تک اس وقت تک برابر قائم رہا جب تک اُن کی قوت حافظہ اور عام قوت جسمانی کام دیتی رہی، آج سے دو سال پہلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کی میٹنگ میں سب سے آخری دفعہ اُن سے ملا، میں نے دیکھا کہ اُن کا تیر سا قد نیم کمان بن

چکا ہے، وہ چہرہ جو گلاب سا تر و تازہ اور شاداب رہتا تھا، پژمردہ اور مرجھایا تھا، اسی وقت دل نے کہا کہ یہ چراغِ سحر بجھا ہی چاہتا ہے۔

میرا عمر بھر یہ دستور رہا کہ حضرۃ الاستاذ کے مخصوص احباب اور دوستوں سے بزرگداشت کا تعلق رکھوں اور ہمیشہ اُن کے سامنے اپنے کو چھوٹا سمجھوں، چنانچہ مرحوم سے خصوصیت کے ساتھ میری طرف سے خوردانہ اور اُن کی طرف سے بزرگانہ تعلق قائم رہا، میں انہیں مخدوم لکھتا، وہ عزیز لکھتے، دارالمصنفین کی تاسیس میں مرحوم کی بزرگانہ حمایت ہمیشہ رہنما رہی، دارالمصنفین کے پہلے صدر جسٹس مولوی کرامت حسین اور دوسرے نواب عمادالملک اور تیسرے مولانا شروانی ہوتے اس تعلق سے بھی اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ اکثر رہا، ایک دفعہ جب احباب اور بزرگوں کے محفوظ خطوط گنے تو سب سے زیادہ جن کے خطوط میرے پاس نکلے، وہ انہی کے تھے، میں نے جب انہیں اس کی اطلاع دی، تو اس پر مسرت ظاہر فرمائی اور لکھا کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے، اس کا الٹا ہوتا تو تعجب ہوتا۔

وہ قدیم وجدید تعلیم کا بہترین مجموعہ تھے، فارسی و عربی تعلیم گھر پر حاصل کی، عربی کی اونچی کتابیں حضرت مولانا مفتی محمد لطف اللہ صاحب علی گڑھی کے درس میں پڑھیں، انگریزی تعلیم میٹرک تک آگرہ اسکول میں پائی، اُن کی جوانی تک علم و فن اور دین و تقویٰ کے باکمال اکابر موجود تھے، وہ ہر ایک کے در تک پہنچے اور ہر ایک سے حسب استعداد کسب فیض کیا شیخ حسین یمنی عرب مقیم بھوپال سے سند حدیث حاصل کی، قاری عبدالرحمان صاحب پانی پتی سے فیض پایا، بیعت قطب الوقت حضرت مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی سے کی تھی، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کی زیارت سے بھی فیض یاب تھے۔

اُن کا سب سے پہلا مضمون جس نے لوگوں سے خراجِ تحسین وصول کیا وہ بابر پر ہے۔

جو رسالہ حسن حیدرآباد میں چھپا تھا اور جس پر مصنف کو ایک اشرفی انعام ملی تھی، مولانا شبلی کی المامون پر اُن کا تبصرہ اُن کا پہلا تنقیدی کارنامہ ہے، جو غالباً ۱۸۸۶ء میں شوق قدوائی کے اخبار آزاد میں چھپا تھا، اُن کے رسائل میں دو بہترین تاریخی رسائل ہیں، یہ دونوں ندوہ کے سالانہ جلسوں میں پڑھے گئے تھے، پہلے کا نام "علمائے سلف" ہے اور دوسرے کا نام "نابینا علماء" یہ دونوں انیسویں صدی کی یادگار ہیں ۱۹۰۱ء میں لاہور سے جب مخزن نکلا تو اس کی محفل میں بھی یہ شریک تھے، حضرت خسرو کے غزلیات پر اس میں اُن کا مضمون چھپا تھا، ۱۹۰۵ء میں الندوہ کے شریک اڈیٹر ہوئے، تو اخلاق پر اُن کے مضامین نکلے۔

علی گڑھ کی مجلسوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات میں الصدیق لکھ کر پیش کی، حیدرآباد کی میلاد کی مجلسوں کے وہ بانی تھے، اُن میں سیرۃ پر مختلف رسائل لکھے، جو چھپے اور پھیلے، معارف میں اُن کے مضامین اور اُن کی غزلیں اکثر زیب اوراق ہیں۔

شعر و شاعری کا ذوق اُن کو آغاز سے تھا، حسرت تخلص کرتے تھے، اردو اور فارسی دونوں میں مشقِ سخن کرتے تھے، اردو میں حضرت امیر مینائی سے اصلاح اور فارسی میں مولانا شبلی سے مشورہ کرتے تھے، فارسی کے مشہور شاعر حضرت خواجہ عزیز سے بھی مولانا شبلی کے ذریعہ سے تعلق رکھتے تھے۔

اُن کے اخلاقی فضائل میں وضعداری بڑی نمایاں تھی، جس سے جتنا ملتے تھے، تمام عمر اسی طرح ملتے رہے، جب لکھنؤ آتے تو منشی احتشام علی صاحب کی کوٹھی میں ٹھہرتے تھے اور تمام عمر میں کبھی اس وضع میں فرق نہیں آیا، پھر اس قیام میں جن جن بزرگوں اور دوستوں سے ملنے کا دستور تھا، اسی طرح وہ جا کر ملتے اور اتنی دیر بیٹھتے، لکھنؤ میں فرنگی محل اور وہاں بھی مولانا محمد نعیم صاحب کی نشستگاہ میں ضرور حاضر ہوتے۔

اُن کی جوانی تھی کہ ندوہ کا غلغلہ بلند ہوا، یہ وہ مجلس تھی جس کی روحانی اور علمی صدارت جن دو بزرگوں سے نسبت رکھتی تھی یعنی مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی اور حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب دونوں ہی سے اُن کو قلبی تعلق تھا اس لئے وہ ندوہ کے اُن اصلی ارکان میں تھے جن سے ندوہ کی مجلس عبارت تھی، وہ سب سے پہلے ۱۹۱۷ء میں ندوہ کے اجلاس ناگپور کے صدر ہوئے اور یہیں اسی وقت دولت آصفیہ مرحوم کی صدارت امور مذہبی کی خبر عام ہوئی جس کے بعد ان کا بارہ تیرہ برس کے قریب حیدرآباد میں قیام رہا اور جامعہ عثمانیہ کی تاسیس اور شعبۂ دینیات کے افتتاح میں اُن کی مساعی مشکور ہیں، حیدرآباد کا حال وہاں کے مقیم احباب سنائیں گے،

حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں بھی وہ دو دفعہ ندوہ کے اجلاس کے صدر ہوئے، پہلی دفعہ انبالہ میں اور یاد آتا ہے کہ دوسری دفعہ لکھنؤ میں مرحوم کو قومی اداروں میں سے علی گڑھ، ندوۃ العلما اور دارالمصنفین اعظم گڑھ سے خصوصیت کا تعلق تھا، مولانا شبلی مرحوم کے بعد غالباً ۱۹۰۵ء میں وہ انجمن ترقی اُردو کے بھی ناظم ہوئے اور دو تین سال کے قریب خدمت کے بعد قرعۂ فال مولوی عبدالحق صاحب کے نام نکلا، ان اداروں کے علاوہ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے بزرگوں سے بھی ارتباط رکھتے تھے اور ان درسگاہوں کی بھی امداد فرمایا کرتے تھے۔

عجیب اتفاق ہے کہ نادانستہ ۱۹۲۶ء میں سفر حج میں بھی میرا ان کا ساتھ ہوا، یہ مؤتمر اسلامی والا موقع تھا، یہاں یہ سخت بیمار پڑ گئے تھے، مگر بڑی ہمت کے ساتھ سارے ارکان ادا کئے، مدینہ منورہ کے قیام کے زمانہ میں میں نے اُن کا تعارف شیخ ابراہیم حمدی مدیر کتب خانہ شیخ الاسلام سے کرادیا، یہ تعلق چونکہ علمی اور رُوحانی دونوں تھا، اس لئے بڑا سازگار آیا اور اخیر اخیر وقت تک قائم رہا، حرمین محترمین

کی خدمت بھی وہ سالانہ کیا کرتے تھے، اخیر دفعہ جب دو سال ہوئے میں نے اپنے ارادۂ حج کی اطلاع ان کو دی، تو لکھا کہ اس دفعہ حرمین شریفین کی خدمت کی رقم آپ ہی کے ذریعہ جائے گی، مگر روانگی کے وقت نہ اُن کو یاد رہا اور نہ میں نے یاد دلایا۔

ان کو نادر اور قلمی کتابوں کا بڑا شوق تھا اور اس شوق کی تاریخ خود انہوں نے لکھ کر معارف میں چھپوائی ہے، مولانا شبلی مرحوم کے ذریعہ سے اور اُن کی پسند سے کتابیں خرید اکرتے، لکھنؤ میں عبدالحسین اور واجد حسین قلمی کتابوں کے تاجر تھے، لکھنؤ آتے تھے تو اُن کے نوادر دیکھنے اور چھانٹ کرنے جاتے، یوں بھی کتابیں ان کے پاس پہنچتی رہتی تھیں، حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں بھی بہت سی کتابیں حاصل کیں، میں جب سنہ ۱۹۲۰ء کے آخر میں یورپ سے واپس آیا، تو عزیزوں بزرگوں کے لئے جو تحفے لایا مرحوم کے لئے نستعلیق کے اچھے خطاطوں کی وصلیوں کی عکسی تصاویر کا مجموعہ لاکر پیش کیا۔

پہلے تو اصل وطن علی گڑھ میں بھیکم پور میں تھا، بعد کو بھیکم پور سے کچھ دور اُن کے نام سے اُن کے والد مغفور نے حبیب گنج نام ایک گاؤں آباد کیا تھا، وہیں زنانہ اور مردانہ مکانات، مسجد اور ایک کتب خانہ کی عمارت تیار کی تھی، زمینداری کے شغل کے بعد بھی یہی کتب خانہ اُن کی دلچسپی کا مرکز تھا۔

معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد ہاتھ میں ایک بڑی سی لکڑی لے کر باغ میں سیر کو نکل جاتے، اس وقت اُن کے دوسرے ہاتھ میں تسبیح ہوتی، لکھنؤ آتے تو صبح کو پیدل منشی احتشام علی کی کوٹھی واقع خیالی گنج سے مولوی عبدالباری صاحب ندوی کی کوٹھی ہارڈنگ روڈ تک پیدل جاتے، واپسی سواری پر ہوتی، دارالمصنفین آتے تو احاطہ کے اندر کمرہ کے باہر روش پر ٹہلا کرتے۔

ایک دفعہ دارالمصنفین کا جلسۂ انتظامیہ رمضان المبارک میں مقرر کیا، ہم نے

عذر کرنا چاہا تو جواب میں لکھا کہ کیا رمضان مسلمانوں کے کام میں مانع ہے، غرض تشریف لائے، اس زمانہ میں وہ چائے کے بجائے اُولٹین پیتے تھے، میں کافی اور مولوی مسعود علی صاحب چائے پیتے تھے، سحری میں یہ تینوں شراب الصالحین لائی جاتیں اور ہر ایک کا ایک ایک دَور چلتا اور بڑی خوشی سے پیتے اور بعد کی ملاقاتوں میں اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔

دارالمصنفین کی مسجد مرحوم ہی کی کوشش سے نواب مزمل اللہ خان مرحوم کی امداد سے مولوی مسعود علی صاحب کی نگرانی اور انجینیرنگ میں بنی، پھر دارالعلوم ندوہ کی مسجد بھی برادر موصوف ہی کی نگرانی اور انجینرنگ میں بنی، مرحوم دونوں کو دیکھ کر برادر موصوف کے تعمیری ذوق کو بہت پسند فرماتے تھے، چنانچہ جب وہ علی گڑھ میں حبیب منزل بنوانے لگے تو مولوی صاحب موصوف کو بلوا کر اُن سے مشورہ کیا۔ انہوں نے جو مشورہ دیا اس میں سے سامنے کی روکار عمارت ہے، فرماتے تھے کہ اگر یہ حصّہ نہ بنتا، تو یہ عمارت کچھ نہ ہوتی۔

مرحوم کے اخلاق کی دو خصوصیتیں عجیب تھیں، ایک یہ کہ جس شخص سے جس جہت سے اُن کا تعلق ہوتا، وہ اس سے اسی جہت سے ملتے اور اسی کے متعلق باتیں کرتے اس کی دوسری جہتوں سے اُن کو کوئی تعلق نہ ہوتا، حکیم اجمل خان مرحوم سے گہرے تعلقات تھے، مگر یہ یک جہتی، قدیم قلمی مخطوطات اور قدیم تہذیب و شرافت کے افکار سے تھی، ان دونوں کی ملاقاتوں میں یہی تذکرے رہتے، کہیں بیچ میں سیاست کا نام بھی نہیں آتا، مولانا ابوالکلام سے بھی مولانا شبلی کے واسطہ سے اُن کے تعلقات تھے، اُن کی ملاقات اور مکاتبت بھی جو چھپ چکی ہے سیاست کے تذکرہ سے خالی ہے، میری زندگی پر مختلف دَور گزرے ہیں، جن میں سیاست بھی ہے، مگر کبھی کسی خط میں نہ میں نے اس کے متعلق کچھ لکھا اور نہ کبھی انہوں نے پوچھا۔

اُن کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اُن کی مجلس میں کبھی کسی کی برائی یا غیبت نہیں ہوتی، کوئی کرتا بھی تو اڑا دیتے، خطوط میں بھی احتیاط تھی، اگر ناگزیر طور سے کچھ ذکر آتا تو اس طرح اشارہ کنایہ میں کہتے کہ غیر اس کے سمجھنے سے قاصر رہتے،

مرحوم کو اچھی اور تاریخی یادگاروں کا شوق تھا، بعض بادشاہوں کے فرامین تلواریں یا خنجر اُن کے پاس تھے۔ میں جب ۱۹۳۳ء میں کابل کے سفر سے واپس آیا اُس کے بعد مرحوم دارالمصنفین آئے، تو قالینوں کا تذکرہ نکلا، میں نے عرض کیا کہ نادر شاہ شاہ کابل نے مجھے ایک قالین عنایت کیا ہے، اُن کو دکھایا تو اس کو پسند کیا، ملا صاحب سے جو اُن کے رفیق خاص تھے اور ہمیشہ سفر میں ساتھ رہتے تھے، فرمایا "ملا جی یہ تو پٹھانوں کا مال ہے، ساتھ باندھ لو" چنانچہ وہ قالین اُن کے نذر کر دیا کہ شاہاں بشاہاں می دہند، فقیروں کے یہاں اُس کا کیا کام، البتہ شاہ کی دی ہوئی تسبیح سبز شاہ مقصود کی فقیر کے پاس ہے۔

مرحوم بزرگوں کے قصے، لطیفے، حالات اور حکایتیں اس قدر ذوق وشوق ولطف سے مجلس میں بیان فرمایا کرتے تھے کہ اس وقت وہ بلبل ہزار داستان معلوم ہوتے تھے، اُن کی تقریروں کا بھی یہی رنگ تھا، آواز گو پست تھی، مگر تقریر مسلسل اور تاریخی واقعات کے حوالوں سے پرتاثیر ہوتی تھی، اُن کی انشاپردازی کا بھی ایک خاص رنگ تھا، نہایت ستھرا اور پاکیزہ تکلف سے بری، تصنع سے خالی اور آورد سے پاک، بزرگوں کے تذکرے ادب سے کرتے تھے، زبان فطرۃً نہایت ادب شناس عنایت ہوئی تھی، لہجہ میں سختی اور آواز میں کرختگی مطلق نہ تھی، گرم سے گرم موقعوں پر بھی وہ حدود سے باہر قدم نہیں رکھتے تھے۔

بظاہر وہ اخلاق میں بڑے نرم اور مرنج ومرنجاں تھے، مگر جب کسی وقت کسی چیز پر اڑ جاتے تو پھر اُس سے نہ ٹلتے تھے، چنانچہ حیدرآباد سے علیحدگی کا سبب

یہی پیش آیا، اس پر ایک شعر انہوں نے کہا جو مجھے لکھ بھیجا تھا۔

شاہباز ہمتم، ربطے بدست شاہ داشت
دست دیگر ترک کردہ در ہوا پرواز کرد

یہ بھی اُن کی سیرت کا قابل ذکر واقعہ ہے کہ باوجود ایک رئیس ابنِ رئیس ہونے کے اور حکام ضلع سے اچھے تعلقات رکھنے کے سرکاری اعزاز و احترام اور خطاب والقاب سے بچتے تھے، ایک دفعہ اُن کو شمس العلماء کا خطاب ملنے والا تھا، ان کو خبر ہوئی تو پوری کوشش کی کہ اس خطاب سے اُن کو بری رکھا جائے، فرماتے تھے کہ حیدر آباد کا خطاب اس لئے قبول کیا کہ یہ ایک دولتِ اسلامیہ کی نشانی تھی۔

مرحوم کو ملتِ اسلامیہ سے بڑی محبت تھی، اس کے اچھے واقعات اور مسرت بخش تذکروں سے خوش ہوتے تھے اور اُس کے نفاق و اختلاف کی باتوں سے ہمیشہ کنارہ کش رہتے، ندوہ کے باہمی اختلاف کے زمانہ میں باوجود اس کے طرفین دوست تھے، دونوں سے بیگانہ رہے اور جب مولانا شبلی کی وفات کے بعد مصالحت کا زمانہ آیا تو وہ سب سے آگے تھے۔

مرحوم گو سیاست سے سروکار نہیں رکھتے تھے تاہم ملک کے پچھلے واقعات سے بہت غمگین تھے، عمر کے ساتھ کچھ ملکی اور کچھ خانگی افکار نے بھی اُن کے دل دماغ کو متاثر کیا، مگر ضابط اور متحمل ایسے تھے کہ کبھی اس داستان کا ایک حرف زبان پر نہیں آیا، اُن کے قویٰ میں سب سے پہلے اُن کے حافظہ نے جواب دیا، اکثر بات بھول جاتے، جب کاروانِ خیال نکلا، تو اس میں مولانا ابوالکلام کے جواب میں اُن کا یہ بیان پڑھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ "ہاں مجھے یاد ہے کہ دو نوجوان ابوالنصر آہ اور ابوالکلام نمایاں ہوتے تھے اسی سلسلہ میں سنا کہ آپ بغداد چلے گئے۔ تفصیلات اب معلوم ہوئیں"۔ میں نے انہیں لکھا کہ یہ صحیح ہے کہ سفر عراق پر (شاید ۱۹۰۶ء میں) دونوں جوان عراق کے سفر کو نکلے تھے

جن میں سے ایک ابوالنصر غلام یاسین (مولانا ابوالکلام کے بڑے بھائی) تھے، ابوالکلام نہیں تھے، اُن کے رفیق اس سفر میں حافظ عبدالرحمان امرتسری تھے اور اس وقت مولانا ابوالکلام امرتسر میں وکیل کے ایڈیٹر تھے، بیچارے ابوالنصر نے عراق میں انتقال کیا، ہندوستان خبر آئی، تو مولانا ابوالکلام نے وکیل میں اپنے حزن وغم کا اظہار فرمایا، اخیر میں میں نے لکھا کہ آپ کے اسطرح تصدیق کر دینے سے افسانہ بھی تاریخ بن جائے گی۔

اس پر مرحوم نے خاموشی اختیار کی اور کچھ جواب نہیں دیا، یہ ان کی خاص عادت تھی کہ جس بات پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے اس کے جواب سے اعراض کرتے، اسی سے اُن کے ادا شناس اُن کے مطلب کو سمجھ جاتے۔

مرحوم کو بزرگوں کی یادگاروں سے والہانہ شیفتگی تھی، پٹنہ کے اجلاس ندوہ میں غالباً حاجی شاہ منور علی دربھنگوی بانی مدرسہ امدادیہ دربھنگہ جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے خلیفہ تھے، ندوہ کے جلسہ میں وہ دستار سر پر باندھ کر آئے جو حضرت حاجی صاحب کا عطیہ اور تبرک تھا، ایک تعلیم یافتہ کی تقریر پر جلسہ میں ایک ایسا پُر عظمت جوش، علماء، مشائخ، صلحاء اور عامۂ مسلمین پر طاری ہوا کہ جو جس کے پاس تھا وہ ندوہ کے نذر کر دیا، شاہ منور علی صاحب نے وہی دستار اتار کر پھینک دی، وہ دستار نیلام ہو کر بڑی قیمت پر فروخت ہوئی۔ وہ کون خوش قسمت تھا جس نے آگے بڑھ کر اس کی حسب حیثیت قیمت ادا کی اور اس کو اٹھا کر آنکھوں سے لگایا۔ نوجوان حبیب الرحمان خان شروانی! پھر اس کو وہ ہمیشہ اپنے لئے طرۂ سعادت سمجھتے رہے۔

اُن کے اخیر دَور کی یادگاروں میں استاذ العلماء مولانا لطف اللہ صاحب کی سوانح عمری اور خطیب بغدادی پر حنفی نقطۂ نظر سے تبصرہ ہے، جو معارف میں چھپے ہیں اور الگ بھی شائع ہوئے، انہوں نے مولانا سلیمان اشرف صاحب کی کتاب المبین پر ایک تبصرہ لکھا اور میرے پاس بھیجا، اسی زمانہ میں فقیر کی تصنیف عرب وہند

کے تعلقات" چھپی تھی، جی چاہا کہ مرحوم کے قلم سے اُس پر ایک تبصرہ شائع ہوتا تو مصنف کو فخر و مباہات کا ایک موقع ہاتھ آتا، اس موقع پر اپنے مطلب کو میں نے اس طرح ادا کیا، المبین پر تبصرہ ملا، یاد آیا کہ حضرۃ الاستاذ کی تصنیفات پر آپ کا تبصرہ ہمیشہ ہوا کرتا، چنانچہ المامون، الغزالی، سوانح مولانا روم اور شعر العجم وغیرہ پر تبصرے پڑھے گیا حضرۃ الاستاذ کی متروکہ موروثی سعادتوں میں سے راقم کو بھی اس سنتِ دیرینہ کی موروثی سعادت کے حصول کا موقع ملے گا، مرحوم نے بڑی خوشی سے تبصرہ لکھا، جو معارف میں شائع ہوا۔

مرحوم کی پابندی وضع کی ایک خاص یادگار علی گڑھ میں مولانا سلیمان اشرف صاحب کی قیام گاہ میں اخیر وقت کی حاضری تھی، جو بعد مغرب تک جاری رہتی۔ جب وہ علی گڑھ آتے، یہ حاضری بلاناغہ ہر موسم میں اور ہمیشہ رہی۔ اس وقت دلچسپی کا سامان علمی مسائل پر گفتگو رہتی، مولانا سلیمان اشرف صاحب کی وفات کے بعد مولانا مفتی عبداللطیف صاحب کی قیام گاہ پر اسی وقت اور اسی حیثیت سے یہ مجلس جاری رہی۔

مرحوم اپنے دور کے خاتم تھے، اب اس جوہر شرافت کا نمونہ کبھی دیکھنے میں نہ آئے گا، اب گلستاں کا رنگ اور ہے، چار دانگ میں ہوائیں اور سمت کی چل رہی ہیں اب ریاست اور ریاست کے ساتھ کمالات و فضائل کا یہ اجتماع گزشتہ تاریخ کا ورق بن کر رہ جائے گا، مگر انشاء اللہ یہ ورق یادگار رہے گا، ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

جون ۱۹۵۱ء

واحسرتا!

سید فضل الحسن حسرت موہانی رحمہ اللہ تعالیٰ کی شدتِ علالت کی خبریں یہاں کے اخباروں میں کئی ہفتوں سے چھپ رہی تھیں کہ دفعۃً ۱۵ر مئی ۱۹۵۱ء کے ریڈیو میں اُن کی وفات کی خبر آئی، حسرت مرحوم ابھی چند ماہ ہوئے کہ اسی سال ۱۳۶۹ھ کے حج سے فارغ ہو کر جدہ سے کراچی آئے تھے، دیکھا کہ اُن کا گداز جسم ضعف سے سکڑ گیا ہے، اسی وقت خیال آیا کہ یہ حضرت بھی جگہ خالی کرنے والے ہی معلوم ہوتے ہیں، کراچی سے واپس جا کر شاید ہی کچھ دن اچھے رہے ہوں گے کہ علالت کی خبریں آنے لگیں۔

حسرت اودھ ضلع اناؤ کے مردم خیز قصبہ موہان میں نیشاپوری سادات کے خاندان میں ۱۲۹۷ھ میں پیدا ہوئے، قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی تعلیم موہان ہی میں حاصل کی، اس کے بعد اُردو مڈل اسکول میں داخل ہوئے اور اس امتحان میں تمام صوبہ میں ممتاز رہ کر سرکاری وظیفہ حاصل کیا اور مزید تعلیم کیلئے فتحپور ہسوہ جا کر گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہوئے اور انٹرنس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا۔

فتحپور ہسوہ کی آب و ہوا حسرت کی ادبی و ذہنی و دینی تعلیم کے لئے بہت راست آئی، یہاں مولانا سید ظہور الاسلام ایک نہایت متقی و پرہیزگار اور باصفات بزرگ تھے، حضرت قطب الوقت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مراد آبادی کے

مرید وخلیفہ تھے، ندوۃ العلماء کے ارکان خاص میں سے تھے، اس لئے خاکسار کو بار بار ان کی زیارت کا موقع ملتا رہا، بلکہ میرے بچپن میں وہ مولانا محمد علی صاحب مونگیری کے ساتھ خاکسار کے وطن دیسنہ ضلع پٹنہ تشریف لائے تھے، تو پہلے پہل وہیں اُن کی زیارت ہوئی تھی، حسرت مرحوم کو انہیں پاک مشرب و پاک نہاد اور پاک باز بزرگ کی صحبت حاصل ہوئی، ان کے علاوہ مولانا نور محمد اور مولانا حبیب الدین صاحب جیسے بزرگوں کا فیض بھی نصیب ہوا، بچپن ہی میں وہ قادری سلسلہ میں مولانا شاہ عبدالوہاب صاحب فرنگی محلی (پدر بزرگوار مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی یعنی جد بزرگوار مولانا جمال میاں صاحب فرنگی محلی) کے مرید ہو چکے تھے اور اسی سلسلہ سے سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے اُن کو عقیدت خاص تھی اور بزرگانِ فرنگی محل سے بھی ان کو نسبت حاصل تھی، یہی وجہ تھی کہ ہزاروں انقلابات کے باوجود حسرت اپنی مذہبی زندگی اور صوفیانہ مشرب میں ہمیشہ غیر متزلزل رہے۔

فتحپور ہی میں اُن کی شاعری کی زبان بھی کھلی، کچھ مخصوص احباب کی صحبت میں ادبی ذوق پیدا ہوا اور عمر کے ساتھ یہ ذوق بڑھتا ہی گیا، فتح پور سے انٹرنس پاس کر کے وہ علی گڑھ کالج میں جاکر داخل ہوئے، وہ ذوق وصحبت اور لطف ولطافت کے اس مرکز میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، سنا ہے کہ چونکہ وہ شرفائے اودھ کے لباس اور وضع میں تھے اور ساتھ اودھ کی پرانی وضع کا بڑا سا پاندان بھی ساتھ تھا کالج کے دستور کے مطابق بے تکلف دوستوں نے ان کو خالہ جان کا خطاب دیا، مگر خالہ جان نے بھانجوں کی شرارت اور چھیڑ چھاڑ کی کبھی پروانہ کی اور اپنے مذاق طبیعت پر برابر جمے رہے وہاں شعر وسخن کی ایک نئی مجلس شاید اردوئے معلّٰی کے نام سے قائم کی اور اُن کے وجود سے شعر وسخن کے چرچے نے کافی ترقی کی، کالج کے یونین میں بھی بارہا تقریریں کیں اور نظمیں سنائیں اور حاضرین اور نواب محسن الملک سے داد وتحسین حاصل کی۔

مرحوم نے ۱۹۰۳ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی اور مذاقِ زمانہ کے خلاف کسی اعلیٰ ملازمت کے بجائے علم وفن اور شعر وسخن کی خدمت کا تہیہ کیا اور اردوئے معلّٰی کے نام سے ایک بلند پایہ ادبی رسالہ علی گڑھ سے جاری کیا، اس سے دو تین سال پہلے مخزن لاہور سے نکل چکا تھا۔ اردوئے معلّٰی نوجوان جدید تعلیم یافتہ گروہ کی ادبی خدمت کا دوسرا قدم تھا، مگر مرحوم کی طبیعت میں جو تضاد تھا اُس کا نتیجہ یہ تھا کہ اردوئے معلّٰی کے صحن میں شعر وسخن کے چمنستان کے ساتھ سیاست کا خارستان بھی نظر آیا چنانچہ اُس زمانہ میں جب مسلمان سیاسیات سے جھجکتے تھے، علی گڑھ کا یہ نوجوان بے باک گریجویٹ کانگریس میں شامل ہوگیا اور ۱۹۰۴ء میں بمبئی کے اجلاس کانگریس میں ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے اور سورت کانگریس تک برابر وابستہ رہے، سورت کانگریس کے اختلاف کے بعد یہ تلک کی رہبری میں کانگریس سے الگ ہوگئے۔

اُردوئے معلّٰی میں شعر وسخن کے پھول اور سیاست کے کانٹے ایک ساتھ ناظرین کے سامنے پیش ہوتے رہے اور لوگ حسب مذاق اس دورنگی سے لطف اندوز ہوتے رہے اس زمانہ کے اُردوئے معلّٰی میں اُن کے اور دوسرے اصحاب ذوق کے خوب خوب ادبی مضامین نکلے، اس وقت کی ایک دلچسپ ادبی بحث یاد ہے۔ اقبال کی شہرت کا آغاز تھا، انہوں نے کسی نظم میں "اُن سے کہا" اور "اُن کو کہا" کے موقع استعمال میں غلطی کی تھی، حسرت نے اس پر اُن کو ٹوکا اور ان دونوں محاوروں کے فرق استعمال کو سمجھایا۔

پانچ برس تک اُردوئے معلّٰی نکلتا رہا، ۱۹۰۸ء میں اس میں ایک بے نام صاحبِ قلم کا ایک مضمون مصر کے نامور لیڈر مصطفیٰ کامل کی موت پر شائع ہوا، جس میں مصر میں انگریزوں کی پالیسی پر بے لاگ تنقید تھی، یہ مضمون سرکار کی نظر میں قابل اعتراض ٹھہرا اور یہ علی گڑھ کی سلطنت میں بغاوت کا پہلا جرم تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ کالج کی حرمت کو بچانے کے لئے کالج کے بڑے بڑے ذمہ داروں نے حسرت کے خلاف

گواہی دی، یہاں تک کہ نواب وقار الملک نے بھی ایک دو فقروں میں مضمون مذکور کی مذمت ہی کی، بادداشن میں حسرت مرحوم کو دو برس کی قید سخت کی سزا ہوئی، اُن کا کتب خانہ اور پریس پولیس کے ظلم و ستم کی نذر ہو گیا، اُس کتب خانہ میں شعراء کے تذکرے اور دواوین کے بڑے نادر نسخے تھے۔

یہاں حسرت کے ایک کیرکٹر کا ذکر کرنا ہے، مضمون مذکور حسرت کا نہ تھا، مگر مقدمہ قائم ہونے پر حسرت نے اُس کو خود اُوڑھ لیا اور باوجود اصرار کے اُس کے لکھنے والے کا نام نہیں بتایا، جہاں تک کان میں پڑی ہوئی بات اس وقت یاد آتی ہے خیال آتا ہے کہ یہ مضمون اعظم گڑھ کے مشہور شاعر وکیل اقبال سہیل کا تھا جو انہیں کی طرح شعر و سخن اور سیاسی مذاق کا اتحاد رکھتے تھے۔

حسرت مرحوم سے میری پہلی ملاقات قید سے چھوٹنے کے بعد ۱۹۱۰ء میں ہوئی اور وہ اس طرح کہ میں دارالعلوم ندوہ سے فارغ ہو کر الندوہ کا سب ایڈیٹر اور مدرسہ میں مدرس تھا، مدرسہ کے قریب ہی گولہ گنج میں، نواب مرشد آباد کے مکان کے ایک کمرہ میں رہتا تھا، یہ وہی مکان ہے جس میں اب اخبار حق کا دفتر ہے، میں اپنی کوٹھری میں تھا کہ ایک صاحب نے آکر اطلاع دی کہ باہر ایک صاحب کھڑے ہوئے ہیں تم کو بلاتے ہیں، باہر نکلا تو حسرت تھے، میں نے کہا کہ آپ نے تکلف کیوں کیا، کیوں اندر چلے نہیں آئے، اُس زمانہ کی سیاسی حالت کی پستی کا اندازہ کیجئے۔ حسرت نے جواب دیا کہ چونکہ لوگ مجھ سے ملتے ہوئے گھبراتے ہیں اس لئے میں نے احتیاط کی راہ سے مطلع کر دیا۔ میں حسرت صاحب کو اپنے کلبۂ احزاں میں لایا، اوپر چھت پر جو کمرہ تھا، اس میں بستی اور گورکھپور کے کچھ احباب تھے، جو کرسچین کالج میں پڑھتے تھے، آرام کے خیال سے رات کو سونے کے لئے وہاں اُن کے لئے انتظام ہوا، وہاں یہ بتا دینا چاہئے تھا کہ اس

وقت سیاست میں سودیشی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا، یہ سردی کا زمانہ تھا، میزبانوں نے اُن کے پائتانہ کمبل رکھ دیا تھا، وہ کمبل ولایتی تھا، حسرت نے رات سردی میں اسی طرح کاٹ دی، مگر وہ کمبل نہیں اوڑھا۔

اُس کے بعد حسرت صاحب کا جب لکھنؤ آنا ہوتا تو ہمارے دارالاقامہ میں آتے، اور سیاست پر باتیں کرتے اور تلک مہاراج کے سیاسی خیالات اور سیاسی عزائم کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں کرتے اور ہندوستان کی آزادی کی پیشگوئی جس یقین اور عقیدہ کی پختگی کے ساتھ کرتے اس پر ہم کو بڑا تعجب ہوتا اور سیاست کی ہر مشکل آسان نظر آنے لگتی۔

مسلمان ۱۹۰۶ء تک ہندوستان کی سیاست سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ مدراس کے سید محمد کا نام کانگریس میں کبھی کبھی سنائی دیتا تھا۔ یا بمبئی کے جسٹس طیب جی کا خیال کبھی کبھی ظاہر ہوتا تھا، مولانا شبلی مرحوم خیال کی حد تک کانگریس کے ساتھ تھے۔ مگر بہادر نوجوان حسرت پہلا شخص ہے، جس نے علی گڑھ کی پالیسی کے برخلاف جہاد کا علم بلند کیا اور اردوئے معلّٰی ادب کے ساتھ ساتھ سیاست کا صحیفہ بھی بنتا گیا، اسی زمانہ میں دو عالموں کے مضامین کانگریس کی حمایت میں اردوئے معلّٰی میں چھپے تھے، جن میں مسلمانوں کو سیاست کی دلیرانہ تعلیم دی گئی تھی، اُن میں ایک مضمون حیدر آباد دکن کے ملا عبدالقیوم صاحب کا تھا، جو دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کے بانیوں میں سے ایک تھے، دوسرا ایک بھوپالی عالم مولوی برکت اللہ صاحب مرحوم کا تھا جو جنگ عظیم سے بہت پہلے ہندوستان چھوڑ کر یورپ چلے گئے تھے اور اخیر وقت اسلام کی بین الاقوامی سیاست پر مضامین لکھا کرتے اور ہندوستان کے دوسرے آزادی خواہ ہندوستانی نوجوانوں کی یورپ میں رہبری کرتے تھے، ۱۹۲۶ء تک وہ زندہ تھے اور سوئزرلینڈ میں قیام تھا اور خلافت کے لئے کوشاں

تھے، وہیں انتقال بھی کیا۔ مسئلہ خلافت پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی جو کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔

قید سے چھوٹنے کے بعد حسرت کے دوستوں نے بہت کوشش کی کہ وہ اس سیاست سے باز آجائیں، لیکن انہوں نے اس مخلصانہ نصیحت پر کان نہیں رکھا، دوستوں نے ساتھ چھوڑ دیا، اُردوئے معلّٰی کے قدردانوں نے خریداری ترک کر دی، لوگوں نے ملنے جلنے تک سے احتراز شروع کر دیا، مگر ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

حسرت اپنے عقیدہ میں اور پختہ ہوتے چلے گئے اور شروع سے جو اصول قائم کیا تھا اس میں سرمو فرق نہ آنے دیا۔

بوڑھوں میں صرف ایک مولانا شبلی مرحوم تھے جنہوں نے ابتدا ہی میں حسرت کی تائید کی اور ۱۹۰۴ء میں اردوئے معلّٰی کے پہلے پرچہ کے سیاسی مضمون کو پڑھ کر داد دی تھی اور لکھا تھا ؎

اینکہ گفتی حکایت سحراست

روز روشن ہنوز در قدراست

حسرت مسلمانوں میں سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے سودیشی تحریک کی رہبری کی، حسرت ہمیشہ کے غریب تھے اور یہ غربت ان معنوں میں ان کی اختیاری تھی کہ کالج کے دوسرے تعلیم یافتوں کی طرح انہوں نے سرکاری نوکری کی راہ اختیار نہیں کی اور اس امارت اور تعیش کی زندگی پر افلاس اور عسرت کی زندگی کو ترجیح دی، انہوں نے کبھی چند آنوں سے زیادہ گز کا کپڑا نہیں پہنا اور کبھی ولایتی کپڑے کو ہاتھ نہیں لگایا، اب انہوں نے سودیشی تحریک میں عملاً حصہ اس طرح لیا کہ سودیشی اسٹور کے نام سے سودیشی کپڑوں کی دکان قائم کی اور چاہا کہ ملک میں اس کی شاخیں جابجا

قائم کی جائیں، اُن کے اس کام میں نواب وقارالملک جو خود بھی اس سادگی پر عامل تھے اور مولانا شبلی مرحوم نے ان کی مدد کی ان دونوں کی سفارش پر سر فاضل بھائی کریم بھائی سے ملے اور مولانا کی سفارش سے سر فاضل بھائی سے قرض کپڑا خریدا اور اسٹور قائم کر دیا، اُن کی تجارتی سرگرمی کو دیکھ کر مولانا شبلی مرحوم نے اُن سے کہا تھا کہ "تم آدمی ہو یا جن، پہلے شاعر تھے، پھر پالٹیشن بنے اور اب بنیئے ہو گئے"

اُن کی یہ دُکان چل نکلی تھی کہ پے در پے سیاست کے انقلابات نے اُن کو کبھی بنیا بن کر اطمینان سے بیٹھنے نہیں دیا، اس لئے وہ نفع سے زیادہ خسارہ ہی اٹھاتے رہے۔

اسی زمانہ میں مسلمانوں میں کسی سیاسی تنظیم کے قائم کرنے کا خیال ایک بوڑھے اور ایک پختہ کار جوان کے ذہن میں آیا، یہ بوڑھے نواب وقارالملک اور پختہ کار جوان مظہر الحق صاحب بیرسٹر پٹنہ تھے، مظہر الحق صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ انہیں کی کوٹھی تھی، جس میں سب سے پہلے انہوں نے اور نواب وقارالملک مرحوم نے مل کر مسلم لیگ کا قالب کھڑا کیا اور شہر ڈھاکہ اس لحاظ سے مبارکباد کے قابل ہے جہاں خواجہ سر سلیم اللہ صاحب مرحوم کی دعوت پر سنہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا پہلا اجتماع ہوا، اس کے بعد تاریخ کے ورق جلد جلد الٹنے لگے، اُس وقت ہندوستان کی سیاست میں بنگال اور پونہ سب سے آگے تھے، اُن کے مقابلے کے لئے انگریز ہی تھے، جو پس پردہ مسلمانوں کو سیاست کے اسٹیج پر لائے، مگر لحاظ کے قابل یہ ہے کہ جس راہ کو برادرانِ وطن نے پچیس برس میں طے کیا تھا، مسلمانوں نے اس کو صرف چھ برس میں طے کر لیا، اُس کے لئے سازگار حالات بھی پیش آئے، جن میں سیاسی جراثیم کو اپنے نشو و نما کے لئے مناسب آب و ہوا اور فضا ہاتھ آئی۔

۱۔ سب سے پہلی چیز جس نے مسلمانوں میں سیاسی انقلاب کی لہر دوڑ آئی ــ وہ سنہ ۱۹۱۰ء میں تقسیم بنگال کی منسوخی تھی، بنگالیوں کی سیاست کا زور توڑنے کے لئے

لارڈ کرزن نے یہ مناسب سمجھا کہ بنگال کو مشرقی و مغربی بنگال میں تقسیم کر دیا جائے اس تقسیم سے مشرقی بنگال میں مسلمانوں کو ایسی اکثریت حاصل ہوگئی کہ وہ دفعۃً ہندو بنگالیوں کے سیاسی غلبہ کی دست برد سے باہر نکل آئے اور اس لئے مسلمانوں نے اس کا بہت خوشی سے خیر مقدم کیا، لیکن ہندو بنگالیوں نے اُس کے برخلاف نہایت شدت اور زور وقوت سے تمام ملک میں تحریک اٹھائی اور علانیہ باغیانہ مضامین لکھے اور باغیانہ تقریریں کی جانے لگیں، بلکہ آربند وگھوش کی پارٹی نے بم کے گولے بھی اُڑا لئے، مدت تک انگریز اس کو "طے شدہ مسئلہ" کہہ کر اپنی ہمت کا اظہار کرتے رہے، بالآخر ان کی طاقتِ صبر نے جواب دیدیا اور ۱۹۱۱ء میں بنگال کی تقسیم کو منسوخ کر کے دونوں بنگالوں کو پھر ایک کر دیا۔

اُن کی اس پالیسی سے جو بنگالی ہندوؤں کو رام کرنے کی خاطر کی گئی تھی، مسلمانوں میں بڑی برہمی پیدا ہوگئی اور بقول مولانا شبلی مرحوم سب سے پہلا بہادرانہ مضمون جس نے مسلمانوں کی سیاسی کروٹ بدل دی وہ نواب وقار الملک مرحوم کا باوقار اور سنجیدہ مضمون تھا اور اس کے بعد ۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی مرحوم کا وہ انقلاب انگیز مسلسلہ مضمون تھا جو "مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ" کے نام سے مسلم گزٹ لکھنؤ میں چھپا، ان مضامین نے مسلمانوں کی سیاسی ہوا کا رخ بدل دیا۔

۲۔ ابھی یہ بادل تھمنے بھی نہیں پایا تھا کہ یورپ سے ایک نیا سیلاب اٹھا، یعنی ۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں نے دورِ ترقی کے نام سے جو انقلاب برپا کیا، اسی وقت اٹلی نے موقع پا کر ۱۹۱۱ء میں ترکی کے برخلاف طرابلس الغرب پر دفعۃً حملہ کر دیا، اس واقعہ نے مسلمانانِ ہند کو اس درجہ مشتعل کر دیا کہ ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک آگ سی لگ گئی اور یہ آگ سالہا سال تک قائم رہی۔

۳۔ ابھی اس سیلاب میں کمی بھی آنے نہیں پائی تھی کہ ۱۹۱۲ء میں بلقانی ریاستوں

سنے مل کر ترکی کے یورپین علاقوں پر حملہ کر دیا، جو جنگ بلقان کے نام سے مشہور ہے اس نے اور بھی مسلمانوں میں اشتعال پیدا کیا۔

۴۔ ابھی یہ آگ لگی ہی ہوئی تھی کہ ۱۹۱۳ء میں کانپور میں ایک مسجد کے انہدام کا واقعہ پیش آیا، جس نے لگی ہوئی آگ میں تیل کا کام کیا، اور پورے ملک میں اُس سے آگ سی لگ گئی۔

۵۔ یہی زمانہ تھا، جس میں آغاخان کی سرپرستی میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک ہندوستان میں کھڑی ہوئی اور مسلمان اُس کی طرف متوجہ ہوئے، لیکن چند ہی روز کے بعد یہ سامان سکینت ایک نئے اضطراب کا پیش خیمہ بن گیا، یعنی یہ یونیورسٹی کن اختیارات اور شرائط کے ساتھ لی جائے، اس بحث نے مسلمانوں میں نرم وگرم دو فریق پیدا کر دیئے اور یہی وہ وقت ہے کہ جب مسلمانوں میں احرار نے جنم لیا، جن کے رہبروں اور رہنماؤں میں محمد علی مرحوم، شوکت علی مرحوم، مولانا ابوالکلام، ظفر علی خان اور حسرت موہانی تھے اور یہیں سے حسرت موہانی کو سید الاحرار کہا جانے لگا، وہ مسلم لیگ جو ابھی چھ برس پہلے بنی تھی، پرجوش نوجوانوں اور مصلحت اندیش بوڑھوں دو حصوں میں منقسم ہوگئی اور یہ روز بروز بڑھتی گئی۔

مسلم لیگ میں بھی یہ تفریق روز بروز نمایاں ہو رہی تھی، آغاخاں کے بعد راجہ محمد علی محمد خان محمود آباد کا زور بڑھ رہا تھا، مسجد کانپور کے ہنگامہ میں مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کی شخصیت سب سے پہلی دفعہ نمایاں ہوئی اور سید علی امام وغیرہ کے کوشش سے اس کا اختتام مصالحت پر ہوا، حسرت آغاخان کی لیگ میں شریک نہیں تھے، مگر جیسے جیسے لیگ میں آزادی بڑھتی گئی، وہ اس کے قریب آتے گئے اور اب مسلم لیگ میں داخل تھے، آگرہ کے اجلاس مسلم لیگ منعقدہ ۱۹۱۴ء میں جو مسجد کانپور کے ہنگامہ کی مصالحت کے بعد ہی ہوا تھا حسرت شریک تھے اور میں بھی اس اجلاس

میں شریک تھا، سردیوں کا زمانہ تھا، شب کے جلسہ میں مصلحت پسندوں نے لارڈ ہارڈنگ کے شکریہ کا رزولیوشن پیش کیا، یہ وہ موقع تھا جب ان مصلحت پسندوں کے ساتھ بہت سے احراری بھی اس کی تائید میں تھے، ایسے نازک موقع پر صرف دو نوجوان اس کی مخالفت کے لئے اٹھے، ایک حسرت موہانی اور دوسرے مولوی عبدالودود بریلوی مرحوم۔

اس موقع پر ایک لطیفہ یاد آیا، اس زمانہ میں مسلمانوں کے احساس میں ایسی شدت آگئی تھی کہ ذرا ذرا سی بات سارے ملک میں اشتعال کا باعث ہو جاتی تھی ۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی نے دارالعلوم ندوہ کی معتمدی سے مخالف ارکان کی مخالفتوں سے زچ آکر استعفار دیدیا تھا، دارالعلوم کے طلبہ نے اس پر اسٹرائک کی، ایسی پُرزور اسٹرائک اس سے پہلے کسی درسگاہ میں نہیں ہوئی تھی، سارے ملک میں ہنگامہ برپا تھا مولانا ابوالکلام کا الہلال اس تحریک کا علمبردار تھا، آجکل کے مشہور مصنف مولانا عبدالسلام ندوی نے جو اس زمانہ میں مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ بمبئی میں بطور مددگار تصنیف کے تھے، مولوی مسعود علی صاحب ندوی کے نام جو تعلیم سے فارغ ہو کر ندوہ میں مقیم تھے، ایک خط لکھا تھا جس میں اُن کو مشورہ دیا تھا کہ وہ طلبہ میں شورش پیدا کریں اور اخیر میں یہ لکھدیا تھا کہ یہ مولانا کا حکم ہے، یہ خط مخالفوں نے ڈاک سے اڑالیا اور طلبہ کی اسٹرائک کے بعد مخالفین نے اخبارات میں اس خط کو شائع کر کے یہ ثبوت بہم پہنچایا کہ یہ اسٹرائک مولانا شبلی صاحب کے اشارہ سے ہوئی ہے، مولانا مرحوم نے اس خط سے اپنی برأت اور لاعلمی ظاہر فرمائی، مولانا عبدالسلام نے اخباروں میں یہ لکھا کہ بے شبہ یہ میرا خط ہے اور مولانا کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، مولانا کے استعفے کی منظوری کی خبر سے مجھے اس درجہ تکلیف ہوئی کہ میرا دماغی توازن قائم نہیں رہا اور میں نے یہ لکھدیا اور زور ڈالنے کے لئے اپنے خیال کو مولانا کی طرف منسوب کر دیا۔

اس پر اخباروں میں مولانا عبدالسلام صاحب پر بحث شروع ہوگئی، اس موقع پر سید حسرت موہانی مرحوم نے لکھا کہ مولانا عبدالسلام نے جو کچھ کیا وہ بہت ٹھیک کیا، اُن کو معذرت کے بجائے جرأت کے ساتھ یہ اقرار کرنا چاہیے تھا کہ ندوہ کی اصلاح کے لئے میں اسٹرائک کو آخری علاج سمجھا تھا، اس لئے جو کچھ میں نے کیا وہ حق کیا۔

بہرحال یہ واقعہ تو لطیفہ کے طور پر درمیان میں آگیا، جس سے بھی حسرت کی طبیعت کا رنگ جھلکتا ہے۔

ذکر مسلم لیگ کا تھا۔

بمبئی وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلے مسلم لیگ اور کانگریس کا ملان ہوا، یہ ۱۹۱۵ء تھا اور یہی وہ سب سے پہلا اسٹیج تھا، جہاں مرحوم محمد علی[1] جینا (قائداعظم) مسلم لیگ کے صدر استقبالیہ کی حیثیت سے سب سے پہلے ظاہر ہوئے، مظہرالحق مرحوم اس کے صدر اجلاس تھے، کانگریس کا اجلاس بھی یہیں تھا، اس سبب سے مسلم لیگ کے اس اجلاس میں ہندو سیاسی لیڈر بھی دوستانہ شریک اجلاس تھے۔

ابھی صدارتوں کے خطبے ہی ہوئے تھے کہ بات یاد نہ رہی کہ اسٹیج پر حسرت موہانی مرحوم نمایاں ہوئے اور انہوں نے کسی چیز کی بڑی شدت سے مخالفت کی، بس ایک ہنگامہ جلسہ میں پیدا ہوگیا، چند پٹھان جوش و خروش سے آگے بڑھے اور اسٹیج پر قابض ہوگئے، آخر جلسۂ عام ملتوی کرنا پڑا، بعد میں معلوم ہوا کہ انگریز حکام کی تحریک سے

---

[1] شاید لوگوں کے لئے یہ بات اچنبے کی معلوم ہوگی کہ قائداعظم مرحوم کے نام کا آخری جزء اس وقت تک جینا تھا جس کے معنی گجراتی میں "نھنے" کے ہیں، ۱۹۱۶ء میں وہ لکھنؤ صدر کی حیثیت سے آئے تو سید جالب مرحوم ایڈیٹر ہمدم کی ذہانت نے اُس کو جناح بنا دیا، جس کے بعد وہ ایسا مشہور ہوا کہ اس نے اصل کی جگہ حاصل کرلی، خود میرا ہی اس زمانہ کا ایک شعر ہے ؎

ہر مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جیناہا

یا اُن کو خوش کرنے کے لئے بمبئی کے بعض سر برآوردوں نے کرایہ کے پٹھانوں کی مدد سے جلسہ کو درہم کرا دیا، غلط فہمی سے لوگ حسرت مرحوم کی نسبت سوءظن کرنے لگے حالانکہ ان سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، یہ اتفاقی بات تھی کہ ان کی مخالفت کو لوگوں نے ہنگامہ کا موقع بنا لیا۔

۱۹۱۴ء والی عالمگیر جنگ روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، ترکی نے اتحادیوں کے برخلاف جرمنی کا ساتھ دیا تھا، جس سے مسلمانوں کی ہمدردی خواہ مخواہ جرمنی کے ساتھ پیدا ہوگئی تھی، تھوڑے دنوں کے بعد انگریزوں کی سازش سے شریف حسین اور امیر فیصل کی سرکردگی میں ترکی سے بغاوت کی، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں شریف حسین کے خلاف بھی نفرت پیدا ہوگئی، حضرت مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند) اور ان کے دوسرے رفقاء حجاز میں قید ہو کر مالٹا بھیج دیئے گئے، ہندوستان میں بھی بڑے بڑے احراری لیڈر نظر بند کر دیئے گئے، مولانا ابو الکلام رانچی میں اور محمد علی مرحوم اور شوکت علی مرحوم چھندواڑہ میں، لیکن ابھی تک حسرت آزاد تھے اور مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی میں احرار کی سربراہی کر رہے تھے، آخر وہ بھی ۱۹۱۶ء میں پہلے للت پور اور پھر میرٹھ میں قید کر دیئے گئے، جس سے جنگ کے بعد چھوٹے، اس قید میں جو جو مصیبتیں حسرت نے جھیلیں اور جس طرح ناخوشگوار حالات کا مقابلہ کیا وہ اخلاق کی پختگی اور سیاسی عقیدہ کی استواری کی ایک داستان ہے۔

اب مسلم لیگ اور کانگریس یک جان دو قالب تھے، ایک ہی جگہ دونوں کے جلسے ہوتے تھے اور ایک کے لیڈر دوسرے کے جلسہ میں خاص طور سے ایک وقت شریک ہوتے تھے، اب خلافت کی تحریک شروع ہوئی، مسلم لیگ کے رہنما جن میں اس وقت لکھنؤ کے اندر راجہ صاحب محمود آباد اور چودھری خلیق الزماں اور دوسری طرف

مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی خدام کعبہ کے صدر کی حیثیت سے جس کے سکریٹری شوکت علی مرحوم تھے، اُس کی سربراہی کے لئے اُٹھے، راجہ صاحب تو پیچھے رہ گئے اور سرکاری مناصب میں اُلجھ گئے، چودھری صاحب اور مولانا عبدالباری صاحب باہم نبرد آزما تھے اور آخر دونوں صاحبوں کی شرکت سے خلافت کا یہ پہلا جلسہ مسلم لیگ کے زیر سایہ منعقد ہوا اور اس کے بعد خلافت کی تحریک جیسے جیسے زور پکڑتی گئی مسلم لیگ اس کے لئے اپنی جگہ خالی کرتی گئی، اب بھی وہ قائم تھی اور اس کے جلسے بھی ہوتے تھے مگر اس میں کچھ جان نہیں رہی تھی، اب خلافت کانفرنس اور کانگریس کا میل بڑھا اور دونوں کے ایک ساتھ اجلاس ہونے لگے۔

اس موقع پر ایک بات یاد آئی، تحریک خلافت کے آغاز میں امرتسر کے اجلاس کانگریس دسمبر ۱۹۱۹ء سے واپسی کے بعد گاندھی جی کے مشورہ سے یہ ضروری سمجھا گیا کہ کام شروع کرنے سے پہلے مسلمان رہنماؤں کا ایک وفد وائسرائے سے دہلی میں ملاقات کرکے اپنے مطالبات پیش کرے، وائسرائے نے ڈیپوٹیشن سے ملنا منظور کیا، اس ڈیپوٹیشن میں نرم و گرم ہر قسم کے لیڈر موجود تھے، حکیم صاحب ڈاکٹر انصاری، محمد علی، شوکت علی وغیرہ سب ہی تھے، خاکسار بھی شریک تھا، اخیر اخیر وقت تک بعض جاہ پسند لوگ اس میں شرکت کے لئے کوشاں تھے اور محرومی سے مایوس نہیں ہوئے تھے، لیکن دو مسلمان رہنماؤں کی شان اس میں نرالی رہی، ایک مولانا ابوالکلام آزاد جو مشوروں میں شریک تھے، جلسوں میں شریک تھے مگر اس ڈیپوٹیشن میں شرکت منظور نہیں کی حکیم صاحب وغیرہ نے ہرچند اصرار کیا، مگر ان کا انکار ہر اصرار پر غالب رہا، مگر اس سے زیادہ نرالی شان حسرت موہانی کی رہی، مولانا ابوالکلام والے طریق سے اپنی ذات کی بڑائی کا اظہار نمایاں ہوتا تھا، مگر حسرت نے یہ کیا کہ ایک طرف تو خاموشی کے ساتھ ڈیپوٹیشن میں شرکت کی اور وائسرائے ایگل لاج میں ڈیپوٹیشن کے ممبروں کیساتھ موجود تھے، لیکن عرض و معروض وجواب کے بعد جب وائسرائے سے ہاتھ ملانے کا اعزازی لمحہ آیا تو میں نے دیکھا کہ حسرت چپکے سے

اٹھ کر بے ہاتھ ملائے اس طرح نکل گئے کہ کسی نے دیکھا بھی نہیں۔

اس کے بعد ترک موالات کی تحریک اٹھی، ۱۹۲۰ء کے دسمبر میں ناگپور میں کانگریس کا اجلاس تھا، یہی وہ اجلاس ہے جس میں کانگریس نے ترکِ موالات کی تحریک منظور کی۔ اس میں حسرت مرحوم اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ موجود تھے۔

اب ۱۹۲۱ء کا سال آیا، جب گاندھی جی کانگریس پر چھائے تھے اور ادھر خلافت کے لیڈر محمد علی، شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر کچلو، ظفر علی خاں، تصدق شروانی، ڈاکٹر محمود، مولانا ابوالکلام، حسرت موہانی وغیرہ تھے، ترک موالات کا زور تھا، اخیر دسمبر ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نے ہندوستان کے سوراج ملنے کی آخری تاریخ مقرر کی تھی، احمد آباد میں کانگریس کا یہ تاریخی جلسہ تھا، محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام نظر بند تھے، باقی حضرات شریک تھے، ڈاکٹر انصاری اور سید محمود کے ساتھ اجلاس میں میں بھی تھا، اجلاس کے پنڈال سے باہر مسلمانوں کی قیام گاہ کے سامنے ایک شامیانہ میں مغرب کے بعد خاص مسلمانوں کا جلسہ تھا، حکیم صاحب وغیرہ موجود تھے، گاندھی جی خاص طور سے مسلمانوں سے کچھ کہنے کے لئے آئے ہوئے تھے، اتنے میں دیکھا کہ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی سے گھبرائے ہوئے بھاگتے ہوئے دو والنٹیر آئے اور گاندھی جی سے نہایت اضطراب سے کہا "جلدی چلئے، سبجکٹ کمیٹی میں حسرت موہانی نے ہندوستان کے استقلال (انڈپنڈنس) کی تجویز پیش کر دی اور کسی طرح واپس نہیں لے رہے ہیں"۔ فضا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی غیبی گولہ آکر پڑا ہے، چنانچہ گاندھی جی وغیرہ بھی گھبرائے ہوئے جلسہ سے اٹھ کر سبجکٹ کمیٹی میں چلے گئے، مگر حسرت ع "یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اُتار دے" حسرت بدستور اپنی بات پر جمے رہے اور نوٹس دیا کہ وہ اس کو کھلے اجلاس میں پیش کریں گے، چنانچہ وہ وقت آیا جب کھلے اجلاس میں حسرت نے ہندوستان میں استقلال کی تجویز پیش کی اور آنکھوں نے دیکھا کہ ہزاروں کے مجمع میں ایک آواز بھی اس کی تائید

میں نہیں اٹھی، پھر نیرنگِ قدرت کا تماشہ دیکھئے کہ اس کے آٹھ برس کے بعد لاہور اجلاس کانگریس میں ۱۹۲۹ء میں پنڈت جواہر لال نے یہی رزولیوشن پیش کیا اور کانگریس نے اسکا خیر مقدم کیا، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی خود مختاری کا پہلا اعلان حسرت موہانی کی زبان سے ہوا۔

یہ بات یوں یاد رہی کہ واپسی میں ہجوم اتنا تھا کہ ریل کا سفر دشوار معلوم ہوتا تھا، حسرت صاحب نے ہمت دلائی کہ تم میرے ساتھ چلو، چنانچہ اسٹیشن پہنچا، تو دیکھا کہ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبہ میں حسرت مع بیگم صاحبہ کے بیٹھے ہیں اور اس میں اتنا ہجوم ہے کہ سر کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا، کسی طرح سوار ہوا تو دیکھا کہ ایک مرگ چھالے پر حسرت صاحب متمکن ہیں، مٹی کا لوٹا اور مٹی کے برتن ساتھ ہیں، اسی میں کھانا پینا ہے، ہجوم کی کوئی پروا نہیں ہے، دوسری طرف دیکھا کہ پنڈت موتی لال کا سامان فرسٹ کلاس کے ڈبہ میں لگ رہا ہے اور وہ آرام سے اُس میں سوار ہو رہے ہیں، اُس وقت میری زبان سے یہ فقرہ نکلا کہ یہ سیاسی جھگڑوں کا سفر دو ہی آدمیوں کے لئے موزوں ہے، حسرت جیسے بے نوا یا موتی لال جیسے باسر و سامان کے لئے۔ اس کے بعد واقعاً مجھے کانگریس کے کسی اجلاس میں شرکت کا موقع نہ مل سکا۔

اس کے بعد وہ گاندھی جی کی کانگریس سے بھی علیحدہ ہوتے گئے، حسرت مرحوم نے مجھ سے ایک دفعہ کہا تھا کہ گاندھی جی جینی فلسفی کی طرح ہر کلام میں دو متضاد پہلو رکھتے ہیں اور بیک وقت دونوں کو حق سمجھتے ہیں۔

کمیونزم اور بالشوزم کے ظہور کے بعد اقتصادی امور میں اُن کا میلان اسکی طرف بھی ہوگیا تھا اور اپنے کو مسلمان کمیونسٹ کہتے تھے، انکی عقیدت اس باب میں یہاں تک تھی کہ تقسیم سے چند سال پہلے وہ مسلم لیگ کے کسی وفد کے ساتھ اعظم گڑھ آئے تھے تو دارالمصنفین بھی تشریف لائے، دوران گفتگو میں ایک تازہ سیاسی غزل سنائی جس کا قافیہ سویّت تھا اور وثوق کیساتھ فرمایا کہ روسی لفظ سوویٹ حقیقت میں عربی لفظ سویّت ہے جس کے معنی برابری کے ہیں۔

کانگریس سے ہٹنے کے بعد ایک اور سیاسی پارٹی مولانا آزاد سُبحانی صاحب کیساتھ مل کر قائم کی تھی، مگر وہ چل نہ سکی، کانگریس اور مسلم لیگ کے متفقہ الیکشن کے بعد جب مشترکہ لیگ و کانگریس وزارت بنانے کا اصول کانگریس نے تسلیم نہیں کیا اور مسلم لیگ نے جوش وخروش کے ساتھ اپنی زندگی کا ایک نیا دور شروع کیا اور ایک نئے مقصدِ حیات کی طرح ڈالی توحسرت موہانی مرحوم نے مسلم لیگ میں بیش از بیش شرکت کی، یہاں تک کہ وہ کانگریس سے بالکل علیحدہ ہو کر خالص لیگی ہو گئے اور اُن کی کوششوں میں شریک ہو گئے۔ جو مسلم لیگ پاکستان کے حصول کے لئے کر رہی تھی، وہ اس کی مجلس عاملہ کے ارکان خاص میں تھے۔ لیکن یہاں بھی ان کی شان نرالی تھی۔ قائد اعظم مرحوم کسی اختلاف کو کم برداشت کر سکتے تھے، مگر ایک حسرت موہانی کی ذات تھی، جو اپنے خیال میں جس کو حق سمجھتی تھی، اُس کے اظہار میں کسی سے مرعوب نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ وہی ہیں جنہوں نے مسلم لیگ میں بھی استقلال اور خود مختاری کا رزولیوشن پیش کیا۔

پاکستان بننے کے بعد انہوں نے ہندوستان ہی میں قیام پسند کیا۔ اس کے پارلیمنٹ کے ممبر رہے اور تنہا وہ تھے جو پورے پارلیمنٹ کی مخالفت کے باوجود اپنی رائے کے اظہار میں بیباک تھے، نہ کسی کے غصہ پر دھیان اور نہ کسی کی ہنسی کی پروا، نہ کسی کی تحقیر پر افسوس، نہ کسی کی تعریف کا جواب۔ ایک دُھن تھی جو اُن کو اپنی منزل مقصود کی طرف لئے چلی جا رہی تھی۔

حسرت خواہ کسی قدر بے ضرر ہوں مگر انگریزی عہد میں وہ بڑے خطرناک سمجھے جاتے تھے، وہ کہیں جاتیں ایک خفیہ پولیس کا آدمی اُن کے ساتھ رہتا تھا۔ اسٹیشنوں پر اُن کی آمد کی اطلاع کر دی جاتی تھی، مگر وہ بھی عجب دلچسپ آدمی تھے، ہمیشہ پولیس کو اس میں دھوکہ دیا۔ وہ کہتے کہ میں ٹکٹ منزل مقصود سے آگے پیچھے کا لے لیتا ہوں اور بیچ میں اتر جاتا ہوں، پولیس حیران ہوتی ہے، کبھی یہ کرتے کہ اپنے بجائے

دوسرے کو بھیج کر ٹکٹ منگوا لیتے اور چلے جاتے، پتہ بھی نہ چلتا، پھر یہ ہونے لگا کہ درمیان راہ میں اُن کے ٹکٹ کا نمبر چیک ہوتا، ایک دفعہ یہ ہوا کہ ٹکٹ چیکر مسافروں کے ٹکٹ دیکھنے لگا، حسرت تاڑ گئے، وہ چکر کاٹ کر دوسری طرف چلے گئے، ٹکٹ چیکر کو جب خوب حیران کر چکے تو سامنے آکر فرمایا کیا تم یہ نمبر ڈھونڈ رہے ہو، اس سے زیادہ لطیفہ یہ ہوتا تھا کہ وہ راہ میں کسی سے اپنا ٹکٹ بدل لیتے تھے، حسرت تو اسٹیشن سے اُتر کر چلتے ہوئے اور دوسرا ناکردہ گناہ حسرت بنا پولیس کو احمق بنا رہا ہے۔

ایک دفعہ میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا، خدا جانے کس جلسہ کی تقریب سے میں اور وہ دونوں دلی میں تھے، مغرب کے بعد حسرت نے کہا، چلو کامریڈ کے دفتر میں کوچہ چیلاں چلیں، راستہ نہ انہیں یاد تھا نہ مجھے، فرمایا چلو ایک رہبر ساتھ ہے اس سے پوچھیں، انہوں نے ایک صاحب کو پکارا کہ بھئی! چھپ چھپ کر کیوں چل رہے ہو ساتھ چلو، ذرا کامریڈ کا دفتر بتاؤ، اب وہ صاحب سامنے آئے، تو میں نے دیکھا کہ کسی عربی مدرسہ کے طالب علم کے لباس میں ایک صاحب ہیں، وہ بے تکلف آگے آگے چلے اور ہم لوگ پیچھے، حسرت نے کہا یہ ہمارے ہمزاد ہیں، یہ یا ان کے بھائی ہمیشہ ہمارے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور ایسے مشکل وقتوں میں کام آتے ہیں۔

اب تک جو گفتگو کا سلسلہ چلا آیا، وہ سارا سیاسی تھا، حسرت پکے دیندار مسلمان تھے، وہ کانگریسی بھی رہے اور اپنے کو سوشیالسٹ بھی کہتے تھے، مگر بچپن سے موت تک وہ سچے اور پکے دیندار مسلمان رہے، وہ نہ صرف مسلمان بلکہ صوفی مسلمان تھے اور صوفیوں میں بھی وہ صوفی تھے جن سے بزرگوں کا کوئی مزار اور کوئی عرس اور کوئی قوالی کی مجلس چھوٹتی نہ تھی، خصوصاً دہلی کی مجلسیں۔

حجاز پر ۱۹۲۰ء میں ابن سعود کے قبضہ کے بعد سے چونکہ وہ وہابیت سے ناراض تھے اس لئے وہ اس قبضہ سے خفا تھے، لیکن بایں ہمہ انہوں نے حرمین کی زیارت

کی توفیق اسی عہد میں پائی، اس حج کے بعد وہابیوں سے خفگی کے باوجود وہ کچھ ایسے اس سرزمین اقدس کے دلدادہ ہوئے، کہ چند سال تک متواتر ہر سال حج کو جاتے رہے اور حکومت کے مہمان ہوتے رہے۔

حسرت جیسی متضاد طبیعت کا انسان شاید ہی منصۂ شہود پر آیا ہو، سیاسیات اور قید و بند کے خارزار کے ساتھ شعر و سخن کی چمن بندی اور آبیاری بہت کم جمع ہو سکتی تھی، لیکن حسرت کے مزاج میں دونوں چیزیں جمع تھیں اور خود حسرت کو بھی اس اجتماع ضدین پر تعجب تھا، جیسا کہ خود ہی کی ایک غزل میں انہوں نے کہا ؎

ہے مشق سخن جاری چکّی کی مصیبت بھی
کیا طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت کو نسیم دہلوی اور تسلیم لکھنوی کے سلسلہ سے شعر و سخن کی سجادگی ملی تھی۔ غزل کو لکھنؤ کے تصنع اور غالب کی مشکل گوئی کے کوچہ سے سادگی اور آسان گوئی اور حقیقت رسی کی منزل تک پھیر کر لانا شاعری میں حسرت کا تجدیدی کارنامہ ہے۔

حسرت کا مکمل دیوان ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے، متفرق دواوین چھوٹے چھوٹے دیوانوں کی صورت میں اکثر چھپتے رہے اور بیچاری بیگم حسرت جب تک جیتی رہیں شوہر کی قید کی صورت میں اکثر وہ ان کے دواوین مختلف ترتیبوں سے چھپوایا کرتی تھیں، ضرورت ہے کہ حسرت کا ایک مکمل دیوان صحت و اہتمام کیساتھ یادگار کے طور پر چھپوایا جائے اور ان کی دوسری سیاسی اور ادبی تحریروں کو جمع کیا جائے، حسرت کی ادبی تصنیفات میں اُن کی شرح دیوان غالب بہترین چیز ہے، اسی طرح متروکات اور معائب شعر پر ان کے رسائل اور مقالات یادگار چیزیں ہیں۔

حسرت کی زندگی کا تذکرہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی وفادار شریف اور بہادر بیگم مرحومہ کے تذکرہ کے بغیر تمام نہیں ہو سکتا، آج سے پینتیس برس پہلے وہ چہرہ کھول کر

کر نہایت سادہ لیکن پردہ پوش لباس میں باہر آتی تھیں اور کسی کی پروا نہیں کرتی تھیں، شوہر کی ہر قید و بند کے بعد جب کوئی اُن کا مونس و مددگار نہیں ہوتا تھا، ہر قسم کی مشکل کو بہادری اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے میں شاید ہی کوئی مسلمان عورت اُن کے مقابلہ کی نکل سکے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

سید فضل الحسن حسرت موہانی کی زندگی کے واقعات پر نظر کر کے اُن کی شان حضرت ابوذرؓ صحابی کی نظر آتی ہے، جن کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابوذر سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی" سچ یہ ہے کہ اس عہدِ پُر فریب میں حسرت سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی، اسی طرح حضرت ابوذر کے بعد یہ قول نبوی بھی اُن پر صادق آتا ہے کہ حضرت ابوذر کی حق گوئی نے ان کو زندگی میں تنہا چھوڑ دیا، اُس کا کوئی ساتھی نہیں رہا اور اس لئے اس فقرہ کا مورد بھی حسرت کی ذات تھی۔ عَاشَ فَرِيْدًا مَاتَ حَمِيْدًا (تنہا جیا اور ستودہ مرا)

حسرت کا دماغ خدا جانے کتنے رُوپوں میں جلوہ گر ہوا، مگر اس کا دل بزرگوں کی عقیدت کی خاک سے بنا تھا، مرتے دم پیر کے آستانہ پر جان دی اور پیر ہی کی ابدی خواب گاہ میں آرام کیا، مولانا انوار صاحب کے باغ میں جہاں فرنگی محل کے خدا جانے کتنے خزانے دفن ہیں، حسرت بھی اپنی تمناؤں کے خزانہ کے ساتھ دفن ہوئے۔

حسرت رخصت! تو تنہا آیا تھا، تنہا رہا، تنہا گیا، البتہ تیری نیکی، شرافت تیرا اخلاص اور تیرے حُسنِ عقیدت کے اعمال تیرے ساتھ ہیں اور وہی تیرے رفیق آخرت ہیں۔ بارِ الٰہا اس کی حق گوئی کی بے کسی کی شرم رکھ لیجئے اور اس کو اپنی رفاقت سے نوازیے، وَاَنْتَ الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی۔

۱۷ رمضان المبارک ۱۳۷۰ھ

ایک شریف النفس فاضل دوست کی دائمی مفارقت

پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز (پونہ)

ناسک (بمبئی) کے ایک خط سے جو مرحوم کے چھوٹے بھائی نے مجھے لکھا تھا یہ معلوم کر کے بڑا تاسف ہوا کہ میرے چالیس برس کے دوست پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز نے پونہ میں اپنے مکان کاشانۂ حق میں ۱۰ دسمبر ۱۹۵۲ء کو ساڑھے نو بجے انتقال فرمایا، اس کے بعد مرحوم کے بڑے صاحبزادہ ڈاکٹر شیخ عبدالحق ایم ۔اے پی، ایچ ،ڈی پروفیسر اُردو فارسی (بمبئی) کی اطلاع سے اور بہت سی باتیں معلوم ہوئیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ مرحوم کو بڑھاپے اور شیخوخت کے ضعف کے سوا کوئی خاص مرض نہ تھا، بصارت سے معذور ہو چکے تھے، ایک ہفتہ سے ضعف بڑھتا جاتا تھا، ڈاکٹروں کے معائنہ سے قلب اور اعضائے رئیسہ توانا پائے گئے، حواس آخر تک بجا تھے، سوا نو بجے خود آنکھیں بند کرلیں لب ہل رہے تھے، غالباً کلمہ پڑھ رہے تھے، ۱۵ منٹ کے بعد یعنی ساڑھے نو بجے صبح کو اس دنیائے فانی سے سفر اختیار کیا۔

۱۹ جولائی ۱۸۷۹ء پیدائش کی تاریخ تھی، تہتر برس کی عمر پائی، مرحوم کا خاندان دراصل یوپی کا باشندہ تھا، غدر کے ایام میں بمبئی کی طرف نکل گیا، مرحوم کے والد شیخ سرفراز ڈاکٹر تھے؛ انہوں نے ناسک کو اپنا وطن بنایا لیکن مرحوم کی عمر کا بڑا حصہ پونہ اور بمبئی میں گزرا ۱۹۰۲ء میں بمبئی یونیورسٹی سے ایم ۔اے پاس کیا اور غالباً اُن کا خاص موضوع فارسی تھا، اس زمانہ میں ایک شریف ایرانی فاضل پروفیسر مرزا حیرت بمبئی یونیورسٹی میں فارسی کے مسند نشین صدر تھے، اُن کا غیر معمولی فضل و کمال تمام بمبئی میں مسلّم تھا، مرحوم شیخ عبدالقادر

کو فارسی کا ذوق انہی کی صحبت سے حاصل ہوا، چنانچہ مرزا حیرت کی انہوں نے مختصر سوانح عمری بھی لکھی ہے اور مجلس میں اکثر اُن کے فضائل اور اخلاق اور حالات کا ذکر کیا کرتے تھے۔

ایم اے ہونے کے بعد وہ فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے، اس زمانہ میں سندھ کا صوبہ بمبئی کے احاطہ سے ملحق تھا، اس لئے اُن کا تقرر پہلے سندھ میں ہوا اور اس طرح زبانوں کے شائق کے لئے ایک نئی زبان سندھی کا دروازہ کھل گیا اور وہ اس سے کچھ ہی دنوں میں آشنا ہوگئے، یہاں اُن کا قیام مختصر رہا، یہاں سے وہ جلد بمبئی منتقل کر دیئے گئے جہاں یکے بادیگرے الفنسٹن کالج بمبئی اور دکن کالج پونہ میں السنۂ شرقیہ کے پروفیسر رہے ۱۹۲۳ء میں ریٹائرڈ ہو کر انہوں نے اپنی بیوی اور تین صاحبزادوں کے ساتھ حج کیا، واپسی کے بعد بدستور اپنے مکان موسوم کاشانۂ حق پونہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔

مولانا شبلی مرحوم سے اُن کی ملاقات ۱۹۰۱ء میں بمبئی میں ہوئی، اس وقت مولانا شعر العجم کی تکمیل میں مصروف تھے، دونوں میں تعلقات کی وابستگی کا رستہ یہی فارسی شعر وادب کا ذوق تھا، وہ فارسی کے یورپین مستشرقین کی تحقیقات سے مولانا کو مطلع کیا کرتے تھے اور بعض مضامین کے ترجمے بھیجا کرتے تھے، مکاتیب شبلی میں مرحوم کے نام مولانا کے جو خطوط ہیں، اُن سے ان تعلقات کی پوری حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔

راقم سے مرحوم کی واقفیت کا واسطہ بھی مولانا ہی تھے، ۱۹۱۳ء میں جب میں الہلال کلکتہ سے قطع تعلق کر کے واپس آیا تو ایک ماہوار رسالہ کا خیال دل میں تھا۔ جو الندوہ کا جانشین ہوا، مولانا نے اس خیال کو پسند فرمایا اور مجھے لکھنؤ بلا لیا، ابھی اس اسکیم پر غور ہی ہو رہا تھا کہ ایک نئی صورت پیش آگئی جس نے زندگی کا رُخ بدل دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ایک عجیب معاملہ اس بندۂ بے استحقاق کے ساتھ پوری زندگی

میں جاری رہا ہے، کوئی خدمت ہو یا کوئی علمی و قومی منصب ہو، میری طلب اور سعی و کوشش کے بغیر مجھے عنایت ہوا، چنانچہ جہاں گیا، بحمداللہ مطلوب بن گیا، طالب بن کر نہیں، چنانچہ ایسا ہی اس وقت پیش آیا، انگریزی عہد میں کسی طلب و درخواست کے بغیر کسی سرکاری نوکری پانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، مگر میرے ساتھ یہ بھی ہوا، میں انہی دنوں لکھنؤ میں مقیم تھا کہ مجھے بمبئی گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم کا سرکاری لفافہ موصول ہوا کہ تم کو دکن کالج پونہ میں السنۂ مشرقیہ کا اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیا گیا میں سمجھا کہ میرے پتہ پر یہ غلط مراسلہ آ گیا ہے، کیونکہ میں نے تو اس کی درخواست بھی نہیں دی تھی، میں اسی حیص بیص میں تھا کہ اس مراسلہ کو کیا کروں کہ شام کی حاضری میں مولانا سے اس واقعہ کو بیان کیا، فرمایا کہ مراسلہ آ گیا اچھا ہوا، میں نے ہی تحریک کی تھی، پروفیسر عبدالقادر صاحب کو شکریہ کا خط لکھو اور پونہ روانہ ہو جاؤ، میں نے کچھ معذرت کرنی چاہی، مگر اُن کی خوشی اسی میں پائی اور شیخ صاحب کے پاس پونہ روانہ ہو گیا اور ڈھائی تین سال کے قریب اُن کے ساتھ رہا۔ انہوں نے اپنے بنگلہ کے پاس ہی ایک چھوٹی سی بنگلیا میں میرے قیام کا انتظام کیا اور اپنے ہی پاس مہمان رکھا اور اپنے ہی ساتھ مجھے کالج لانے اور لے جانے لگے، اس واقعہ کے ڈیڑھ دو سال کے بعد مولانا نے نومبر ۱۹۱۴ء میں انتقال فرمایا اور مجھے سب کام چھوڑ کر سیرت کی تکمیل کا اشارہ ہوا، چنانچہ دارالمصنفین کے قیام کے بعد ایک سال کے اندر مجھے پونہ چھوڑنا پڑا اور زندگی نے ایک نئے رخ پر پلٹا کھایا۔

شیخ صاحب کے ساتھ یہ چند سال اس طرح گزرے کہ روز و شب میں ضروری اوقات کے علاوہ ہمیشہ یک جائی رہتی اور تجربہ نے بتایا کہ شیخ صاحب جیسا شریف انسان دنیا نے کم پیدا کیا، وہ ایک مرنجاں مرنج طبیعت رکھتے تھے، دوستوں کی ہر ضرورت میں کام آتے تھے، نہایت صاف دل اور بے تکلف تھے، پونہ سے چلے آنے کے بعد

بانکی پور کی خدا بخش خاں لائبریری کے دیکھنے کے بہانہ وہ میرے پاس پٹنہ اور پھر اعظم گڑھ دارالمصنفین آئے اور چند روز یہاں بہت خوشی اور دلچسپی کے ساتھ رہے، وہ بمبئی کے اضلاع کے علاوہ ہندوستان کے کسی دوسرے شہر یا صوبہ میں شاید کبھی گئے ہوں، اس لئے یوپی کے موسم اور آب و ہوا اور اسلامی تمدن وغیرہ کو دیکھ کر انہیں بڑی دلچسپی ہوئی۔

میرے قیام پونہ کی بڑی یادگار ارض القرآن کی تصنیف ہے، اگرچہ اس کا آغاز کلکتہ ہی میں کیا جا چکا تھا، مگر اس کی تکمیل اسی زمانہ میں ہوئی اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر شیخ صاحب کی رفاقت نہ ہوتی تو اس کتاب کو کبھی اس طرح نہ لکھ سکتا، پونہ میں ہونے کی وجہ سے جہاں اسرائیلی یہودیوں کی سکونت ہے، مجھے عبرانی سے آشنا ہونے کی فرصت ہاتھ آئی اور شیخ صاحب کے ذریعہ سے بمبئی کے کتب خانوں سے کتابوں اور پرانے علمی رسالوں کے ملنے کے مواقع ہاتھ آئے اور عجب نہیں کہ اسی کام کے لئے مشیت الٰہی نے پونہ کا قیام میرے لئے مقدر کیا تھا۔

شیخ صاحب مرحوم کو زبانوں کے سیکھنے کا عجب ملکہ تھا، وہ مہاراشٹر میں رہنے کے باوجود اُردو مادری زبان کی طرح جانتے تھے اور لکھتے اور بولتے تھے، جدید اور قدیم فارسی دونوں پر قدرت حاصل تھی، عربی زبان وہ اس وقت نہیں جانتے تھے اور میرے بلوانے سے اُن کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ عربی زبان سیکھیں، چنانچہ میرے پہنچنے پر وہ باقاعدہ طالب علموں کی طرح کچھ دنوں عربی صرف و نحو پڑھتے رہے، اس کے بعد بمبئی کے قیام میں عربوں سے عربی بولنے کی مشق کی اور خاصی عربی بولنے اور سمجھنے لگے، مرہٹی زبان مثل ایک برہمن مرہٹہ کے وہ جانتے تھے اور اس بارہ میں خود برہمن مرہٹے اور گورنمنٹ ان کی قابلیت کو تسلیم کرتی تھی اور مرہٹی زبانوں کی کمیٹیوں میں اُن کو ممبر بناتی تھی، بمبئی یونیورسٹی میں مرہٹی ٹکسٹ بک کمیٹی کے ممبر رہے، مہاراشٹر یونیورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی کا ممبر بھی حکومت نے اُن کو بنایا، اس کمیٹی کا خیال تھا کہ مہاراشٹر کے مسلمانوں کی زبان

مرہٹی ہے، مگر شیخ صاحب نے تاریخی دلائل اور شخصی شہادتوں سے ثابت کر دیا کہ اُن کی زبان دکھنی اردو ہے اور کمیٹی کی رپورٹ کے ساتھ ایک طویل اختلافی نوٹ لکھا، جس کو حکومت نے رپورٹ کے ساتھ شائع کیا۔

بمبئی یونیورسٹی میں السنۂ مشرقیہ کے دائرہ میں شیخ صاحب کی حیثیت ممتاز تھی، وہ اُس کے نصاب، امتحان اور کمیٹیوں میں ہمیشہ ممبر ہوتے رہے، ۱۹۱۹ء میں وہ بمبئی یونیورسٹی کے فیلو اور ۱۹۲۰ء میں انڈین ایجوکیشنل سروس میں داخل ہوئے، ۱۹۲۴ء میں وہ بمبئی برٹش رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے فیلو اور ۱۹۲۶ء میں بمبئی جی پی یعنی جسٹس آف پیس مقرر ہوئے، اُس کے علاوہ وہ تقریباً چودہ مختلف تعلیمی انجمنوں کے صدر یا ممبر تھے، ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کی ناقدرشناسی سے شمس العلماء کے بجائے خان بہادر بنائے گئے، جس کو انہوں نے اپنے نام کے ساتھ بہت کم استعمال کیا۔

شیخ صاحب مرحوم کا تحقیقاتی مطالعہ بہت وسیع تھا، کتابوں کے شائق تھے، اور اچھا خاصہ مختصر سا کتب خانہ اُن کے پاس جمع تھا، دن رات مطالعہ اور تحقیقات کے سوا ان کا کوئی دوسرا کام نہ تھا، اُن کو شکایت تھی کہ کام کرنے میں نیند آنے لگتی ہے اس کے لئے یہ تدبیر کی کہ میز اونچی کر کے کھڑے ہو کر کام کرنا شروع کیا، گو انہیں لکھنے کی فرصت کم ملتی تھی، بایں ہمہ انہوں نے اپنی کچھ تحریری یادگاریں بھی چھوڑیں، جو زیادہ تر انگریزی اور کچھ اُردو میں ہیں، پروفیسر مرزا حیرت کے سوانح، قصائد، قاآنی اور انگریزی میں تاریخ طبری کے کچھ حصے کتابی شکل میں شائع کئے، مطبوعہ کتابوں کی تصحیح اور تحشیہ جیسے غیر دلچسپ کام سے بھی انہیں دلچسپی تھی، چنانچہ اپنے مطالعہ اور کورس کی کتابوں کی یہ خدمت اکثر انجام دیا کرتے تھے، اسی سلسلہ میں فارسی شعراء میں سے انوری، ظہیر فاریابی، قاآنی اور خاقانی کے دواوین اور تحفۃ الابرار جامی کی پوری تصحیح کی اور حاشیے لکھے، وقائع نعمت خان عالی کی نہایت دقتِ نظر سے تصحیح کی، متن درست کیا، تاریخی واقعات اور ادبی نکات پر نوٹ لکھے، جہاں کشائے نادری اور مثنوی معنوی پر حواشی

چڑھائے، پروفیسر براؤن کی مشہور تصنیف تاریخ ادبیات ایران پر ناقدانہ انداز سے حاشیے لکھے، لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے کوئی چیز شائع نہیں ہوئی اور یہ سب مسودے ان کے کتب خانہ میں سربستہ راز کی طرح امانت ہیں، شاید اُن کے بڑے صاحبزادہ ڈاکٹر عبدالحق ادھر توجہ کریں۔

اُن کی جو کتاب شائع ہوئی ہے وہ بمبئی یونیورسٹی کے فارسی، اردو اور عربی مخطوطات کی توضیحی فہرست ہے جو کئی سو صفحوں میں ہے اور جسکو یونیورسٹی نے شائع کیا ہے، یہ فہرست مشرق و مغرب کے اصول تنقید اور طرز تحقیق کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے اور مستشرقین کی تحقیقات پر جابجا تنقیدیں کی گئی ہیں، ایک بسیط مقالہ انگریزی میں فارسی یائے معروف و یائے مجہول پر لکھا، جو بمبئی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں چھپا اور اس کا خلاصہ ترجمہ معارف میں طبع ہوا۔

شیخ صاحب کو مولانا شبلی مرحوم سے عقیدتمندانہ شیفتگی اور ہم خواجہ تاشوں سے مخلصانہ محبت تھی، جس کو زمانہ کی قدامت اور مکانوں کی مسافت بھی کم نہ کر سکی، جب میرا کراچی آنا ہوا تو ایک خط میں حسب ذیل شعر لکھ کر بھیجا۔

وفا آموختی از ما بکار دیگراں کردی

ربودی گوہرے از ما نثار دیگراں کردی

افسوس کہ علم و فضیلت اور اخلاق و اخلاص کا یہ مجسمہ ہماری نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے پوشیدہ ہو گیا، وہ پونہ کے ہندو اور مسلمانوں میں یکساں ہر دلعزیز تھے، اس لئے اُن کی وفات پر سب نے سوگ کیا اور اُن کے جنازہ کی مشایعت میں سب نے شرکت کی اور ایتین قبرستان میں اپنی اہلیہ مرحومہ کی قبر کے پہلو میں دفن ہوئے، مگر مرحوم کا اصلی مزار اُن کے احباب کے دل ہیں جس میں اُن کی یاد ہمیشہ بسی رہے گی۔

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو

در سینہ ہائے مردم عارف مزار ما

فقیہ الاُمّۃ مولانا کفایت اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ

ولادت ۱۲۹۲ھ ، وفات ۱۳۷۲ھ

عیسوی سال ۱۹۵۲ء کے ختم کو ایک گھنٹہ ۳۵ منٹ باقی تھے، کہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو دس بجکر ۲۵ منٹ پر حضرت مفتی مولانا کفایت اللہ صاحب دہلوی نے اپنے گھر واقع کوچہ چیلاں دہلی میں وفات پائی، یہ خبر یکم جنوری ۱۹۵۳ء کی صبح کو کراچی پہنچی اور لوگوں کو اس حادثۂ فاجعہ کے علم سے بڑا صدمہ ہوا، مختلف علمار نے اپنے تاثرات اخباروں میں چھپوائے اور جمعیۃ علمائے اسلام کی مجلس عاملہ اور ۲۲ علمار کی دستوری مجلس نے جس میں سارے پاکستان کے منتخب علمار موجود تھے، اس حادثہ پر غم کا اظہار کیا اور دعائے خیر کی۔

مرحوم کے نام سے واقفیت مجھے ۱۹۱۲ء میں ہوئی، جب ندوۃ العلمار کا اصلاحی اجلاس حکیم اجمل خاں صاحبؒ کی طلب پر دہلی میں منعقد ہوا تھا اور ارکان کی باہمی مخالفت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ مولانا شبلی کی تکفیر کا فتوےٰ دہلی میں مرتب ہوا، جس پر مفتی صاحب مرحوم کے دستخط تھے، اُس کے بعد یہ نام ذہن سے اتر گیا اور یکا یک ۱۹۱۹ء میں جب مسلم لیگ کا استقبالیہ خطبہ ڈاکٹر انصاری نے پڑھا اور اس میں خلافت اور جزیرۃ العرب سے متعلق فقہی اور لغوی بحث پیش کی تو خیال ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کو یہ مواد کس نے پیش کیا، اس سلسلہ میں مفتی صاحب کا نام پھر سُنا اور اتفاق وقت دیکھیے کہ ایک ہی سال کے بعد ۱۹۲۰ء میں مجلس خلافت کی تحریک کے سلسلہ میں حکیم صاحب مرحوم کے دولت کدہ پر ایک جلسہ تھا، جس میں مفتی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی، سب سے اول

اُن کی ظاہری صورت اور متواضع لباس کی بنا پر قیافہ نے اُن کے فضل و کمال سے حُسن ظن پیدا ہونے نہ دیا، مگر تھوڑی بات چیت سے پتہ چل گیا کہ اس غلاف کے اندر تلوار کیسی ہے۔ اس کے بعد خلافت اور جمعیۃ العلماء کے اجلاسوں میں بار بار ملاقات اور خلط ملط اُن کے علمی، ذہنی اور اخلاقی علوئے شان کی نشاندہی کرتا چلا گیا، پھر تو یہ حال ہوا۔

یزیدك وجهه حسنا　　　اذا ما زدته نظراً

ممدوح کا چہرہ حُسن میں اتنا ہی ترقی کرتا چلا جاتا ہے جتنا تم اس کو دیکھتے جاؤ۔

کئی دفعہ مرحوم کے ساتھ یکجائی سفر کا اتفاق ہوا، جس میں سب سے طویل سفر ۱۹۲۶ء میں حجاز کی موتمر اسلامی میں شرکت اور حج کی غرض سے کیا گیا تھا، ایک جہاز سے ہم سب کا جانا اور آنا اور مکہ معظمہ میں قریب قریب قیام اور مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک اونٹوں پر ایک ہی قافلہ میں روانگی اور عرفات میں ایک ہی اونٹ پر مسجد نمرہ تک سواری نصیب ہوئی۔

دوسرا موقع یہ آیا کہ مفتی صاحب کے صاحبزادوں کی بات میں نے اعظم گڑھ میں ایک خاندان میں چھیڑی اور مفتی صاحب مع حافظ احمد سعید صاحب اعظم گڑھ میں دارالمصنفین آکر میرے مہمان ہوئے اور چند روز قیام فرمایا، وہ بات پکی نہیں ہوئی لیکن اس اثناء میں ہماری دوستی پکی ہوگئی، آخری ہمراہی و ہمسفری ۱۹۴۱ء میں دہلی سے بھوپال تک ہوئی، جہاں ہم دونوں ریاست کی دعوت پر اس کے نکاح و طلاق کے ضابطوں پر نظر ثانی کرنے کو بلائے گئے تھے اور ساتھ ہی سرکاری مہمان خانہ کے ایک ہی کمرہ میں ٹھہرے تھے۔

وطن اور خاندان: مرحوم کا وطن شاہجہاں پور تھا، مرحوم کا وجود اسلام کے عظیم الشان معاشرتی مساوات کا علمی ثبوت تھا، مولوی حافظ احمد سعید صاحب نے جو اُن کے سب سے زیادہ قریب رہنے والے اور اُن کے دست راست تھے مجھے بتایا کہ

مرحوم کے مورثِ اعلیٰ یمن سے آئے تھے، روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ یمن سے سوداگروں کا ایک قافلہ بادبانی کشتی میں بیٹھ کر ہندوستان کی جانب روانہ ہوا۔ لیکن ہندوستان کے ساحل پر پہنچنے سے پہلے وہ ایک طوفان میں پھنس کر تباہ ہوگیا۔ اس قافلہ میں شیخ جمال نام ایک کم سن لڑکا بھی سوار تھا، وہ کشتی کے ایک تختہ پر بیٹھ کر کنارہ لگ گیا، وہاں بھوپال کا ایک شخص اس کو اپنے ساتھ بھوپال لے آیا اور اس کو اپنی تربیت میں رکھ کر اپنے ہی خاندان کی ایک لڑکی سے اس کی شادی کردی، یہی شیخ جمال مفتی صاحب مرحوم کے مورثِ اعلیٰ تھے، بھوپال سے یہ خاندان شاہجہان پور کو منتقل ہوا، اور محلہ سن زئی میں سکونت اختیار کی اور گزر بسر کے لئے نائی کا پیشہ اختیار کیا، اور یہ اسلام کی علمی تاریخ کے لئے کوئی نیا واقعہ نہیں، اسلام کی تاریخ میں کتنے علمائے حدیث وفقہ اور مسند نشینانِ فضل وکمال جوتا بنانے والے، کپڑا بُننے والے تیل بیچنے والے جوتا گانٹھنے والے اور دوسرے معمولی پیشہ کرنے والے بزرگ تھے اور آج تک وہ خصاف، نساج، حلاج، دباغ، حلوائی، حصیری، حریری کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور درس وارشاد کی مسند پر قریش وسادات کے پہلو بہ پہلو بٹھائے جاتے ہیں اور ساری دنیائے اسلام اُن کے آگے اپنے احترام کا سر جھکاتی ہے، یہ کوئی نہ کہے کہ یہ اسلام کی گزشتہ روایات کا سماعی واقعہ ہے، مرحوم مفتی صاحب کا وجود اسلام کی معاشرتی مساوات کا آج بھی ناقابلِ تردید واقعہ ہے، انہوں نے مسلسل بیس برس تک سارے علمائے ہند کے رئیس کی حیثیت سے جمعیۃ العلماء کی صدارت کی اور کسی نے اُن کے اس استحقاق سے سرتابی نہیں کی اور وہ بڑے سے بڑا احترام جو ایک انسان دوسرے انسان کو دے سکتا ہے وہ تمام عمر مسلمانوں میں اُن کو حاصل رہا اور دنیا نے اُن کو مفتی اعظم ہند کہہ کر پکارا۔

مرحوم کے والد ماجد کا نام شیخ عنایت اللہ تھا اور شیخ جمال یمنی تک اُن کا

سلسلۂ نسب یہ ہے۔

شیخ عنایت اللہ بن فضل اللہ بن خیر اللہ بن عباد اللہ

بھوپال کا شہر امیر دوست محمد کی حکومت میں ۱۱۳۰ھ میں آباد ہوا اس سے ظاہر ہوا کہ شیخ جمال یمنی کی بھوپال میں آمد زیادہ سے زیادہ تیرھویں صدی ہجری کے آغاز کا ہو سکتا ہے، جو انیسویں صدی عیسوی کے مطابق ہے۔

تعلیم و تربیت: مرحوم کے والد گو غریب تھے، مگر ہمتِ عالی رکھتے تھے اور بچے کو عالم دین بنانے کی تمنا دل میں رکھتے تھے، پانچ سال کی عمر میں شہر کے محلہ میں حافظ برکت اللہ صاحب کے مکتب میں داخل ہوئے اور یہیں قرآن مجید ختم کیا، اُردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم محلہ درک زئی میں حافظ نسیم اللہ کے مکتب میں ہوئی، اسی زمانہ میں محلہ خلیل شرقی میں مولوی اعزاز حسن صاحب کا مدرسہ اعزازیہ قائم ہوا تھا مکتبی تعلیم سے فارغ ہو کر اسی مدرسہ میں داخل کئے گئے، یہاں انہوں نے فارسی کی اعلیٰ اور عربی کی ابتدائی کتابیں، حافظ بدھن خان صاحب سے پڑھیں، یہاں کے اساتذہ میں ایک ولایتی افغان عالم مولانا عبید الحق خاں صاحب[1] تھے (جو مولانا فضل اللہ خانصاحب شاہجہانپوری کے جن کو بمبئی اور کراچی کے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں اور جو بالفعل جمعیۃ الفلاح کراچی کے ناظم ہیں، والد بزرگوار تھے) بچپن ہی سے مفتی صاحب مرحوم کی ذہانت و طباعی آشکارا تھی، اُن کے استادان سے محبت کرتے تھے، مولانا عبید الحق صاحب نے اپنے ہونہار شاگرد کی طرف بیش از بیش توجہ کی اور شیخ عنایت اللہ صاحب کو مجبور کر کے ۱۳۱۱ھ میں اُن کو مراد آباد کی شاہی مسجد کے مدرسہ میں بھجوا دیا،

[1] مولانا افغانستان وطن تھا حصول تعلیم کیلئے ہندوستان آئے، مولانا مفتی لطف اللہ صاحب علیگڑھی سے تلمذ تھا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے بیعت کی، ۳۲۰ برس کی عمر میں ۱۳۳۱ھ میں شاہجہاں پور میں وفات پائی ان کے معاصرین اور متعلقین میں خیر شہیر مولانا سیف الرحمان صاحب اور مدرس شہیر مولانا محمد رسول صاحب بھاگلپوری تھے۔ "س"

جہاں انہوں نے وہاں کے مدرسین مولانا عبدالعلی صاحب میرٹھی، مدت اول سے جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے شاگرد تھے اور بعد کو مدرسہ عبدالرب دہلی میں صدر مدرس ہوئے اور مولوی محمد حسن صاحب اور مولوی محمود حسن سہسوانی سے کتابیں پڑھیں۔

مفتی صاحب دو سال کے بعد یہاں سے ۱۳۱۲ھ میں مدرسہ دیوبند چلے گئے اور وہاں کے مدرسین میں مولانا منفعت علی صاحب دیوبندی۔ مولانا حکیم محمد حسن صاحب و حضرت شیخ الہند کے چھوٹے بھائی۔ مولانا غلام رسول صاحب اور مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی سہارنپوری سے اسباق پڑھے اور کتب حدیث کا درس مولانا عبدالعلی صاحب میرٹھی اور حضرت مولانا محمود حسن صاحب سے حاصل کیا۔

صحاح ستہ کے دورہ میں اٹھارہ حضرات شریک تھے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی۔ مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی (حال شیخ الحدیث مدرسہ عبدالرب دہلی)۔ مولوی محمد امین صاحب ایلولوی بانی مدرسہ امینیہ دہلی۔ ۱۳۱۵ھ میں ۲۲ برس کی عمر میں دیوبند سے فراغت ہوئی۔

مولانا عبیدالحق صاحب نے شاہجہانپور میں ۱۳۲۱ھ میں ایک مدرسہ عین العلم قائم کیا تھا۔ مولانا کفایت اللہ صاحب جب فراغت کے بعد وطن واپس آئے۔ شفیق استاد نے ان کو اسی مدرسہ میں جگہ دی اور تقریباً ۵ سال اس میں کام کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں شاہجہاں پور میں قادیانیت کی تحریک پہنچی۔ تو اس کے رد میں ۱۳۲۱ھ میں البرہان نام کا ماہانہ رسالہ جاری کیا۔ مدرسہ عین العلم میں جن اصحاب نے آپ سے پڑھا اُن میں سے حسب ذیل اصحاب کے نام قابل ذکر ہیں: حضرت مولانا اعزاز علی صاحب استاذ الادب والفقہ دیوبند، مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی ایڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ۔

مدرسہ امینیہ دہلی کو جس سے مفتی صاحب کو پچاس برس تعلق رہا۔ اُن کے رفیق درس

مولوی امین الدین صاحب ایلوی نے ۱۳۱۵ھ میں قائم کیا تھا۔ موصوف ایلونہ حافظہ بمبئی کے باشندہ تھے، مگر اپنی علمی وعملی کوششیں دہلی میں خرچ کیں، اس مدرسہ کے سب سے پہلے مدرس حضرت مولانا انورشاہ صاحب کشمیری مقرر ہوئے تھے حضرت نیموی عظیم آبادی کی کتاب آثارالسنن جب شائع ہوئی تو مولانا کاشمیری یہیں مدرس تھے، چنانچہ ان کی منظوم تقریظ اس کتاب کے آخر میں شامل ہے۔ مولانا انورشاہ صاحب کی تشریف [بری] کے بعد مولوی امین الدین صاحب شاہجہاں پور جاکر مفتی کفایت اللہ صاحب کو ۱۳۲۱ھ میں یہاں لے آئے اور مولوی صاحب کی زندگی تک وہ صرف مدرس رہے ۱۳۳۸ھ مطابق ۶ جون ۱۹۲۰ء میں مولوی صاحب کا انتقال ہوا، تو اہل شوریٰ نے مفتی صاحب کو مہتمم بھی بنا دیا، جس کے کام کو وہ آخر تک نباہتے رہے۔

یہ مدرسہ امینیہ پہلے سنہری مسجد میں تھا۔ یہاں جانے کا مجھے صرف ایک دو دفعہ اتفاق ہوا، آخر میں مفتی صاحب کے اہتمام میں ایک اور مسجد کے پاس مدرسہ کی موجودہ عمارت بنی، اس میں بھی مفتی صاحب کی ملاقات کا جذبہ کئی دفعہ مجھے کھینچ کر لے گیا۔[1]

---

[1] علم وفضل کا ماتم گسار یہیں تک پہنچ پایا تھا کہ خود اُن کے رخصت کا وقت آگیا، علالت شروع ہوگئی، قلم رک گیا، پھر روح نے بھی جسم کا ساتھ چھوڑ دیا، یہ نوحۂ غم اُن کی زندگی کا آخری ماتم ثابت ہوئی اس کے بعد تو آہ خود انہی کا ماتم بپا ہوگیا۔" عاصم۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
کی چند اہم شاہکار تصنیفات

تاریخ دعوت و عزیمت مکمل (چھ حصے)
مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر
منصب نبوت اور اُس کے عالی مقام حاملین
دریائے کابل سے دریائے یرموک تک
تذکرہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ
تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات
تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب
مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں
نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں
جب ایمان کی بہار آئی
مولانا محمد الیاسؒ اور اُن کی دینی دعوت
حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب
عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح
تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک
مطالعہ قرآن کے مبادی اصول
سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ
خواتین اور دین کی خدمت
کاروان ایمان و عزیمت
سوانح مولانا عبد القادر رائے پوریؒ

نبی رحمتؐ مکمل
حدیث کا بنیادی کردار
معرکۂ ایمان و مادیت
پرانے چراغ مکمل
ارکان اربعہ
نقوش اقبال
کاروانِ مدینہ
قادیانیت
تعمیر انسانیت
حدیث پاکستان
اصلاحیات
صحبتے با اہل دل
کاروانِ زندگی مکمل
مذہب و تمدن
دستورِ حیات
حیات عبد الحیؒ
دو متضاد تصویریں
تحفۂ پاکستان
پاجا سراغ زندگی
عالم عربی کا المیہ

ناشر ـ فضل ربی ندوی ـــــ فون ـ ۶۱۱۸۱۷
مجلس نشریاتِ اسلام، ناظم آباد مینشن ـ ا ـ کے ـ ۳، ناظم آباد، کراچی ۱۸